

پولیس افسر کو بتایا ”ابھی میں بھاری فائرنگ سے بچ کر نکلا ہوں۔ مجھے دو بار وہاں جانے کے لیے نفی درکار ہے۔“

”آدی کیا۔ سراوہ اسی کے ساتھی ہوں گے ابھی چل کر انہیں دیکھ لیتے ہیں۔“ افسر نے اپنی قابلیت بگھاری۔

تھانے میں زیادہ نفی موجود نہیں تھی۔ روزنامے میں

فاکوئی نتیجہ نہیں تھا۔

”مجھ سے دور رہ کر گاڑی تک پہنچو۔ اب یہ علاقہ خدوش ہو گیا ہے۔“ اول خان نے دوڑ لگانے کا سلسلہ ترک کر دیا کیونکہ آگے اسٹریٹ لائٹس کا سلسلہ بحال نظر آ رہا تھا۔

جوشی کے گڑھ سے فرار کے لیے انہوں نے وہ راہ نہیں لی تھی جس سے وہ اپنی منزل تک پہنچے تھے۔ اس علاقے کی ساری گلیاں یکساں تھیں۔ دور سے ابھرنے والے فائرنگ کے شور کی وجہ سے پورا علاقہ دور تک ویران ہو چکا تھا۔ صورت حال جاننے کے لیے لوگ اپنے گلیوں کے برآمدوں میں لٹکے ہوئے تھے۔ وہ انہیں نظر انداز کرتے ہوئے بڑھتے رہے۔ اول خان کو اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ راستہ بھٹک کر ایک دوسری سے ملی ہوئی متعدد بند گلیوں کی بھول بھلیوں میں پھنس چکا تھا لیکن اس کے ذہن میں سمت کا احساس باقی تھا۔ وہ کہیں بھی رکے بغیر تیزی سے چلا رہا اور کافی دیر بعد وہ اس سڑک پر نکلنے میں کامیاب ہو گیا جس پر اس نے جیپ پارک کی تھی۔

وہ دونوں اپنی جیپ سے بہت دور نکلے تھے اور مزید بھٹک سکتے تھے مگر سمت کے احساس نے اول خان کی رہنمائی کی اور قدرے لمبی پیدل مسافت طے کر کے وہ جیپ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ روشنی میں سامنے آنے پر ظاہر نہ دیکھا کہ اس کے چیف کے چہرے پر دور دور تک شکست کا ملال نہیں تھا، وہ غصے میں سرخ ہو رہا تھا۔

شہر کے ایک منجانب آباد علاقے میں نامعلوم شوریدہ سروں کی وہ کارروائی اول خان کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ جیپ اشارت کر کے وہ سیدھا علاقے کے تھانے میں پہنچ گیا۔ وہاں رات کے گشت کی وجہ سے کچھ ویرانی سی تھی۔ ایس ایچ او کا کمرہ بند ہوا تھا مگر جب اول خان نے ایک سب انسپکٹر کو اپنی شناخت کرائی تو وہ کمرہ کھول کر ان دونوں کو اندر بٹھا دیا گیا۔ تھانے میں یکایک اچھلی سی پیدا ہو گئی تھی۔

اس وقت رات کا سوا بجا تھا۔ تھوڑی دیر بعد تھانے دار پوری وردی میں آ موجود ہوا۔ اول خان اس وقت عام شہری لباس میں تھا مگر تھانے دار اتنا بوکھلا ہوا تھا کہ اس نے آتے ہی اول خان کو سلیوٹ پیش کر دیا۔

”میں اپنی فورس کے ایک مجرم تک پہنچنا چاہ رہا تھا لیکن وہاں کچھ مسلح آدمیوں نے محاصرے کی سی فضا پیدا کی ہوئی ہے۔“ اول خان نے رسمی تعارف اور ابتدائی گفتگو کے بعد

اندراج کے بعد، دو افسروں اور دو سپاہیوں کے ساتھ وہ پولیس موبائل میں دوبارہ جوشی کے گھر کی طرف چل دیے۔ اول خان نے اپنی جیپ تھانے میں ہی چھوڑ دی۔ تھانے دار اول خان کے ساتھ موبائل کی اگلی نشست پر بیٹھا واردات کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہا۔

مین روڈ سے ڈھلوان سڑک پر مڑتے ہوئے تھانے دار نے موبائل کا سائزن آن کر دیا تاکہ لوگوں کو جائے واردات پر پولیس کی آمد کا علم ہو جائے۔

اگلا موڑ گھومتے ہی انہیں ایک اور پولیس موبائل نظر آئی جو پہلے سے وہاں پہنچی ہوئی تھی۔

اس وقت وہ پہلی کھلی گلی چھانچ بھری ہوئی تھی۔ پولیس کے آتے ہی سب لوگ گھروں سے باہر نکل پڑے تھے۔ گلی میں پھیلا ہوا اندھیرا بڑی حد تک دور ہو چکا تھا کیونکہ لوگوں نے رضا کارانہ طور پر اپنے گلیوں کی بیرونی روشنیاں جلا دی تھیں۔

پہلی موبائل کا انچارج ایک اے ایس آئی تھا۔ اپنے تھانے دار کو غیر متوقع طور پر جائے واردات پر موجود پایا کروہ مستعد نظر آنے لگا۔ پہلی پارٹی نے وہاں پہنچنے ہی تین لڑکوں کو باندھ کر موبائل میں ڈال دیا تھا۔ تین سپاہی جوشی والی بلڈنگ سے عورتوں کو لارہے تھے۔

”سر کچھ بتائیں کہ یہاں کیا ہوا۔“ اے ایس آئی اپنے تھانے دار کو بتا رہا تھا۔ یہاں کچھ دیر تک دھواں دھار فائرنگ ہوتی رہی۔ شور سنتے ہی ہم یہاں پہنچے تو فائرنگ ختم ہو چکی تھی مگر فضا میں جلے ہوئے بارود کی تیز بو پھیلی ہوئی تھی۔ پہلی بلڈنگ میں کھرام مچا ہوا تھا۔ ابھی ابھی پتا چلا ہے کہ کچھ مسلح بد معاش وہاں سے جوشی نام کے ایک ہندو کو زبردستی اٹھا کر لے گئے۔“

اول خان، اے ایس آئی کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ جوشی کی بلڈنگ سے اس وقت واقعی عورتوں اور بچوں کے رونے پٹنے کی صدا انہیں آ رہی تھی۔

جب تک اول خان اس گلی میں موجود تھا، جوشی کے گھر سے کوئی آواز نہیں سنائی دی تھی۔ اگر اس کہانی میں ذرا سی بھی حقیقت تھی تو پھر یہی ممکن تھا کہ را کے پالے ہوئے

”جوشی کوئی بڑا مجرم تھا سر؟“ تھانے دار نے گھگھیا کر پوچھا۔

”بس اب تمہارا کام سیدھا ہو گیا۔ جرم اور مدعی تمہارے سامنے ہے۔ کاغذوں میں میرا ذکر لانے کی ضرورت نہیں۔ اپنے مجرم کی تلاش شروع کر دو۔ وہ ہاتھ آجائے گا تو تمہیں مغوی کے بارے میں ہر بات معلوم ہو جائے گی۔“

اول خان نے اسے کورسا جواب دے دیا۔
”سر! میں شرمندہ ہوں کہ آپ کی کوئی خدمت نہیں کر سکا۔ مجھے تو شبہ ہو رہا ہے کہ گرفتاری کے ڈر سے جوشی اپنے مسلح آدمیوں کے ساتھ نکل گیا۔ مجرم ہر حالی میں مجرم ہوتا ہے۔ اس پر اوقات آجائے تو وہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا ہے۔ عورتوں کو ذرا سا رگڑا دیا جائے تو وہ سب اگل دیں گی۔“

”نہیں۔ عورتوں پر زیادتی نہیں ہوگی۔ میں اس بات پر نگاہ رکھوں گا۔ یہ نہ سمجھنا کہ بات یہیں ختم ہوگئی۔ میں اس واقعے کے بارے میں تمہارے ڈی آئی جی کو بھی بتاؤں گا۔ ہم لوگ کہیں اور مداخلت کرتے ہیں تو اوپر والوں کو بھی اطلاع ضرور دیتے ہیں۔“

”سر! آپ فکر ہی نہ کریں۔۔۔ ہمارے پاس دوسرے طریقے بھی ہیں۔ ایک دو روز میں سچ سامنے آجائے گا۔“
شکار ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ تھانے دار نے اپنی سہل کوشی میں جوشی کے فرار کا ذکر کر کے ایک نئے نظریے کو جنم دیا تھا۔ اس کی بات بہت زیادہ قریں قیاس تھی۔ خود کو بارود کی برسات میں پا کر جوشی اس قدر دہشت زدہ ہوا کہ اپنے ہمدردوں کے ساتھ بھاگ نکلا۔ ایسی صورت میں اس کی عورتوں کا رونا بیٹنا فراڈ ہونا چاہیے تھا۔

جلال نے ان عورتوں کو دوسرے دیکھا تھا۔ ان کی گریہ وزاری میں بناوٹ کا کوئی دخل نہیں تھا۔

ایک قوی امکان یہ بھی ابھر رہا تھا کہ میدان صاف ہونے کے بعد را کے مسلح افراد محض مزاج پر سی کے لیے جوشی کے پاس گئے ہوں۔ وہ اس قدر خوف زدہ تھا کہ ان کے ساتھ ہولیا۔ اس کی روانگی خوف و ہراس اور افراقی کے عالم میں ہوئی اس لیے عورتوں کو بتا نہیں چل سکا کہ کیا ہوا۔ مسلح افراد بجلت میں تھے۔ وہ جوشی کو اپنے ساتھ لے کر تیزی کے ساتھ اس کے گھر سے نکل گئے۔

تھانے دار موٹی اور روایتی سوچ رکھنے والا پولیس افسر تھا لیکن اس نے اپنے تجربے کی بنا پر اول خان پر سوچ کے نئے دریچے کھول دیے تھے۔ اس نے احترام کے ساتھ ادھیڑ

بد معاش اسے اٹھالے گئے ہوں۔ اول خان سوچ میں پڑ گیا۔ ان کو یہی کچھ کرنا تھا تو وہ اس کے پیچھے سے پہلے بھی کر سکتے تھے۔ اغوا میں تاخیر کا سبب کیا تھا؟

جوشی کی بلڈنگ سے دو ہرہ عورتیں روتی اور بین کرتی ہوئی باہر آئیں تو اول خان چونک پڑا۔ ان کے پیچھے بندوق بردار سپاہی عمارت سے نکل رہے تھے۔

”یہ کیا ہو رہا ہے۔ تمہارے سپاہی عورتوں کو کہاں لا رہے ہیں؟“ اس نے براہ راست اسے ایس آئی سے پوچھا۔

”سر! تھانے میں ان کا بیان قلم بند ہو گا۔ ان میں سے ایک کے مرد کا اغوا ہوا ہے۔“ اسے ایس آئی نے جواب دیا۔ تھانے دار کے دہے دہے رویے سے اس نے اندازہ لگالیا تھا کہ اول خان کوئی دہنگ آدمی یا بڑا افسر تھا۔

”عورتوں کو گھر میں واپس بھیجو!“ اول خان نے تحسانہ لہجے میں کہا۔ ”اور لیڈی پولیس کو بلا کر عورتوں سے ان کے اپنے گھر میں بیان لو۔ یہ مظلوم کی داد رسی کا کوئی طریقہ نہیں ہے کہ اسی کو ہانک کر تھانے میں لے جاؤ۔“

اسے ایس آئی نے پریشان اور استفسار طلب نگاہوں سے تھانے دار کی طرف دیکھا۔ اس نے اپنی ٹوپی اتار کر سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ”اس وقت وہی کہو جو صاحب کہتے ہیں۔ عورتوں کو ان کے گھر میں واپس بھیج دو۔ کاغذ پرچہ بعد میں ہوتا رہے گا۔“

”اس وقت نہیں“ تھانے دار صاحب! بعد میں بھی عورتوں کو تھانے میں نہیں بلایا جائے گا۔“ اول خان نے سختی سے کہا۔

”ٹھیک ہے سر!“ اول خان کو جواب دے کر وہ اپنے آدمیوں کی طرف متوجہ ہو گیا ”اوئے! اس لیا تم سب نے، کان کھول کر۔“

”سر! آپ کا مجرم کہاں ہے، اب اسے پکڑ لیں۔ ہمارے ساتھ آپ کیوں اپنی رات کالی کرتے ہیں۔“ اپنے آدمیوں کو کچھ سمجھانے کے بعد تھانے دار دوبارہ اول خان کے پاس آ گیا۔

”میرا مجرم جوشی ہی تھا۔۔۔“ اول خان نے بتانا چاہا مگر تھانے دار نے اسے بات پوری نہیں کرنے دی۔
”اوئے بیڑا غرق۔“ تھانے دار نے زور سے اپنی پیشانی پر ہاتھ مار کر کہا ”اور وہ اسی کو اٹھا کر لے گئے۔“

”وہ پہلے سے اس کی گھات میں یہاں چھپے ہوئے تھے۔ پہلے مجھ پر فائر کھولا۔ میں راستے سے ہٹ گیا تو وہ اسے نکال لے گئے۔“

عمر پولیس افسر کو الوداع کہا اور اسی کی موبائل میں پولیس ڈرائیور کے ساتھ تھانے کی طرف چل دیا تاکہ وہاں سے اپنی جیب لے سکے۔



ظاہر کو راستے میں ڈراپ کر کے اول خان سیدھا ہمارے گھر آ پہنچا۔
ویرا اپنے کمرے میں تھی۔ غزالہ سوچتی تھی مگر سلطان شاہ میرے ساتھ بٹھا کسی خبر کا منتظر تھا۔
خبر سے پہلے خبر ساز کو اپنے روبرو دیکھ کر میرا دل خوش ہو گیا۔ میرا اندازہ تھا کہ بے ہوش جوشی اس کی جیب کے پچھلے حصے میں پڑا ہوا ہو گا مگر اول خان کے سپاٹ اور سرد چہرے نے میری ہر خوش امید پر اوس ڈال دی۔
وہ تنھے بارے انداز میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ ہم دونوں ہمہ تن گوش ہو گئے۔

”جوشی کا نام ویرا کی ایک غیر محتاط فون کال کے نتیجے میں ہمارے سامنے آیا تھا۔“ اول خان نے اپنی پوری روداد سنانے کے بعد کہا۔ ”اب وہ دھیرے دھیرے اہمیت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ وہ کوئی ایسی بات جانتا ہے جو ہر ایک کم از کم چوڑا کے لیے مسلک ثابت ہو سکتی ہے۔“
”تم نے یہ رائے کیسے قائم کر لی؟“ سلطان شاہ نے پر تجسس لہجے میں سوال کیا۔

”میرے لیے یہ مان لینا دشوار ہے کہ جوشی نے اپنی حفاظت کے لیے اپنی بلڈنگ کے گرد مسلح آدمی جمع کیے ہوئے تھے۔“ اول خان نے فیصلہ کن انداز میں کہا ”میرا دل کہہ رہا ہے کہ وہ چوڑا سے مسلسل رابطے میں ہے۔ اس نے چوڑا کو بلیک کومین کے تیسرے فون کی رپورٹ دی تو اس نے اندازہ لگا لیا کہ بات بگڑ چکی ہے۔ ویرا کسی بھی وقت جوشی پر تھاپہ ڈال دے گی۔ اس نے فوری طور پر کرائے کے بد معاشوں کا ایک مسلح جتھا اس کے گھر پر مامور کر دیا تاکہ کوئی بھی جوشی سے ملنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔“

”تم بتا رہے ہو کہ آخر میں وہ لوگ اسے اغوا کر کے لے گئے۔ یہ کام تمہارے بچنے سے پہلے بہت خاموشی سے انجام دیا جاسکتا تھا۔ اس کے لیے انہیں اتنے پارہ بیلنے کی کیا ضرورت تھی؟“ میں نے سگریٹ کا کش لے کر پرتشوش لہجے میں پوچھا۔

”پہلے میں بھی یہی سوچ رہا تھا لیکن گھاگ تھلے ڈالنے رداروی میں ایک نکتہ اٹھا کر میری سوچ کا رخ بدل دیا۔“
میرے استفسار پر اول خان نے تفصیل سے نیا نظریہ

پیش کر دیا جس کی داغ بیل تھانے دار نے ڈالی تھی۔
”یہ بات زیادہ قرین قیاس ہے۔“ میں نے اعتراف کیا ”چندن گرنانی کو گھیر لینے کے بعد ہم مسلسل ناکامیوں کا منہ دیکھ رہے ہیں۔ آج کوئی اچھی خبر نہیں ملی۔“
”ہاں یہ تو ہے۔“ اول خان بڑبڑایا ”چوڑا روپوش تھا۔ اب جوشی بھی ہمارے ہاتھوں سے نکل گیا۔“
”مگر جوشی کوئی اہم بات جانتا ہے تو یہ سمجھ لو کہ اب اس کی زندگی خطرے میں ہے۔“ سلطان شاہ نے ہم دونوں کو چونکا دیا۔

”چوڑا اس کا پرانا دوست ہے۔ وہ اسے نہیں مروا سکتا۔“ اول خان نے بے یقینی سے کہا۔
”سلطان شاہ کا اندیشہ درست ہے۔“ میں نے تائیدی لہجے میں کہا ”یہ نہ بھولو کہ چوڑا کسی کا دوست ہونے سے پہلے راکا سیکرٹ ایجنٹ ہے۔ اگر جوشی اپنی معلومات کی بنا پر چوڑا یا راکا کے لیے خطرہ بن سکتا ہے تو اسے نہیں پالا جائے گا۔ وہ سفاکی سے اپنے دوست کی گردن کاٹ دے گا۔“

”کچھ دیر کے لیے میں تمہاری بات مان بھی لوں تو فوری طور پر ایسا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ چوڑا چند روز انتظار کرے گا۔ کوئی اپنے جبری دوست کو ایسی سرد مہری سے نہیں مار سکتا۔ اس کے لیے برف جیسے ٹھنڈا دینے والے خون اور پتھر جیسے دل کی ضرورت ہوتی ہے۔ میرے آدمی چوڑا پر کام کر رہے ہیں۔ ایک دو روز میں پتا چل جائے گا کہ وہ کس قسم کا آدمی ہے۔ اس کے کتنے مقامیوں سے روابط ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہم جوشی کو اس کے قبضے سے چھڑانے میں کامیاب ہو جائیں۔“

”جوشی کوئی اہم بات جانتا ہے تو اس کا ہماری تحویل میں آنا ضروری ہے۔ یہ محض ایک معروضی بات ہے۔ مجھے اس بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں ہے۔ وہ جوشی کو مارنا چاہتے ہیں تو ان کے لیے یہ سہرا موقع ہے۔ وہ اسے ضائع نہیں کریں گے۔“

”تم کس موقع کی بات کر رہے ہو؟ جوشی ان کے قبضے میں ہے۔ وہ جب تک چاہیں اس کی خاطر مدارات کریں اور جب چاہیں اس کے دل میں سوراخ کھودیں۔ ان کے لیے آج سے کئی مہینوں تک موقع ہی موقع ہے۔“ اول خان نے کہا۔
”شاید میں اپنی بات واضح نہیں کر سکا۔ میں نے اپنا سر جھٹک کر کہا ”آج صبح سویرے ایک کچرا کنڈی سے چندن کی لاش ملی۔ کل جوشی کی لاش ملتی ہے تو ان واقعات کو کراچی میں ہندوؤں کے منظم قتل کی سازش کا نام دیا جائے گا۔ کوئی

زیادہ باتیں کرنی چاہ رہا تھا کہ جوشی کی رہائی کی کوئی راہ سوچہ کے مگر ہر راہ مسدود نظر آرہی تھی۔

”چوڑا سے آگے کیوں؟ وہ اب بھی چوڑا کے آدمیوں کے قبضے میں ہے۔“ سلطان شاہ نے ضد کی۔

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تنظیمی اداروں میں ہر فرد کسی نہ کسی کو جواب دہ ہوتا ہے۔“ میں نے اسے سمجھایا ”چوڑا ابھی کسی کو جواب دہ ہے۔ وہ شخص جوشی کے بارے میں ہر قسم کے جذبات سے عاری ہو کر کوئی منطقی فیصلہ کرے گا۔“

”تمہاری دانست میں ایسا منطقی فیصلہ جوشی کی موت پر ختم ہو گا؟“ اول خان نے پوچھا۔

”یقیناً!“ میں نے زور دے کر کہا ”را کا کوئی ذمے دار آدمی باہر کے ایک ایسے آدمی کا زندہ رہنا پسند نہیں کرے گا جو ر یا اس کے کسی اہم عہدے دار کے بارے میں کوئی کلیدی بات جانتا ہو۔ جوشی کے گھر کے باہر مسلح معاشوں کی دھواں دھار فائرنگ نے یہ ثابت کر دی ہے کہ وہ بہت کچھ جانتا ہے۔“

”کاش ہمیں تھوڑا سا دقت مل گیا ہوتا۔ اس وقت

بھول کر بھی یہ نہیں سوچے گا کہ جوشی کے قاتل را کے بھارتی ہندو ہوں گے۔“

”تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ اول خان یکایک بہت زیادہ مضطرب ہو گیا۔ ”وہ اسے جلد از جلد مار دیں گے۔ موجودہ لہریں ان کا دامن بے داغ رہے گا۔ ہمیں جوشی کو ان کے قبضے سے نکالنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے ورنہ ہم اس سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔“

”ہم بے بس ہیں۔ کیا کر سکتے ہیں؟ ہمیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ اسے کہاں لے گئے ہوں گے۔“

”میرا خیال ہے کہ تم دونوں بلاوجہ پریشان ہو رہے ہو۔“ اول خان نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ سلطان شاہ بول پڑا۔

”ساری گفتگو سن لینے کے بعد تم یہ کہہ رہے ہو تو اس کا کوئی سبب بھی ہو گا۔“ میں نے کہا۔

”انہیں جوشی کو مارنا ہوتا تو وہ اسے لاد کر کیوں لے جاتے۔ اتنے بھیرے کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کے پردردہ غنڈوں کے ہاتھ لہے ہیں۔ وہ جوشی کو اس کے گھر میں گولی مار کر لوٹ آتے۔ ذرا سی درمیں قصہ ختم ہو جاتا۔“

”معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا دماغ کام نہیں کر رہا۔“ میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا ”ہم نے چند مفروضے قائم کیے ہیں جن میں سے پہلی بات یہ ہے کہ جوشی کو اغوا نہیں کیا گیا۔ وہ اپنی جان کے خوف سے خود ان لوگوں کے ساتھ چلا گیا۔ ان بد معاشوں کو جوشی کو تپا سندیدہ ملاقاتیوں سے بچانا تھا۔ پہلے انہوں نے گولیاں برساکر اول خان کو اس سے دور رہنے پر مجبور کیا۔ جب وہ ان کے ساتھ چلا گیا تو ملاقاتیوں کا مسئلہ سرے سے ختم ہو گیا۔“

”چمکیرہ کہو کہ جوشی اپنی مرضی سے موت کے فرشتے کی طرف گیا ہے۔ ان بد معاشوں کو اسے مارنے یا اغوا کرنے کی راہت نہیں دی گئی تھی۔ وہ خود بھاگنے پر آمادہ ہوا تو بد معاشوں کو اپنا کام آسان ہوتا نظر آیا اور وہ اسے اپنے ہاتھ لے کر نکل گئے۔“ سلطان شاہ نے تقیہی انداز میں کہا۔

”اب تم صحیح لائن پر سوچ رہے ہو۔“ میں نے اپنی بات جاری رکھی ”جب تک جوشی اپنے گھر پر تھا، سارا معاملہ جوشی اور چوڑا کے درمیان تھا۔ چوڑا نے دوستی کا بھرم رکھتے ہوئے جوشی کے خلاف کوئی سخت فیصلہ نہیں کیا۔ اس کے اوکے لیے بد معاش بھیج دیے۔ اب بات چوڑا سے آگے نکل چکی ہے۔“ میں اس موضوع پر ان دونوں سے زیادہ سے

امریکن ویزا حاصل کریں

اگر آپ امریکہ جانا چاہتے ہیں تو اس کیلئے پورا قانونی ذرائع استعمال کریں امریکن ویزا کانٹرہ امریکن میں مقیم پاکستانی اور امریکی وکلاء کے مشوروں کی مدد سے تیار کی گئی ہے اس میں وہ تمام قانونی طریقہ کار بتائے گئے ہیں جن کی مدد سے آپ امریکی ویزا حاصل کر سکتے ہیں۔ (قیمت 275 روپے بمبوٹاک خرچ)

کینیڈین امیگریشن کانٹرہ

کینیڈین امیگریشن کے لئے اہلائی کرنے والوں کیلئے کینیڈین امیگریشن کانٹرہ (اردو/انگلش) جس میں کینیڈین امیگریشن ویزے کے سسٹم میں ضرورت سے آخبریک تمام معلومات دی گئی ہیں جس کی مدد سے آپ خود کینیڈین ویزے ویزے کیلئے اہلائی کر سکتے ہیں۔ (قیمت 25 روپے بمبوٹاک خرچ)

انگلش لینگویج کورس

ایسے افراد جنہوں نے اردو میڈیم سے تعلیم حاصل کی ہے اس کورس کی مدد سے انھیں چھ چار ماہ میں انگریزی سمجھنے، پڑھنے اور بولنے پر عبور حاصل کر سکتے ہیں ہر ماہ پندرہ سو ڈاک امتحان لیا جائیگا کورس کے آخر میں سند بھی جاری کی جائیگی (چار ماہ کے کورس کی مکمل فیس 450 روپے بمبوٹاک خرچ)

اپنے صرف ایک خط لکھ کر یا ای میل بھیج کر ویزا VPP کے ذریعے حاصل کر سکتے ہیں

VITAL INFORMATION NETWORK
(Immigration Law Division)
P. O. BOX No. 4275, KARACHI-74000
Email : via1965@hotmail.com

کھائے جا رہا تھا کہ میں جلال اور شاید اس کی بیوی کی گہری
نیند میں مغل ہو رہا تھا۔

تیسری گھنٹی کے بعد ریسیور میں جلال کی گہری نیند میں
ڈوبی ہوئی جیلو کی طویل آواز گونجی تو خوشی سے میرا دل اچھل
پڑا ”میں کرنل داؤر پول۔۔۔“

اس نے جھٹائی ہوئی آواز میں میری بات درمیان سے
کاٹ دی ”بھگ۔۔۔ کرنل داؤر! کیا میں تمہیں جانتا ہوں؟“
اس کا وہ خوابیدہ سوال خاصا زہریلا تھا۔ نیند کی جھونک میں
اسے یہ یاد نہیں آسکا تھا کہ میں نے اسی نام سے لیری سے
ملاقات کی تھی۔

”تم مجھے ذہنی کے نام سے جانتے ہو۔“ میں نے اس کا
تلخ نوالی کا برا مانا بغیر تعارف کی سیدھی راہ اختیار کر لی۔
”اوہ! ذہنی ڈیئر۔۔۔ یار معاف کرنا۔ میں نیند کی جھونک

میں تھا۔ میری بیوی فون کی ہلکی سی آواز پر جاگ جاتی ہے
لیکن میں گدھے گھوڑے بچ کر سوتا ہوں۔ اس نے مجھے
جھجھکوڑ کرست مشکل سے اٹھایا ہے۔ ناوقت آنے والے فون
میں خود سنتا ہوں۔ کوئی کیا حال ہے تمہارا؟“

اس کی معذرت اور خوش کلامی نے مجھے پانی پانی کر دیا۔
میں نے ندامت سے کہا ”میں تمہاری اور بھابی کی نیند خراب
کرنے پر دونوں سے معافی چاہتا ہوں۔ اگر تمہارے ذہن سے
نیند کا شمار اتر گیا ہو تو میں تم سے انڈین قونصل ہاؤس کے بی
ایل چوڑا کے بارے میں کچھ معلوم کرنا چاہتا ہوں؟“

”یار نیند تو تمہاری آواز سننے ہی ہو، ہو گئی تھی۔ یہ وہی
ہے نا جو وہاں انفارمیشن آفیسر ہے؟“

”تمہاری یادداشت قابل رشک ہے۔“ میں نے اسے
سراہا ”میں یہ جانتا چاہتا ہوں کہ آج کل اس کا زیر زمین دنیا
کے کس آدمی سے میل جول ہے۔“

”اس وقت مشکل ہے۔“ صبح دفتر کا ریکارڈ دیکھ کر
جتا سکوں گا۔“ میرے زیادہ تر آدمی اسی بیگار میں لگے رہتے
ہیں کہ کون کہاں جا رہا ہے، کن کن لوگوں سے مل رہا ہے۔
”دیر ہو جائے گی۔“ میں نے دھیمی آواز میں کہا ”وقت

کی اہمیت نہ ہوتی تو میں اتنی رات گئے۔“

”بس بس“ سمجھ گیا۔ ”اس نے میری بات درمیان سے
ہی کاٹ لی“ مجھے صرف آدھا گھنٹا دے دو۔ میں کافی کی ایک
کڑک پیالی پی کر اپنے دفتر جاتا ہوں۔ ریکارڈ دیکھ کر وہیں سے
تم کو فون کروں گا۔ بد قسمتی سے ریکارڈ صاف ہوا تب بھی
ہماری بات ضرور ہوگی۔ اوکے۔۔۔ بائے۔“

اس نے اپنی بات پوری کر کے فون بند کر دیا۔ مجھے اس

بہیں یہ پتا چل جائے کہ چوڑا شہر کے کس بد معاش سے ملتا رہا
ہے تو مسئلہ حل ہو جائے گا۔“ اول خان نے کف افسوس
کھینچ کر کہا۔

”تمہارے کسی آدمی کو اس بارے میں کچھ معلوم نہیں
ہو سکا؟“ سلطان شاہ نے پوچھا۔

”میں نے انہیں آج شام کام پر لگایا تھا۔ انہیں وقت
کہاں ملا؟“

”ایسے خفیہ رابطوں کا کھوج لگانا بہت زیادہ مشکل ضرور
ہوتا ہے، ناممکن نہیں ہوتا۔“ میں نے اول خان کو ترغیب
دی۔

”مشکل کاموں کے لیے وقت درکار ہوتا ہے۔ تم کہہ
رہے ہو کہ صبح جوشی کی لاش مل سکتی ہے کیونکہ بھارتیوں کے
لیے یہ وقت سازگار ہے۔“

”کیوں نہ جلال سے مدد لی جائے؟“ سلطان شاہ کی اس
تجویز سے میں اچھل پڑا۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا
”آئی بی والے مشتبہ سفارت کاروں پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ یہ
ان کے فرائض کا حصہ ہے۔ وہ ہماری طرح بے خبر نہیں
ہو سکتے۔“

”کبھی کبھی تم بہت کام کی بات کر جاتے ہو۔“ میں نے
سلطان شاہ کی پشت پر ہاتھ مار کر کہا ”اس وقت ہمیں جلال
سے بہتر آدمی نہیں مل سکتا۔“

”اس سے رابطہ کیسے کرو گے؟“ اول خان بھی اچانک
چاق و چوبند نظر آنے لگا۔ وہ اس وقت اپنے گھر میں خواب
خرگوش کے مزے لے رہا ہو گا۔ وہ مصروف اور مختصر آدمی
ہے۔ دن بھر کا تھکا ہارا ہو گا۔ رات کے سوا دو بجے اسے جنگنا
ظلم ہو گا۔“

”تم فکر نہ کرو۔“ میں نے بے پروائی سے کہا ”وہ
مصروف اور مختصر ہونے کے ساتھ فرض شناس بھی ہے۔ پورا
مسئلہ سمجھ لے گا تو ہنسی خوشی یہ ظلم برداشت کر لے گا۔ اس
نے ایسی کسی ناگزیر ضرورت کے لیے مجھے اپنے گھر کا فون نمبر
دیا ہوا ہے۔“

اس کے دفتر کا نمبر مجھے زبانی یاد تھا۔ گھر کا نمبر مجھے ڈائری
میں دیکھنا پڑا۔ جوشی کو بچانے کی ایک راہ نظر آ جانے کے بعد
میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے فوری طور
پر اسلام آباد کے کوڈ کے ساتھ جلال کے گھر کا نمبر ملا لیا۔

میں ریسیور اپنے کان سے لگاے بیٹھا رہا۔ پہلی اور
دوسری گھنٹی بھی بج گئی۔ میں بے چین ہونے لگا۔ میرے لیے
ایک ایک لمحہ بہت صبر آزما تھا۔ دوسری طرف مجھے یہ احساس

سزاؤں کے خوف سے آزاد ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کے ہر جرم کی ایک ذاتی سی ماورائے قانون قیمت ہے۔ جسے چکا کر وہ سرخو رہیں گے۔ ملک کی آمدنی اور خوش حالی میں اضافہ کیسے ہوگا؟

”ابھی تک میں نے صرف دو آدمی دیکھے ہیں جن کے دامن داغ دار نہیں ہیں۔ ایک تم اور دوسرا ذہنی۔“ سلطان شاہ نے اول خان سے مخاطب ہو کر کہا ”اب تیسرا آدمی جلال ہے۔ ان کے سوا ہر ایک گنہگار ہے۔“

”تم دیر اور غزالہ کو بھول گئے۔“ میں نے اسے یاد دلایا۔

”غزالہ گھریلو عورت ہے۔ دیر اسباب صفت ہے۔ ہیر پھیر اس کے خیر میں شامل ہے۔ پتا نہیں کب بے ایمانی پر اتر آئے۔“ سلطان شاہ نے منہ بنا کر کہا ”اس کے بارے میں یقین سے کچھ کہتے ہوئے ڈرتا ہوں۔“

اس کی بات پر ہم دونوں ہنس پڑے۔ وہ بھی ہمارے ساتھ شریک ہو گیا۔

”جلال اس وقت کافی پی رہا ہوگا۔ ہم خالی بیٹھے ہوئے ہیں۔“ اول خان نے معنی خیز لہجے میں سلطان شاہ سے کہا ”اس وقت عورتوں کو جگانا مناسب نہیں ہے۔“

سلطان شاہ ایسی چھوٹی موٹی خدمات کے لیے ہر وقت کمربستہ رہتا تھا۔ مجھے اس کی یہ ادبست پسند تھی کہ ضرورت پڑنے پر وہ کسی کام میں عار نہیں سمجھتا تھا۔ بے تحجک ہو کر ہر کام میں ہاتھ ڈال دیتا تھا۔

سے ممنونیت کے اظہار کا موقع تک نہیں مل سکا۔

”بہت شاندار آدمی ہے۔“ جلال کا پیغام سن کر اول خان نے خوشی سے کہا ”سول سروس میں ایسے بے لوث افسروں کی تعداد بہت کم ہے۔“

”سب افسراس کی طرح فرض شناس ہو جائیں تو اس ملک کی قسمت بدل سکتی ہے۔“ سلطان شاہ نے بصرہ کیا۔

”کچھ نہیں ہو سکتا۔“ اول خان نے مایوسی سے کہا ”ایک طویل مدت گزر جانے کے باوجود تحقیقی بنیادوں پر ہمارے قومی زوال کے اسباب اور ترجیحات کا تعین نہیں کیا جا سکا۔ ہر آنے والا الگ راگ الاپتا ہے۔ عوام، بیوروکریسی اور تاجروں سے لے کر عدالتی نظام تک کو ذمے دار قرار دیا جا رہا ہے لیکن سدھار کے لیے کچھ نہیں ہو سکا۔“

”صرف وہ باتیں ہیں۔“ میں نے اپنے دامن ہاتھ کی دو انگلیاں اٹھا کر کہا ”اس ملک میں سارا مسئلہ قانون کے احترام کا ہے۔ بیوروکریسی کرپشن کو بھول کر قانون کے بھور نفاذ میں سخت اور فعال ہو جائے عدالتوں میں سزا اور جزا کا منصفانہ نظام تیز ہو جائے تو ہر چیز حیرت ناک تیزی سے سدھرتی چلی جائے گی۔“

اول خان کی آنکھیں حیرت سے کشادہ ہو گئیں ”بہت گہرا اور صحیح تجزیہ ہے تمہارا۔ ہر خرابی کی جڑیں ان ہی دو چیزوں سے ملتی ہیں۔ ٹریفک کا سپاہی قانون کی پاس داری سے زیادہ اپنی بالائی آمدنی میں دلچسپی لیتا ہے اس لیے ہر جگہ ٹریفک کا نظام درہم برہم ہے۔ ٹیکس چرانے والے بھاری

دنیا بھر میں پاکستانی اخبارات کے سائل اور کتابوں کے برآمد کنندگان

FAIR EXPORT HOUSE

اس کے علاوہ پاکستانی/ہندوستانی کیسٹ سی ڈی پاکستانی ٹی وی ڈرامے اور دیگر ثقافتی پروگراموں کے لیے بھی رابطہ کیجئے

FAIR EXPORT HOUSE

C-41, Block-B Gulshan-e-Jamal

Off, Rashid Minhas Road Karachi, Pakistan

Phone: (9221) 4574628- (9221) 4595462

Fax: (9221) 4595491-e-mail: fair@cyberaccess.com.pk

Downloaded from <http://paksociety.com>

تھوٹل میں رہے گا جو اس کے گھر سے اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ اگر میں کہیں غلطی کروں تو تم مجھے بلا تکلف ٹوک دیتا۔“

”تم فکر نہ کرو۔ ایسے معاملات میں، میں کسی کی غلطی معاف نہیں کرتا۔“ میں نے اسے یقین دلایا۔

”اب اگر جوشی زندہ ہے تو ان لوگوں کے درمیان ہوگا۔ اگر جلال ہمیں کوئی نام دے دیتا ہے تو ہمیں فوری طور پر حرکت میں آنا ہوگا۔“

”صرف حرکت میں آنے سے کام نہیں چلے گا۔ ہمیں اپنی پوری قوت کے ساتھ کارروائی کر کے پہلے ہی پہلے میں کامیاب ہونا پڑے گا۔ ایسا نہ کر کے تو ہم اپنی جیتی ہوئی بازی ہار جائیں گے۔ ان کو جوشی کو ٹھکانے لگانے کا موقع مل جائے گا۔“

”ہماری اپنی طاقت اور نفری بھی کافی ہے لیکن پولیس کو ساتھ لینے میں ہمیں دروہوں کا سہارا بھی مل جائے گا۔“ اول خان نے بھٹکتے ہوئے کہا ”یہ میرا تجربہ ہے کہ جرائم پیشہ لوگ اجنبی اور نامانوس سادہ پوشوں کے مقابلے میں پولیس سے خوف کھاتے ہیں۔“

”پولیس کا نام بھی نہ لیتا۔“ میں نے تیزی سے کہا ”ان کا ایک لگا بھدا طریقہ کار ہوتا ہے۔ وہ تمہاری ہدایت پر اپنی گاڑیوں کے سائزن اور چکراتے ہوئے لیپ بند کر لیں تب بھی کوئی نہ کوئی ایسی حرکت کر گزریں گے جس سے مجرموں کو پولیس کی آمد کا علم ہو جائے گا۔ پولیس والے اپنے مسلح دشمنوں کو لاکار مقابلے پر کودنے کے عادی ہوتے ہیں کیونکہ خاموش حملے میں بھاری جانی اتلاف کا اندیشہ ہوتا ہے۔ ہمیں بہت خاموشی اور رازداری کے ساتھ ان کے سروں پر پہنچنا ہوگا۔“

”گھڑا! اول خان مطمئن ہو کر بولا ”یہ بات طے ہو گئی کہ ہمیں جو کچھ کرنا ہے“ اپنے بل بوتے پر کرنا ہے اور۔۔۔“

”میں نے اس کی بات وہیں کاٹ دی“ تمہاری ساری نفری اور قوت بلیر چھاؤنی میں مرکوز ہے۔ میری پھٹی حس کہہ رہی ہے کہ جوشی کو کہیں دور نہیں لے جایا گیا ہوگا۔ اسے شہر کی حدود میں رکھا گیا ہوگا تاکہ چوڑا چاہے تو آسانی سے اس تک رسائی حاصل کر سکے۔ وقت بچانے کے لیے تم اپنی فورس کو شہر کے کسی منتخب علاقے میں کیوں نہیں بلا لیتے۔ ہم جلال کا پیغام ملتے ہی وہاں پہنچ کر آپریشن کا آغاز کریں گے۔“

اول خان بے ساختہ ہنس پڑا اور بولا ”تم جذباتی ہو رہے

”اس وقت سلطان شاہ نے ہماری بہت بڑی مشکل آسان کر دی۔“ سلطان شاہ کے چلے جانے کے بعد میں نے تو صمیمی لہجے میں کہا۔

”دعا کرو کہ جلال کا ریکارڈ صاف نہ ہو۔“ اول خان نے تفکر آمیز لہجے میں کہا ”میرے لیے یہ آدھا گھنٹا بہت دشوار ثابت ہوگا۔“

”جب تک سلطان شاہ نے جلال کا نام تجویز نہیں کیا تھا، میرے ذہن پر باپوسی کی گہری کھرچھائی ہوئی تھی۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ جوشی کچھ اہم رازوں کو اپنے سینے میں چھپائے اس دنیا سے رخصت ہو جائے گا۔ راکے سفاک قاتل کسی قیمت پر اسے زندہ نہیں رہنے دیں گے۔ اس وقت دور دور تک امید کی کوئی کرن نظر نہیں آ رہی تھی۔ جب سلطان شاہ نے چوڑا کے خفیہ رابطوں کے سلسلے میں جلال کا نام تجویز کیا تو میرے دل دماغ میں امید کی ایک نئی کرن جگمگا اٹھی۔“

میں نے جلال سے بات کر کے سلطان شاہ کی تجویز کو بلا تاخیر عملی جامہ پہنایا تھا لیکن اس کے بعد میں تذبذب بے یقینی اور اعصابی تناؤ میں مبتلا ہو گیا تھا۔ مجھے کچھ بتائیں تھا کہ آدھے گھنٹے بعد جلال مجھے کیا خبر سنانے والا تھا۔

جلال کا دیا ہوا نصف گھنٹے کا وقت تین بج کر سات منٹ ختم ہونا چاہیے تھا۔ وہ انتظار کی گھڑیاں تھیں جو بہت تھم تھم کر گزر رہی تھیں۔ جلال سے گفتگو ختم کر کے ہم نے آپس میں بہت سی باتیں کر لی تھیں لیکن گھڑی میں صرف مین منٹ گزر رہے تھے۔

چند منٹ کی خاموشی کے بعد میں نے وقت گزارنے کے لیے اول خان کو چھیڑا ”خاموش رہ کر یہ آدھا گھنٹا گزارنا بہت دشوار ہو جائے گا۔“

”میں یہ سوچ رہا ہوں کہ جلال نے ہمیں کراچی کے کسی بد معاش کا نام دے دیا تو ہم کیا کریں گے؟“ اس نے اپنی محویت ختم کر کے بتایا۔

”پھر ذرا بلند آواز میں سوچو تاکہ میں بھی تمہارا ساتھ دے سکوں۔“ میں نے اسے مشورہ دیا۔

چوڑا بھارتی ملازم ہے۔ وہ روپوشی کے لیے تو فصل خانے کی عمارت بھی استعمال کر سکتا ہے لیکن جوشی ایک عام شہری ہے۔ وہ لوگ اسے اپنی سرکاری عمارت میں لے جانے اور پھر وہاں سے ٹھکانے لگانے کا فخر مول نہیں لیں گے۔“

”تمہاری بات درست ہے لیکن تم اس سے کیا نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کر رہے ہو؟“

”وہ جب تک ایک زندہ قیدی ہے، ان ہی لوگوں کی

آسکتا تھا۔

”پکن میں تم دونوں کی باتوں کی مسلسل جھنجھٹا ہٹ سناٹی دے رہی تھی۔“ سلطان شاہ نے اپنی جگہ سنبھالتے ہوئے کہا ”مجھے ہٹا کر تم دونوں کی ناک اکر ات کر رہے تھے؟“

”ایسی کوئی بات نہیں تھی جس کے لیے تمہیں ہٹانے کی ضرورت پیش آئی۔“ اول خان نے بلدی سے وضاحت کی ”اس وقت جلال کی اگلی فون کال موضوع خن تھی۔ اس کا جواب حوصلہ افزا ہوا تو ہمیں فوری طور پر حرکت میں آنا پڑے گا۔“

”اور دونوں عورتیں یوں ہی گہری نیند سوتی رہیں گی۔“ سلطان شاہ نے برجستہ سوال کیا۔

”جب انہیں چائے یا کافی بنوانے کے لیے نہیں اٹھایا تو مہم جوئی کے لیے کیوں چھیڑا جائے گا؟“ میں نے الٹا اسی سے سوال کیا۔

”صحیح ویرا کو علم ہو گا تو وہ بچھ جائے گی۔“ سلطان شاہ نے اپنی دانست میں مجھے ہوشیار کیا۔

”اس کی گنجائش نہیں ہے۔“ میں نے اس کا خدشہ مسترد کر دیا ”اس وقت وہ اتنے کمرے نشے میں ہوئی کہ ہمارا ساتھ نہیں دے سکے گی۔“

”اس کو دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔“ اول خان نے اپنے مک سے کافی کا گھونٹ لے کر جواب دیا ”تم لوگوں کے ساتھ رہ کر اس میں بہت سی تبدیلیاں آگئی ہیں۔ کیا تم نے کبھی اس کی مے نوشی چھڑانے کی کوشش کی ہے؟“

”کوشش کر کے اسے کسی کام پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ وہ کوئی عجیب مخلوق ہے۔ اپنی رو پر عمل کرتی ہے۔ جب تک وہ خود شراب نوشی ترک نہ کرنا چاہے، کوئی اسے اس کام پر آمادہ نہیں کر سکتا۔“

اچانک رات کے سناٹے میں ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز کسی آہستہ چیخ کی مانند گونج اٹھی بے ساختہ میری نظرس والی کلاک کی طرف اٹھ گئیں جہاں تین بجتے ہیں دو منٹ بالی تھے جلال نے اپنے دیے ہوئے وقت کی ڈیڈ لائن سے ٹھیک دو منٹ پہلے فون کر لیا تھا۔

میں نے دوسری گھنٹی بجنے کی نوبت آنے سے پہلے جھپٹ کر ریسیور اٹھالیا۔

انسانیت کے دشمنوں کی اس داستانِ عبرت کے باقی واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ کیجئے

ہو۔ اس وقت ہم صرف امکانات پر بات کر رہے ہیں۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ جلال کا ریکارڈ صاف ہو اور وہ کوئی نام دینے کے بجائے ہم سے معذرت کر لے۔ اتنی زیادہ تیاری کی ضرورت نہیں۔ میرا اسٹرائیک پونٹ صرف پانچ منٹ کے نوٹس پر کہیں بھی رواں لگی کے لیے تیار رہتا ہے۔ اس میں تین تیز رفتار گاڑیاں، دس بہترین نشانے باز اور ہر قسم کے ہلکے بھاری اور درمیانی بارودی ہتھیار شامل ہوتے ہیں۔ ہمیں اپنے ہدف تک پہنچنے میں دیر نہیں ہوگی۔“

میں نے اپنے نکتے پر اصرار نہیں کیا۔ رات کے سوا تین بجے پورا شہر سو جاتا ہے۔ شب بیدار رندوں کی محفلیں شاید جاگتی ہوں لیکن شہر بھر کی سڑکیں سنسان ہو جاتی ہیں جن پر تیز رفتاری سے سفر کرنے میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آتی۔ میں نے نرمی سے کہا ”اپنے کاموں سے تم زیادہ واقف ہو۔ میں ہر طرف سے وقت بچانا چاہ رہا ہوں۔ اگر تم اسپیش ٹاسک فورس کے انتظامات سے مطمئن ہو تو مجھے اس بارے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”میں تم کو یہ بتا دوں کہ ان لوگوں پر ذرا بھی رحم نہیں کیا جائے گا۔ وہ سب مادر فروش ہیں۔ چند گلوں کے لیے دشمن کے ہاتھوں بیکہ ہوئے ہیں۔ ان میں سے جو بھی نشانے پر آیا بے رحمی سے بھون ڈالا جائے گا۔ امان صرف جوشی کے لیے ہوئی جو ہمارا اصل ہدف ہے۔“

”اب وہ خبیث بھی ان ہی کا ساتھی نظر آ رہا ہے۔ اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔“

”اس سے ہمیں پوچھ گچھ کرنی ہے۔ یہ اگلوں کے لیے چوڑا کے لیے وہ ایک ایک اتنا اہم کیسے ہو گیا۔ اس کے بعد تو اسے بھی چندن کے پاس پہنچنا ہے۔“

ان باتوں سے میرے دل کا بوجھ ذرا ہلکا سا ہو گیا اور میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا ”اس بار عالم بالا میں ہمارے دشمنوں کی تعداد بہت تیزی سے بڑھی ہے۔ اتنی نفرتی ہو گئی ہے کہ وہ وہاں را اور سی آئی اے کے جسمی شعبے قائم کر سکیں۔“

اول خان کے ہونٹوں پر ایک بے ساختہ مسکراہٹ تیرنے لگی۔

اسی وقت سلطان شاہ ٹرے میں بھاپ اڑاتی ہوئی کافی کے تین مک تیار کر کے لے آیا۔ ہم دونوں نے خلوص دل سے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنے اپنے مک لے لیے۔ اگر وہ ہمت نہ کرتا تو ہمیں اتنی رات کے وہ لطف میسر نہیں

میں ان ہی کوائف کی تصدیق کی تھی جو ویرا ہمیں بتا چکی تھی۔

”۳۱ تنی رات گئے تمہیں اچانک جوشی اور چوڑا کیسے یاد آگئے؟“ اپنی معلومات دہرانے کے بعد جلال نے سوال کیا۔
 ”ان دونوں نے ہماری رات کالی کی ہوئی ہے۔“ دونوں اچانک غائب ہو گئے ہیں۔“ میں نے اسے مختصر بتایا۔
 ”غائب ہو گئے ہیں؟“ اس نے حیرت سے دہرایا ”کہاں سے؟“

”چوڑا کے گھر پر تالا پڑا ہوا ہے۔ جوشی کو کچھ نامعلوم آدمی گولیوں کی برسات میں اٹھالے گئے۔“ میں نے کہا
 ”اب تم گھر جا کر آرام کرو۔ اس بارے میں صبح تفصیل سے باتیں ہوں گی۔ اس وقت ہم ان دونوں کی راہ پر لگے ہوئے ہیں۔“

”کوئی مہم درپیش ہو تو پھر میرے لیے دن اور رات میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ بستر سے نکل آنے کے بعد میری صبح ہو چکی ہے۔ میری پروا کیے بغیر تم اپنی کہانی سناؤ۔“ جلال نے پر زور لہجے میں اصرار کیا۔

”امریکیوں کے مقابلے میں تم نے ہمیں بے دست و پا کر دیا ہے۔“ میں نے ایک گہرا سانس لے کر جواب دیا ”ان کے بعد ہمارے سامنے صرف بھارتی رہ گئے ہیں۔ ہم پر امن بچائے باہمی کے دعوے دار ہیں اس لیے بے گناہ بھارتیوں کے خون کی ہولی نہیں کھیل سکتے۔ مشتبہ بھارتیوں میں بدھو لال چوڑا کا نام سرفہرست ہے جو ہمیں چندن گرنانی نے بتایا تھا۔ ہم اس کی بو پر لگے ہوئے تھے مگر وہ ہمیں جل دے کہیں روپوش ہو گیا۔“

”تمہارا خیال ہے کہ جوشی نے اسے پناہ دی ہوئی ہے۔“ جلال نے بے صبری سے سوال کیا۔

جلال کے اس اندازے کی تردید کے لیے مجھے پوری کہانی سنانی پڑی۔ اختصار کے ساتھ وہ واقعات دہراتے ہوئے مجھے بار بار یہ خیال آ رہا تھا کہ ویرا نے اپنے طور پر کوئی تیر مارنے کے چکر میں جوشی کو فون نہ کیا ہوتا تو وہ بھیڑا اتنا نہ پھیلے۔ ہم آسانی کے ساتھ چوڑا کے گھر کا سراغ لگا کے خاموشی سے اسے موت کے گھاٹ اتار دیتے اور قصہ زمین برسر زمین ہی منٹ جاتا۔ ہمیں رات گئے جلال کو بستر سے نکال کر دفتر کی طرف نہ دوڑانا پڑا۔

”یہ تمہاری ویرا ابھی آفت کی پر کالہ ہے۔“ میری پوری بات سن لینے کے بعد جلال کے حسین آئینہ بھرے نے مجھے چونکا دیا۔ وہ کہہ رہا تھا ”جہاں ہاتھ ڈالتی ہے، پچھ نہ کچھ گند

”حیرت کی بات ہے۔“ فون اٹھاتے ہی میرے کان میں جلال کی متصل سی آواز آئی ”چوڑا کا ریکارڈ بالکل صاف ہے۔ حالیہ دنوں میں اس کا کسی مشکوک مقامی آدمی سے کوئی رابطہ نہیں رہا۔ مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ وہ بہت احتیاط سے کام کرنے والوں میں سے ہے۔“

میرے لیے جلال کا وہ جواب حوصلہ شکن تھا۔ میں نے سوچتے ہوئے سوال کیا ”کیا اس کے حوالے سے جوشی کا نام بھی تمہارے ریکارڈ پر نہیں ہے؟“
 دوسری طرف چند ثانیوں کے لیے خاموشی رہی پھر جلال کی آواز ابھری ”ہاں، مل گیا۔ اس کا تفصیلی حوالہ ہے۔ وہ دونوں اپنے علاقے کی ہندو پنجائیت کمیٹی کے ارکان ہیں۔ ان کے قریبی مراسم ہیں۔ جوشی ماضی میں ایک بدنام اور مشہور منشیات فروش رہ چکا ہے۔ کراچی میں ہیروئن کے فروغ میں وہ بہت پیش پیش تھا۔ شہر ہے کہ وہ شی یا ایسی ہی کسی دوسری زیر زمین سینڈ کیٹ کا رکن تھا۔ اس کا ماضی کھگالا گیا لیکن وقت گزر جانے کی وجہ سے کوئی بات کھل کر سامنے نہیں آسکی کہ وہ کراچی میں ہیروئن فروشوں کے کس گروہ کے لیے کام کر رہا تھا۔ پچھلے کئی سالوں سے وہ گوشہ نشین ہو۔“

میں نے درمیان میں اس کی بات کاٹ دی ”ایک منٹ ٹھہرو۔ کیا تم مجھے کسی فائل کے اقتباسات سنارہے ہو؟“
 ”فائلیں اب فرسودہ ہو چکی ہیں۔“ ہلکی سی بے جان ہنسی کے ساتھ اس کی آواز آئی ”۳۱ اس وقت میں کمپیوٹر پر جوشی اور چوڑا کا ریکارڈ دیکھ رہا ہوں۔ چوڑا کی وجہ سے جوشی ہماری نگاہوں میں آیا تھا پھر اس کے بارے میں کچھ جھان بن کی گئی تو بتا چلا کہ وہ اپنے ماضی سے دستبردار ہو کر گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہا تھا۔ مذہب اور مندر کے معاملات میں اس کا سارا وقت گزر جاتا تھا۔“

اس بار میں نے جلال کی گفتگو میں دخل اندازی نہیں کی اور وہ بولتا رہا۔

”وہ معمولی درجے کا بد معاش ہوا کرتا تھا۔ نامعلوم لوگوں کی مضبوط پشت پناہی سے اس کی دھاک جتنی چلی گئی لیکن مالی طور پر وہ کبھی آسودہ حال نہیں رہا۔ یہ حیرت ناک بات ہے کہ منشیات فروش سے تاب ہوتے ہی اس کے پاس پیسے کی ریل چیل ہوتی چلی گئی اور اس نے کراچی کے قدیم علاقے میں کئی جائدادیں خرید لیں۔ آج اس کا گزارہ صرف کرائے پر ہے۔ وہ اتنا خوش حال ہے کہ دل کھول کر اچھے کاموں میں سرمایہ کاری کرتا ہے۔“

جلال نے کوئی نئی بات نہیں بتائی تھی۔ جوشی کے بارے

آدھ روز میں اس کا ٹھکانا معلوم ہو جائے گا۔

”تم واقعی مقدر کے دھنی ہو۔“ سلطان نے سر ہلا کر اول خان کی تائید کی ”را“ ایف بی آئی اور سی آئی اے کے علاوہ نہ جانے کون کون تمہیں تلاش کر رہا ہو گا۔ تمہیں کی توجہ کا مرکز کراچی بنا ہوا ہے۔ تم یہاں ان کے سینے پر مونگ دل رہے ہو اور وہ بس ہیں۔“

”احتیاط اور محدود ترین روابط کی وجہ سے میں ان بھڑیوں سے بچا ہوا ہوں۔“ میں نے سنجیدگی سے جواب دیا ”تم یہ دیکھو کہ میری سوشل لائف کیا رہ گئی ہے۔ تم چاروں کے سوا بس جلال سے میل جول ہے۔ حد یہ ہے کہ یہاں آنے کے بعد میں نے اپنے پڑوسیوں سے ملنے کی زحمت بھی نہیں کی۔“

”پڑوسیوں کی بات رہنے دو۔“ اول خان نے بیزارگی سے کہا ”تم نے زحمت نہیں کی تو کیا ان میں سے کسی نے تمہارے دروازے پر دستک دی؟ درد مندی اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہونے کا جذبہ کراچی اور دوسرے شہروں کی صرف غریب آبادیوں میں پایا جاتا ہے۔ بڑے گھروں میں رہنے والے اپنی اپنی دنیا میں مگن رہتے ہیں۔ ان کو اس بات سے غرض نہیں ہوتی کہ ان کے پڑوس میں کون رہ رہا ہے، کیا کر رہا ہے اور کس حال میں ہے۔“

”پڑوسیوں کے ہاتھوں ستائے ہوئے معلوم ہو رہے ہو!“ میں نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

”میں اس روش سے آگیا ہوں۔ ملنا چاہتا ہوں مگر پڑوسی دور بھاگتے ہیں۔ ایک فرعون تو ایسے ہیں کہ پندرہ منٹ دروازے پر کھڑے بائیں کرتے رہے۔ رشتا بھی ایک مرتبہ اپنے گھر میں بیٹھنے کی دعوت نہیں دی۔“

”ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو درگزر کرو یا کرو۔“ سلطان شاہ نے ناصحانہ لہجے میں اسے تلقین کی ”یہ کراچی کے پانی کا اثر ہے۔“

”کراچی کے پانی کو کچھ نہ کہنا۔“ اول خان اس پر آنکھیں نکال کر غرایا ”یہ لوگوں کے اپنے ہائے ہوئے ڈھکوسلے ہیں۔ کراچی والوں کی فلسفاری کا احوال جانتا ہو تو لیاری، گویمار، لیاقت آباد، نئی کراچی اور سرعانی والوں سے ملو۔ وہ تمہیں ایسی ایسی دل گداز پائیں سنائیں گے کہ تمہیں اپنے اوپر شرم آنے لگے گی۔“

”تم بلاوجہ ناراض ہو گئے۔ میں نے تو کراچی والوں کی ایک کماوت دہرائی تھی۔“ سلطان شاہ نے منہ لٹکا کے کہا۔ ”یہ کماوت سنگ دلوں اور خود غرضوں کی گھڑی ہوئی

نکال کر سامنے لے آتی ہے۔ اب یہی دیکھ لو کہ جوشی اسی کی دریافت ہے۔ وہ اس کا سراغ نہ نکالتی تو تم بدھو کو مار کر خوش ہو جاتے، وہ سنبلیلا خاموشی سے پروان چڑھتا رہتا۔ کسی کو کانوں کان بھی پتا نہ چلتا کہ وہ کیا گل کھلا رہا ہے۔“

”تمہاری یہ بات درست ہے۔“ مجھے ہچکچاتے ہوئے اعتراف کرنا پڑا ”وہ سامنے ضرور آگیا ہے مگر اس کی وجہ سے الجھنیں بڑھ گئی ہیں۔“

”بعد کی پریشانیوں سے یہ الجھنیں بہتر ہیں۔ اس وقت ایک کے بجائے دو حریف تمہارے سامنے ہیں۔ تم کسی بھی وقت ان دونوں کو اپنے نشانے پر لے لو گے۔“ جلال ویرا کی کارکردگی کی تعریف پر تھلا ہوا تھا۔

”بس“ تم دعا کرتے رہو۔ میں نے بلاوجہ ہی تمہاری نیند برباد کی۔“ میں نے مضطرب سی آواز میں جواب دیا۔ ”ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“ جلال کی طرف سے جواب آیا ”کمپیوٹر پر جوڑا کی کمپیوٹر فائل کئی جگہ پھیلی ہوئی ہے۔ میں تم سے بات کرتے ہوئے ہر جگہ اس کے ریکارڈ کی جانچ پڑتال کر رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی بات سامنے آجائے اور میری بھاگ دوڑ کا پھل مل جائے۔“

”تم آرام سے اپنا ریکارڈ دیکھ لو۔ میں گھر پر ہی ہوں۔ کام ختم کر کے مجھے دوبارہ فون کر لینا۔“ میں نے مشورہ دیا۔

”ویری گڈ اور تھینک یو! تمہارے مشورے ہمیشہ مناسب اور پر عمل ہوتے ہیں۔“ جلال کے اس جواب کے ساتھ ہی فون بند ہو گیا۔ ایک وقت میں دو کام کرنے کی وجہ سے شاید وہ اپنے کمپیوٹر پر پوری توجہ مرکوز کرنے میں دشواری محسوس کر رہا تھا۔ اس نے فوری طور پر میرا مشورہ قبول کر لیا۔

”جلال سے بھی بات نہیں بن سکی۔ اب کیا کیا جائے۔“ سلطان شاہ نے پر تشویش انداز میں کہا۔

”یہ کوئی ایسا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ جوشی کا سراغ مل جائے گا۔ بس ذرا وقت صرف ہو گا۔“ اول خان نے اسے دلاسا دیا ”ہم سب اتنے گئے گزرے نہیں ہیں کہ شہر میں اپنے ایک مطلوب آدمی کا کھوج نہ لگا سکیں۔“

”یہ دعویٰ مت کرو۔“ میں نے مسکراتے ہوئے اسے ٹوکا ”امریکی اور بھارتی ایجنٹ اپنے پورے وسائل کے ساتھ ایک مدت سے مجھے تلاش کر رہے ہیں لیکن ان کو ناکامی کے سوا کچھ نہیں ملا۔“

”ہر شخص ڈینی نہیں ہوتا۔“ اول خان نے بے پروائی سے کہا ”خود کو دو نکلے کے اس بد معاش سے مت ملاؤ۔ ایک

ہے تاکہ اپنے کروت شمر کے پانی پر تھوپ دیں۔“
 ”ہم جذبات کی رو میں اگر ہلکے گئے۔ بات ہماری
 سوشل لائف کی ہو رہی تھی۔“ میں نے موضوع بدلنے کی
 کوشش کی۔

تخصیص

ایک شخص ڈاکٹر کے کلینک میں داخل ہوا تو اس
 کی حالت عجیب تھی۔ رنگت سبز نظر آرہی تھی جبکہ
 کان سرخ ہو رہے تھے۔ سانس تیز تیز چل رہی تھی۔
 جسم میں درد کی لہرں بھی اٹھ رہی تھیں۔ تفصیلی
 معائنے کے باوجود ڈاکٹر صاحب کی سمجھ میں نہ آیا کہ
 اسے کیا مرض تھا۔ برابر کے کمرے میں جا کر انہوں
 نے میڈیکل کی کتابیں بھی دیکھیں مگر کوئی مدد نہ ملی۔
 انہیں معلوم تھا کہ ہر مریض کی طرح یہ مریض بھی
 جاننا چاہے گا کہ اسے کیا ہوا ہے چنانچہ انہوں نے یہ
 نوٹ آتے ہی سوال کیا ”آپ کو یہ بیماری پہلے بھی
 ہوئی ہے؟“

”جی ہاں“ مریض نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔
 ”بس... وہی بیماری آپ کو دوبارہ بھی ہو گئی ہے“
 ڈاکٹر صاحب نے مدبرانہ انداز میں سر ہلاتے ہوئے
 کہا۔

رشک

”شادی کے لیے مجھے ایسی لڑکی کی تلاش ہے
 جیسی لڑکی سے دادا جان نے شادی کی تھی۔“
 ”چھوٹو یا راجہ آج کل کے زمانے میں ویسی لڑکیاں
 کہاں ملتی ہیں۔“
 ”کیوں نہیں ملتیں... دادا جان نے دو ماہ پہلے ہی تو
 شادی کی ہے۔“

”سوشل لائف میری اور دیر کی تباہ ہوئی ہے۔“
 سلطان شاہ نے احتجاج کیا ”تم غزالہ کے ساتھ مگن رہتے ہو۔
 دل گھبراتا ہے تو گپ شپ کرنے کے لیے سہلی اور جہانگیر کی
 طرف چلے جاتے ہو۔ ہم دونوں کے لیے آکٹا ہٹ، تنہائی اور
 بیزاری کسے سوا کیا ہے۔“

”جہانگیر بے چارہ!“ اس کا ذکر آتے ہی میرے ذہن پر
 ندامت کی ایک لہر سی چھا گئی ”اس نے میری دوستی کی سب
 سے بھاری قیمت ادا کی ہے۔ اس کا اکلوتا بیٹا شیر خواری کے
 زمانے سے ہی خیمیاں میں پل رہا ہے۔ اگر وہ اپنے ماں باپ
 کے ساتھ ہوتا تو آج ان دونوں کی زندگی کی ڈگر بہت مختلف
 ہوتی۔ اس بار تو مجھے ان سے ملے ہوئے کافی دن ہو گئے ہیں۔
 شاید سہلی بھی لاہور سے واپس آچکی ہوگی۔“

”وہ تمہارا خالص دوست ہے۔ تمہیں کبھی کبھی اس
 سے مل لینا چاہیے۔“ اول خان نے مجھے تلقین کی پھر وہ
 سلطان شاہ کی طرف متوجہ ہو گیا ”تم دونوں کو ٹھنڈے دل
 سے غزالہ کی تجویز پر غور کرنا چاہیے۔ تمہاری تنہائی اور
 بیزاری کا صرف ایک ہی علاج ہے۔“

سلطان شاہ کا منہ بند گیا لیکن اس نے کوئی جواب نہیں
 دیا۔ میں نے دانستہ اسے چھیڑا ”اول خان کا اشارہ تمہاری
 اور دیر کی شادی کی طرف ہے۔“

”میں سمجھ رہا ہوں، سب سمجھ رہا ہوں۔ اسی لیے
 خاموش ہوں۔“ اس نے اپنے ننھے پھلاتے ہوئے جواب دیا
 ”شادی تو بہت دور کی بات ہے۔ میرا خیال ہے کہ دیر کسی
 شریف آدمی کی دوستی کے قابل بھی نہیں ہے۔ بس گلے بڑ گئی
 ہے اس لیے دوسروں کی طرح میں بھی اسے برداشت کر رہا
 ہوں۔“

”اور اگر وہ بھی تمہارے بارے میں یہی خیالات رکھتی
 ہو؟“ اول خان نے استہزائیہ انداز میں پوچھا۔

”کیا؟“ سلطان شاہ یکایک بھڑک گیا ”وہ کیا کہتی ہے
 میرے بارے میں؟“

اس اثنا میں اول خان مجھے آنکھ مار چکا تھا۔ میں نے
 جھٹ بات سنبھالتے ہوئے کہا ”اس کا خیال ہے کہ تم سے
 شادی کرنے سے بہتر ہے کہ کسی شیر خوار بچے کو گود لے لیا
 جائے۔ اس کی ٹیڈی ٹیڈی فیڈر کا ٹیڈی ہی ختم ہو جائے

کے ہر شر اور قصبے میں رونما ہونے والے غیر معمولی واقعات کی تاریخ وار تفصیل موجود ہے۔ یہ واقعہ اس اعتبار سے غیر معمولی تھا کہ چوڑا کے پیچھے سے پہلے مشتعل ہندوؤں کی بڑی تعداد تھانے پر جمع ہو گئی تھی۔ وہ لوگ تھانے کو آگ لگا کر راجا کو مار ڈالنے پر تے ہوئے تھے۔ چوڑا کی مداخلت پر سب کچھ حیرت ناک سرعت سے قابو میں آنا چلا گیا۔ کراچی کی ہندو برادری میں اس کا اثر و رسوخ حیران کن ہے۔

”راجا ہی ہمارا مطلوب آدمی ہو سکتا ہے۔“ میں نے پُر یقین لہجے میں کہا ”وہ اپنے سارے کام فون کے ذریعے چلاتا ہے اس لیے تمہارے کسی آدمی کی نظروں میں نہیں آسکا۔ راجا کو غضب ناک ہندوؤں سے بچانے کے لیے ایک مرتبہ اسے راجا سے ملنا پڑا اور تمہارے کمپیوٹر نے وہ واقعہ اگل دیا۔ بہی بازار میں جن مسلح لوگوں نے جوشی کی عمارت کو گھیرے میں لیا وہ تھا وہ راجا کے آدمی ہوں گے۔ یہ نام مجھے کچھ مانوس سا لگ رہا ہے۔“

”کاش میری یہ محنت تمہارے کام آسکے۔ مجھے نتیجے سے ضرور باخبر کرنا۔“ جلال کی آواز میں اس کی دلی آرزو جھلک رہی تھی۔

”تم بے فکر رہو۔ آنے والا دن ہم سب کے لیے کوئی نہ کوئی خوش خبری کے رطلوں ہوگا۔“

فون کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ان دونوں کے لیے یہ بہت بڑی بات تھی کہ جلال نے اپنے کمپیوٹر کی یادداشت کھنگال کر ایک نام دریافت کر لیا تھا۔

میں غلت اور خوشی میں جلال سے یہ پوچھنا بھول گیا کہ راجا کی گرفتاری کس تھانے میں ہوئی تھی۔ میں چاہتا تو مختصر سی کال کر کے اس سے یہ بات معلوم کر سکتا تھا مگر اول خان نے مجھے روک دیا۔

وہ اپنی نوعیت کا انوکھا اور منفرد واقعہ تھا۔ ایسے واقعات روز روز پیش نہیں آتے۔ اول خان کا اندازہ تھا کہ شہر کے اعلیٰ پولیس افسران اس واقعے کو دیر تک نہیں بھلا سکیں گے۔ ان سے تھانے کا سراغ ملے ہی راجا کا سارا کچا چھٹا سامنے آ جاتا۔

مطلوبہ ہدف کے حصول کے لیے فیلڈ ورک اول خان کے آدمیوں کو کرنا تھا مگر پولیس افسران کی مدد حاصل کرنے کے لیے اول خان خود پیش قدمی کرنا چاہتا تھا۔ وہ روایات پرست اور پروٹوکول کا سخت حامی تھا۔ اپنے کسی ماتحت کو اس کام پر لگا کر وہ پولیس افسران کو یہ سوچنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا کہ ایس ٹی ایف کا اسٹیشن کمانڈر بددماغ ہو کر خود کو

تنبائی کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے حل ہو جائے گا۔ میں تم سے یوں ہی مذاق کر رہا تھا۔ میری باتوں کو اپنے دل پر نہ لے بیٹھنا۔ ویرا تم سے بہت لگاؤ رکھتی ہے، وہ ایسی دیکھی باتیں نہیں کرتی۔“ میں نے جلدی سے وضاحت پیش کر دی۔

سلطان شاہ شکاہتی نظروں سے میرے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ”مجھے توقع نہیں تھی کہ تم مجھ سے ایسا مذاق کرو گے۔ میں ویرا سے کون سا خوش رہتا ہوں۔ ایسی کڑوی کسلی باتیں مجھے اس سے ہمیشہ کے لیے متنفر کر سکتی ہیں۔“

”اسی لیے میں نے تمہیں یہ بتانے میں دیر نہیں لگائی کہ میں مذاق کر رہا تھا۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”عظمتی مجھ سے بھی ہوئی ہے۔“ اول خان نے فراخ دلی سے اعتراف کیا ”ویرا اور سلطان شاہ کا معاملہ نازک ہے۔ ان کے بارے میں ہمیں محتاط رہنا چاہیے۔ ایسا مذاق کسی سے منسوب نہیں کرنا چاہیے جو دوسرے فریق کی دل آزاری کا سبب بنے۔ بری باتیں دلوں پر فوری اثر ڈالتی ہیں۔“

میں نے اپنے دونوں کان پکڑ لیے ”ان دونوں کے بہترین مستقبل کی امید میں، میں غیر ذمے دارانہ مذاق سے تاب نہ ہوتا ہوں۔“

”بلاوجہ بات بڑھانے کی ضرورت نہیں۔“ سلطان شاہ نے خشک لہجے میں کہا ”ویرا خود کو بدلے گی نہ میں بدل سکتا ہوں۔ ریل کی یہ دونوں پینزیاں کتنی ہی دور نکل جائیں، ایک دوسرے سے نہیں مل سکتیں۔ اس بارے میں زیادہ سوچ کر تم بلاوجہ اپنے ذہن کو تھکا رہے ہو۔ یہ میرا۔“

اس کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ اچانک فون کی گھنٹی بج اٹھی تھی۔

جلال کی آواز خاصی پر جوش تھی ”بدحوال چوڑا بہت محتاط اور دور بین آدمی ہے۔ شاید اپنے کام فون سے چلاتا ہے۔ میں نے پورے سال کا ریکارڈ دیکھ ڈالا لیکن کچھ بتا نہیں چلا۔ کراچی کے غیر معمولی حادثات میں آج سے چار مہینے پہلے اس کا نام موجود ہے۔ راجا نامی ایک بدعاش کی گاڑی سے بارہ سالہ ہندو لڑکی پھیل کر مر گئی تھی مگر بات پولیس کے روزنامے سے آگے نہیں بڑھی۔ چوڑا بروقت تھانے پہنچ گیا۔ اس کی مداخلت پر لڑکی کے ورثا توان کی رقم لینے پر آمادہ ہو گئے اور راجا پولیس کیس سے بچ گیا۔“

”کمال ہے۔“ میں نے کھلے دل سے اس کی تعریف کی

”تم نے بہت باریکی سے چھان بین کی ہے۔“

”بس، مجھے اچانک خیال آ گیا۔ میرے کمپیوٹر پر پاکستان

باقی تھا۔ اگر اسے کامیابی حاصل ہو جاتی تو ہم سورج طلوع ہونے سے پہلے راجا تک رسائی حاصل کر سکتے تھے۔

”اول خان یہاں سے جائے بغیر بھی اپنا کام کر سکتا تھا۔“ کچھ دیر کے توقف کے بعد سلطان شاہ نے سکوت توڑا۔ ”شاید تمہارا مطلب ہے کہ وہ فون استعمال کر سکتا تھا۔“ میں نے متفطرانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”ظاہر ہے۔“ اس نے اقرار کیا ”یہ سہولت ایسی ہی ایمر جنسی میں کام آتی ہے۔“

”دن کی اور بات ہوتی ہے۔ رات کے تین بجے فون کی گھنٹیاں بجا کر کسی کو جگانا اور پھر سوالات کرنا معیوب لگتا ہے۔“

”نیند تو دروازے پر دستک دینے سے بھی خراب ہوگی۔۔۔“

وہ بحث برائے بحث پر تلا ہوا تھا۔ شاید اس طرح وقت گزارنے اور نیند کی رو سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اس کی بات درمیان سے کاٹ دی ”فون پر صرف آوازیں سنائی دیتی ہیں جن سے مخاطب کے موڈ کا کوئی اندازہ نہیں ہوتا۔ روہو ملاقات کی کوئی اہمیت نہ ہوتی تو فون، فیکس، ای میل اور سونٹکسٹ کے آجانے کے بعد ساری اڑلائیکز کا برس چوٹ ہو گیا ہوتا۔ سارے کام گھریا دفتر میں بیٹھے بیٹھے ہو جاتے۔“

”تھانوں میں تعینات افسران اور عملے کو ڈیوٹی پر سونے کی اجازت نہیں ہوتی۔ وہ کسی کے گھر جانے کے بجائے قریبی تھانے کا رخ کرتا تو زیادہ بہتر ہوتا۔“

”وہ ایس ٹی ایف کا مقامی سربراہ ہے اور اتنی عقل رکھتا ہے۔ وہ کسی تھانے کی طرف ہی گیا ہوگا۔“

”پھر ٹھیک ہے۔“ میرے جواب سے سلطان شاہ کچھ مطمئن سا ہو کر بولا ”اس کا خود جانا ہی بہتر تھا۔“

ہمیں زیادہ دیر تک اول خان کی واپسی کا انتظار نہیں کرنا پڑا۔ وہ بمشکل آدھے گھنٹے میں لوٹ آیا۔

”مجھے زیادہ لمبی دوڑ نہیں لگانی پڑی۔“ اس نے آتے ہی مسرت آمیز لہجے میں بتایا ”گھر سے نکل کر میں سوک سینٹر کے سامنے پولیس لائن میں چلا گیا۔ وہاں مجھے ایک ڈی ایس پی مل گیا جس نے سارا مسئلہ حل کر دیا۔“

”راجا کا وہ واقعہ اتنا اہم تھا کہ ہرنے دار پولیس افسر کو زبانی یاد ہوگا۔“ سلطان شاہ نے لقمہ دیا۔

”وہ واقعہ سعید آباد کے علاقے میں پیش آیا تھا۔ راجا کا ٹھکانا بھی وہیں ہے۔“ اول خان نے انکشاف کیا۔

”تو دیر کس بات کی ہے۔ اپنے اسٹرائیک پونٹ کو رواں لگی کا حکم دے دو۔“ میں نے اپنی جگہ چھوڑتے ہوئے کہا۔

”یہ نیک کام میں نے راستے میں موبائل فون پر کر لیا تھا۔ وہ لوگ حسن اسکوائر کے چوراہے سے ابن سینا روڈ پر مڑ کر ہمارا انتظار کریں گے۔ اب تم رواں لگی کی تیاری کرو۔“

”کہاں رواں لگی کی تیاری ہو رہی ہے۔“ ویرا کی نیند سے بوجھل آوازیں سن کر میں بری طرح چونک پڑا۔

وہ ڈرائنگ روم کے دروازے پر کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے شب خوابی کے کپڑوں پر ڈھیلا سا گاؤن پہنا ہوا تھا۔ نیند کے شمار سے اس کی آنکھیں سرخ اور متورم ہو رہی تھیں لیکن اس نے اپنے بال سنوارے ہوئے تھے۔

”تم تو مردوں سے شرط لگا کر سوئی ہوئی تھیں۔ اچانک کہاں سے نازل ہو گئیں؟“ سلطان شاہ نے حیرت سے پوچھا۔ ”میں مری نہیں تھی، سوئی ہوئی تھی۔ میری آنکھ کھٹی کی آوازیں کرکھٹی تھیں۔ ابھی کون آیا تھا؟“

”آنا جانا کس کو تھا۔ ہم تینوں یہاں بیٹھے گپ شپ کر رہے ہیں۔ تمہارے کان بجے ہوں گے۔“ سلطان شاہ نے بے نیازی سے کہا۔ اس وقت وہ ویرا کو گھسنے کے موڈ میں نظر آ رہا تھا۔ میں نے ان کی باتوں میں مداخلت ضروری نہیں سمجھی۔

”میں اتنی مدد ہوشی کی نیند نہیں سوتی۔“ ویرا نے اپنی کر پر ہاتھ رکھ کر اسے گھورتے ہوئے کہا ”سچ بتاؤ کہ کون آیا تھا؟“

”جس گھر میں ایک عورت شراب پیتی ہو وہاں رحمت کے فرشتے بھی نہیں آسکتے۔ یہاں اور کون آتا؟“

”تم کہیں گئے ہوئے تھے؟“ اس بار ویرا نے براہ راست اول خان سے سوال کیا۔ اس نے سلطان شاہ کے تبصرے کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا۔

وہ ان دونوں کی بحث میں فریق نہیں تھا، انکا مدد نہیں کر سکا ”تم کھڑی ہوئی کیوں ہو۔ آرام سے بیٹھ جاؤ۔ میں تھوڑی دیر کے لیے باہر گیا تھا۔“

ویرا نے ہلکی سی فاتحانہ مسکراہٹ سے سلطان شاہ کی طرف دیکھا اور صوفے پر آن بیٹھی۔ اپنی نشست درست کر کے اس نے ایک سگریٹ سلگائی، تھنوں سے اس کا دھواں خارج کرتے ہوئے وال کلاک پر نظر ڈالی پھر سلطان شاہ سے بولی ”اس وقت صبح کے ساڑھے تین بج رہے ہیں اور تم مریچیں چبا رہے ہو۔ میں فکر مند ہوں کہ رات کے کھانے

”اگر کوئی اسٹرائیک فورس بھی تم دونوں کے ساتھ ہے تو سلطان شاہ کا جانا غیر ضروری ہے۔“ ویرا نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

”مجھ سے تمہیں کیا چڑ ہے جو مجھے جانے سے روک رہی ہو۔“ سلطان شاہ نے بھڑک کر پوچھا۔

”چڑ نہیں لگاؤ ہے۔“ ویرا نے مسکرا کر اسے آنکھ ماری ”غزالہ گہری نیند سو رہی ہے اور وہ دیر تک سوئی رہے گی۔ میری نیند پوری ہو چکی ہے۔ میں اکیلی بیٹھی بور ہوئی رہوں گی۔ تم ہو گے تو میرا دل لگا رہے گا۔“

”میں تمہارا مصاحب تو نہیں ہوں۔ کیا تم نے مجھے اپنا کھلونا سمجھا ہوا ہے!“ سلطان شاہ نے تنک کر کہا۔

”اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔“ اول خان نے دخل دیتے ہوئے کہا ”ایک سے دو آدمی ہوتے ہیں تو دونوں کا دل لگا رہتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم رک جاؤ۔ اس بحث میں ہمیں دیر ہو رہی ہے۔ اسٹرائیک فورس طے شدہ پوائنٹ پر پہنچ چکی ہوگی۔“

”یہ میرے ساتھ سراسر زیادتی ہے۔“ سلطان شاہ نے بے بسی سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”مجبوری ہے۔“ میں نے اپنے شانے اچکا کے بے پردائی سے جواب دیا ”یہ اول خان کا مخلصانہ مشورہ ہے۔ میں اس میں دخل نہیں دے سکتا۔“

سلطان شاہ دلی زبان سے احتجاج کرتا رہا لیکن بات طے ہو چکی تھی۔ اس کے احتجاج کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ہمارے درمیان کچھ ہی دیر پہلے اس کے اور ویرا کے نازک مراسم کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی تھی۔ وہ ویرا کی فرمائش کے سامنے سر ڈالنے کو اپنی سبکی محسوس کر رہا تھا۔

اسٹرائیک فورس کی شمولیت کی وجہ سے ہمیں کسی بڑی تباہی کی ضرورت نہیں تھی۔ ضرورت کے اہم ہتھیار ہر دن اول خان کی جیب میں موجود رہتے تھے۔ اول خان سے ملنے میں ملی ہوئی خطرناک انگوٹھیاں ہر وقت میری انگلیوں میں بڑی رہتی تھیں۔ میں فوری طور پر اول خان کے ساتھ گھر سے نکل کھڑا ہوا۔

”ہمیں دور رہ کر پورے آپریشن کی کمان کرنی ہے۔“ اول خان نے گاڑی میں اپنی نشست سنبھالنے کے بعد مجھے ہدف کیا ”ساری عملی کارروائی اسٹرائیک یونٹ والے کریں گے۔“

”کیا وہ راجا کے اڈے سے واقف ہیں؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

میں نے کیا بے اعتمادی کی تھی کہ اس کے اثرات اب تک باقی ہیں۔“

”تمہیں دیکھ لینے کے بعد شد میں بھی مرجوں کا مزہ آنے لگتا ہے۔“ وہ بولا۔

”بس مرجیں چباتے رہو۔ ان کے اثرات معدے کے راستے دور تک پہنچیں گے۔“ ویرا نے بے اعتنائی سے کہہ کر اپنا رخ دوبارہ اول خان کی طرف پھیر لیا ”یہ بتاؤ کہ اتنی صبح تم کہاں روانہ ہونے کا پروگرام بنا رہے تھے۔“

اول خان نے بے بسی سے میری طرف دیکھا۔ میں نے نرمی سے کہا ”چوڑا کے ایک راپٹے کا سراغ مل گیا ہے۔ اس وقت ہم راجا جانی ایک بد معاش کے اڈے پر دھاوا بولنے جا رہے ہیں۔ مجھے شبہ ہے کہ جوشی کو اسی کے آدمی اٹھا کر لے گئے ہوں گے۔“

ویرا کو ان واقعات کے ہر پیر کا علم نہیں تھا اس لیے اس نے قدرے حیرت سے پوچھا ”رات اول خان کو جوشی کو پکڑنے میں کامیابی نہیں ہوئی۔“

”جوشی ہاتھ آگیا ہوتا تو اس وقت ہم یہاں بیٹھے اپنا سر نہ کھپا رہے ہوتے۔“ سلطان شاہ نے چڑچڑے لہجے میں کہا ”پتا نہیں تمہاری آنکھ کیوں کھل گئی۔ اب تمہیں شروع سے آخر تک پوری رام لیلیا سنانی چاہئے۔“

”وہاں پہلے سے کچھ سسٹم آدی چھپے ہوئے تھے۔“ اول خان نے مداخلت کرتے ہوئے کہا ”ہمارے پیچھے کا اندازہ لگاتے ہی انہوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ وہ جوشی کو اٹھالے گئے یا پھر وہ خود ہی ڈر کر ان کے ساتھ بھاگ گیا۔“

”آئی سی!“ ویرا ہونٹ سیڑ کر بے ساختہ بولی ”فرار اور اغوا میرا بہت فرق ہے مگر ایک بات صاف ظاہر ہے کہ چوڑا کے لیے جوشی بہت اہم آدمی ہے۔ اسے تم سے بچانے کے لیے اس نے خاصا ڈرامائی قدم اٹھایا ہے۔“

”وہ سمجھ رہا ہے کہ ان حرکتوں کے ذریعے بچ جائے گا مگر وہ اپنی نجات کی راہیں خود مسدود کر رہا ہے۔“ اول خان بولا۔ ”کیا یہ ممکن ہے کہ میں بھی تم لوگوں کے ساتھ چلوں؟“ ویرا نے خلاف معمول نرمی سے پوچھا۔

”چل سکتی ہو۔“ میں نے جواب دیا ”مگر بہتر یہ ہو گا کہ تم گھر پر رہو۔ یہاں غزالہ اکیلی رہ جائے گی۔“

”اوہ تو کیا سلطان شاہ تمہارے ساتھ جا رہا ہے؟“ اس نے چونک کر پوچھا۔

”یہ ہماری پوری منصوبہ بندی میں شریک ہے۔ اول خان کی اسٹرائیک فورس کے ساتھ اسے بھی ہونا چاہیے۔“

اس کے اسٹریٹک پلانٹ کی تین گائیاں اس کی تھلید کر رہی تھیں۔

لیاقت آباد دس نمبر اور پٹرول پمپ کے بڑے چوراہوں کو عبور کرتا ہوا، وہ کارواں ناظم آباد سے گزر کر سائٹ کے علاقے میں داخل ہو گیا جہاں کی فضا میں شبنم کارخانوں میں چلنے والی مشینوں کی گونج رچی ہوئی تھی۔ شہر کے مکین صبح کے ان اولین لمحات میں گہری نیند سوئے ہوئے تھے لیکن اپنے بچوں کے لیے نان شبنم کمانے کے آرزو مند مزدوروں نے کارخانوں کو آباد رکھا ہوا تھا جہاں سے حاصل ہونے والی پیداوار ملک کی شہرہ رگ کو قوت نمونہ فراہم کرتی ہے۔

سائٹ کی طویل اور سیدھی سڑک پر سفر کرتے ہوئے، ہم شیر شاہ کے علاقے سے داہنی طرف مڑ گئے۔ وہ راستہ مہاجر کیمپ اور سعید آباد سے ہوتا ہوا حب اور پھر آگے چلا جاتا تھا۔ دن میں اس سڑک پر گڈانی کے شب بریکنگ یا رڈ سے اسکرپ لانے والے ٹرکوں کا آنتا بندھا رہتا ہے مگر اس وقت وہ سڑک بھی خالی تھی۔

”یہاں سے سعید آباد علاقہ شروع ہو گیا۔“ اول خان نے سڑک کے کنارے پولیس ٹریننگ اسکول کا بورڈ دیکھ کر مجھے آگاہ کیا، میں اس دلی جونی کے لیے ہنکارا بھر کر رہ گیا۔ وہ علاقہ میرے لیے نیا نہیں تھا۔ یہ اور بات تھی کہ وقت گزرنے کے ساتھ وہاں کافی تبدیلیاں رونما ہو گئی ہوں۔

کچھ دور نکلنے کے بعد اول خان نے اپنی گاڑی داہنی طرف ایک کشادہ سڑک پر موڑ دی۔ کچھ فاصلے پر ایک اور موڑ گھومنے پر ہم ایک میدان کے قریب جا نکلے۔ میدان کی دیوار کے ساتھ ایک معقول سڑک نظر آرہی تھی۔ سڑک کے دوسرے کنارے پر، میدان کے متوازی مکانات کی قطار تھی۔ کھلے راستوں سے اس علاقے میں آتے ہی میں نے اندازہ لگایا تھا کہ چاروں گاڑیوں کے انجنوں کی بھاری آوازیں اس علاقے کا سکون درہم برہم کر سکتی تھیں۔

گاڑیوں کے اس جلوس کو دیکھ کر کوئی بھی یہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ ان اطراف میں کوئی کارروائی ہونے والی تھی۔ اول خان نے میرے ہاتھ سے اپریٹس لے لیا اور اسے اپنے منہ کے قریب لے جا کر وہی آواز میں بولا ”ایگل دن کانٹک ابوری باڈی۔ اور!“

”ایگل ٹو سر!“ کسی توقف کے بغیر دوسری طرف سے جواب آیا۔ شاید ایگل ٹو ہی اسرائیلک پونٹ کا کمائڈو تھا۔ وہ کہہ رہا تھا ”ہم سب تیار ہیں۔ ہمیں بائیں طرف والی قطار کے آخری سفید مکان کا انتظار ہے۔ اور!“

اول خان نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے نفی میں جواب دیا ”میں نے جو کچھ سمجھا ہے اس کی روشنی میں وہ عمارت آسانی سے پہچان لی جائے گی۔ اس کی نشان دہی کا فریضہ مجھے ادا کرنا ہوگا۔ آگے کا کام میرے جوان سنبھال لیں گے۔“

”ان سے ہمارا رابطہ کیسے رہے گا؟“ میرے ذہن میں عملی سوالات تیزی سے سرابھار رہے تھے۔

اول خان نے ڈیش بورڈ سے ایک اپریٹس نکال کر میری گود میں ڈال دیا ”یہ ٹی ٹی مہری اپریٹس سات سے دس کلومیٹر کی رینج میں زبردست کام کرتا ہے۔ ہم سب ایگل کے نام سے ایک دوسرے کو پہچانیں گے۔ ہر ایگل کا نمبر مختلف ہوگا۔“

میں نے خاموشی اختیار کر لی۔ اول خان ذرا سی دیر میں رہائشی گلیوں کو پیچھے چھوڑ کر اپنی جیب کو یونیورسٹی ریوڈ پر لے آیا جو اس وقت دور دور تک سنسان پڑی ہوئی تھی۔ چند ثانیوں میں ہم حسن اسکوائر پہنچ گئے۔ ٹریفک سگنل بند تھا لیکن راستہ صاف تھا۔ اس چوراہے سے داہنی طرف گھومتے ہی مجھے فوجی طرز کی وہ تین گائیاں نظر آئیں جو لیاقت آباد کی سمت میں منہ کیے سڑک کے بائیں کنارے کے ساتھ کھڑی ہوئی تھیں۔

ایس ٹی ایف والوں کی عقابانی نظروں نے اپنے چیف کی گاڑی دور ہی سے پہچان لی۔ ہمارے قریب پہنچنے سے پہلے چست کپڑوں میں لمبوس، دس مسلح اور چاقو و ہتھیار افراد، ان تین گاڑیوں سے نکل کر دو مقفوں میں کھڑے ہو چکے تھے۔

اول خان جیب کا انجن بند کر کے جوں ہی نیچے اترا، پتہ فٹ پاتھ ان دسوں کے جوتوں کی ہم آواز دھمک سے گونج اٹھی۔ اگر ان کے جوتوں کے تلے ربر کے نہ ہوتے تو ان کے نیم فوجی سلام کی گونج رات کے سناٹے میں دور تک سنی جاتی۔

اول خان نے مجھے گاڑی سے اترنے کی دعوت نہیں دی تھی۔ اس لیے میں اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ وہ قریب جا کر اپنے دونوں ہاتھوں کی مدد سے اپنے آرمیوں کو کچھ سمجھا رہا تھا۔ یہ بات بار بار میرے تجربے میں آچکی تھی کہ اسٹیشن ٹاسک فورس سختی کے ساتھ فوجی ڈسپلن پر کاربند تھی۔ سینئر کی ہدایات پر آنکھیں بند کر کے عمل کرنا ہر جونیہ اپنا فرض تصور کرتا تھا۔ اول خان کو اپنی بات ان کے ذہنوں میں بٹھانے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ ذرا سی دیر میں وہ ان سے فارغ ہو کر واپس آگیا۔

اس بار اول خان نے اپنی گاڑی آگے نکال لی تھی۔

جائیں گے۔“ اول خان بر تشویش آواز میں بڑبڑایا۔
 ”یہ کوئی چال چلنے کی کوشش کر رہے ہیں“ میں نے
 اضطرابی لہجے میں کہا ”میں کسی طرف سے نکل نہ
 جائیں۔“

ان لوگوں کے برابر والے گھر میں کودنے کا خطرہ موجود
 تھا۔ اول خان نے گولیوں کی پروا کیے بغیر اپنی جیب آگے
 بڑھائی اور پھر اسے تیزی سے بھٹی گلی میں موڑ دیا۔

یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ پشت پر مکانات ایک
 دوسرے سے ملے ہوئے نہیں تھے۔ اس طرف ایک تنگ
 اور تاریک گلی تھی جس میں دو سائے سفید مکان کی عقبی
 دیوار پر چڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس سمت میں موجود
 پہلی گاڑی کا عملہ انہیں اپنی فائرنگ سے کور کر رہا تھا۔

اچانک فضا پہلی انسانی چیخ سے لرز اٹھی۔ اس دردناک
 چیخ میں پنہاں دہشت سے ظاہر ہو رہا تھا کہ مجروح ہونے
 والے کو اپنی فوری موت کا یقین ہو چکا تھا۔

”تمہارے آدمیوں میں کوئی راجا کو پہچانتا ہے؟“ میں
 نے نہایت سیرگوشی کے انداز میں اول خان سے پوچھا۔

”کوئی نہیں پہچانتا لیکن تم فکر نہ کرو، یہاں سے چڑھا
 بچہ بھی زندہ فرار نہیں ہو سکے گا۔“

فائرنگ کے کان پھاڑ دینے والے شور میں ایک برہول
 دھماکا ہوا اور اس بار مکان کی چلی منزل کالے اور کثیف
 دھوئیں سے بھرنے لگی۔

”گڈ، وبری گڈ۔ ان کا یہی علاج ہے۔“ اول خان خود
 کلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔

”تم کیا کہہ رہے ہو؟ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہاں کیا
 ہو رہا ہے؟“ میں نے انھن کے عالم میں کہا۔

”تمنا شاید کہتے رہو۔ اسٹرائیک یونٹ نے اندر دھوئیں کا
 بم فائر کیا ہے، وہ زیادہ دیر تک اندر نہیں ٹک سکیں گے۔“

اول خان خود بچان زدہ تھا مجھے تسلی دینے کی کوشش
 کر رہا تھا۔

اسپیش ٹاسک فورس والے روایتی لڑاکا نہیں تھے۔ وہ
 جم کردشمن کا مقابلہ کرنے اور اسے سنبھلنے کا موقع دینے کے
 قائل نہیں تھے۔ ان کی ہر کارروائی کمناڈو ایکشن ہوتی تھی
 جس میں وہ اپنے حریف کو جلد از جلد مار دینے یا حیرت زدہ
 کر کے بے بس کرنے کی کوشش کرتے تھے تاکہ قانون نافذ
 کرنے والے کسی اور ادارے کے متوجہ ہونے سے پہلے
 اپنے مقاصد حاصل کر کے جائے واردات سے دور از دور
 نکل جائیں۔

”مکان کسی بھی لمحے نظر آجائے گا۔ اب آگے نکل جاؤ
 اور محاصرہ کرلو۔ میں پیچھے آ رہا ہوں اور اینڈ آئل!“ اول
 خان نے اپنی جیب کی رفتار کم کر لی اور تینوں گاڑیاں گڑگڑاتی
 ہوئی آگے نکل گئیں۔ آخری گاڑی کے آگے نکلنے ہی اول
 خان نے اپنی جیب کو سڑک کے وسط میں لے کر اس کی رفتار
 بڑھادی۔

پھر مجھے اس قطار کا آخری سفید مکان نظر آ گیا جو شاید
 دو ملے ہوئے پلاٹوں پر تعمیر کیا گیا تھا۔ اپنے وسیع رقبے اور بلند
 عمارت کی وجہ سے وہ گھر شاید پوری آبادی میں سب سے
 نمایاں اور منفرد تھا۔

سب سے اگلی گاڑی اس مکان کے قریب پہنچنے ہی بغلی
 گلی میں غائب ہو گئی۔ ہم وہاں پہنچے تو بقیہ دو گاڑیاں رک کر
 مکان کے سامنے پوزیشن لے چکی تھیں۔
 آس پاس کے مکانوں میں بس اکاؤٹ کا روشنیاں نظر آرہی
 تھیں ورنہ پورے پورے گھر رات کی تاریکی میں ڈوبے
 ہوئے تھے۔ اس کے برعکس سفید مکان کی چلی اور بالائی منزل
 کی کئی کھڑکیاں روشن نظر آرہی تھیں۔ ان روشنیوں سے
 ظاہر ہو رہا تھا کہ راجا کے اڈے کے سارے مکین غفلت کی
 نیند نہیں سوئے ہوئے تھے۔

اچانک عمارت کی بالائی منزل کے کسی تاریک حصے سے
 پڑہول دھماکے کے ساتھ ایک شعلہ لپکا اور تاریکی میں
 سرعت سے تیرتا ہوا دوسری گاڑی کے کسی حصے میں پیوست
 ہو گیا۔ اسی لمحے میگافون پر ایگل ٹوکی بھاری اور تھکسانہ آواز
 گونجی ”مقابلے کی حماقت مت کرو۔ تم سب محاصرے میں
 ہو۔ ہتھیار چھین کر دونوں ہاتھ سروں سے اوپر اٹھاؤ اور باہر
 نکل آؤ۔ تم کو امان دے دی جائے گی۔“

ایک سفید عمارت کی روشن کھڑکیاں بیک وقت
 تاریک ہو گئیں۔ شاید کسی نے عمارت کا مین سوچ آف کر دیا
 تھا۔

اندھیرا ہوتے ہی عمارت کی چھت اور پہلی منزل سے
 گولیاں اگلنے لگیں۔ اس وقت تک اسٹرائیک فورس نے
 کوئی فائر نہیں کیا تھا۔

”فائرنگ کرو“ اول خان اپریٹس اپنے دہانے کے قریب
 لا کر غرایا ”تمہیں کس کا انتظار ہے؟“

”فائر!“ سفید عمارت سے ہونے والی دھواں دار فائرنگ
 میں کسی کی آواز گونجی اور پھر اسٹرائیک فورس کے ہتھیاروں
 نے بھی آگ لگتی شروع کر دی۔

”مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ لوگ اس طرح مقابلے پر جم

ہو چکی ہوں“ اول خان بولا“ ایسے تصادم کو دو مضبوط گروہوں کا ٹکراؤ سمجھا جاتا ہے۔ جس میں مداخلت کرنے والے بلاوجہ مارے جاتے ہیں۔ پھرے ہوئے درندوں سے ہر ایک دور رہتا ہے۔“

”اگر تم پولیس والوں کی طرف سے اتنے ہی پُر امید ہو تو میری دعا ہے کہ اب انہیں آجانا چاہیے“ میں نے کہا ”فائرنگ اور دھاوا کا سلسلہ موقوف ہو چکا ہے۔“

اسی وقت اپریٹس پر ایگل فور کا پیغام آئے لگا۔ وہ بتا رہا تھا ”میں ایگل نائن کے ساتھ عمارت میں موجود ہوں۔ تین آدمی اپنی رانقلوں کے ساتھ بے ہوش پڑے ہوئے ملے ہیں۔ ہم نے گیس ماسک لگائے ہوئے ہیں لیکن آکسیجن سلنڈر ساتھ نہ ہونے کی وجہ سے زیادہ دیر تک اندر نہیں ٹھہر سکیں گے۔ ہمارے لیے کیا حکم ہے؟ اور۔۔۔!“

”ایگل ون کالنگ!“ اول خان نے فوری طور پر اپنے ٹی تھری اپریٹس کا بٹن دبا کر کہا ”اسوک بم کی کارکردگی دیکھ لینے کے بعد تمہیں زیادہ دیر تک وہاں رکنے کی ضرورت نہیں۔ دشمن کی کرنوٹ چلی ہے۔ تم فوراً باہر نکل آؤ ورنہ تم بھی دھوئیں کا شکار ہو سکتے ہو۔ اور۔۔۔!“

کھانسی کے ساتھ اپریٹس پر ایگل فور کی پھنسی پھنسی آواز آئی ”میں سر! دھواں بہت تیزی سے اثر کر رہا ہے۔ ہمارے لیے یہاں ٹھہرنا دشوار ہو رہا ہے۔ ہم اسی لمحے واپس لوٹ رہے ہیں، اور اینڈ آل!“ اندر والوں کا پیغام مکمل ہوتے ہی اپریٹس پر چند ثانیوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔

”سر! ایگل فور کی حالت خراب معلوم ہوئی ہے“ اپریٹس پر ایگل ٹو کی آواز نے سکوت توڑا ”اجازت ہو تو اندر کمک بھیجی جائے۔ اور۔۔۔“

”تم کمانڈر ہو۔ اپنے فیصلے خود کرو۔ تمہیں میری اجازت کی ضرورت نہیں ہے“ اول خان نے رکھائی سے کہا ”میرا خیال ہے کہ انہیں کسی کمک کی ضرورت نہیں۔ وہ خود باہر آجائیں گے“ اور۔۔۔“

اس بار ایگل ٹو سے پہلے ایگل فور خود لائن پر آگیا ”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر! ہمیں کسی کمک کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔ اور!“ اس نے کھانسی کے بے اختیار جھٹکوں کے درمیان اپنا پیغام پورا کیا۔ دھواں اس پر تیزی سے کام دکھا رہا تھا۔

”تم نے پیغام سن لیا“ اول خان اس بار واضح طور پر ایگل ٹو سے مخاطب تھا ”اب پانچ منٹ انتظار کرو۔ اتنی دیر میں دونوں آدمیوں کو باہر آجانا چاہیے۔ اس کے بعد پوری نفری کے ساتھ اندر گھس جاؤ اور ہر ایک کو بے دست و پا کر کے ایک جگہ لے آؤ۔۔۔ اور اینڈ آل۔۔۔“

اول خان نے اس مہم کی قیادت اپنے جس نائب کو سونپی تھی، اس کی صوابدید قابل تعریف تھی۔ اس نے سفید عمارت سے پہلی گولی چلتے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ راجا کے آدمی آسانی سے ہتھیار ڈالنے والوں میں سے نہیں تھے۔ وہ کنکریٹ کی پختہ اور دو منزلہ عمارت میں محصور تھے جس کی چھت اور پانی کی بلند تنگی ان کے تصرف میں آسکتی تھی جبکہ اسٹرائیک پونٹ کی نفری سڑک پر ان کے کھلے نشانے پر تھی۔ ان لوگوں کو اپنی مضبوط گاڑیوں کی اوٹ میسر تھی یا دوسری طرف کھیل کا وسیع میدان پھیلا ہوا تھا۔

سفید مکان میں رہنے والوں سے لمبا مقابلہ کر کے کوئی کامیابی حاصل کرنے کا تصور ذرا مشکل تھا۔ اس کی ایک ہی صورت ہو سکتی تھی کہ عمارت کی اینٹ سے اینٹ بجادی جائے اور اس دو منزلہ عمارت کو طے کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا جائے۔ وہ کام بھی آسان نہیں تھا۔

اسٹرائیک پونٹ کے کمانڈر نے عمارت پر دھوئیں کے بم فائر کرانے کا فیصلہ کر کے دانش مندی کا ثبوت دیا تھا۔ راجا کے ساتھی دھوئیں میں کچھ نظر نہ آنے کے سبب گھبرا کر باہر نکلنے پر مجبور ہو جاتے یا پھر کثیف دھوئیں میں دم گھٹنے کے سبب اندر ہی بے ہوش ہو جاتے۔

ایس ٹی ایف والوں نے دھوئیں کا صرف ایک بم پھینکنے پر اکتفا نہیں کیا۔ اول خان نے اپریٹس پر انہیں بڑھا دیا اور فضا یکے بعد دیگرے ویسے ہی تین مزید دھاواں سے لرزا تھی۔ نیچے سے اوپر تک وہ عمارت اس بری طرح دھوئیں میں گھری تھی کہ نظری نہیں آ رہی تھی۔ اس افتاد کی وجہ سے ان کی فائرنگ کا سلسلہ بھی موقوف ہو گیا تھا مگر ایس ٹی ایف والوں کے بارودی ہتھیار وقفے وقفے سے آتشیں نئے نئے گنگنا رہے تھے۔

”رات کے سانے میں ہونے والی اس دھواں دھار فائرنگ کی آوازیں دور تک سن گئی ہوں گی“ میں نے بے چینی سے اپنی جگہ پلویدلتے ہوئے کہا ”اب پولیس کسی بھی وقت یہاں پہنچ کر بنا بنایا کھیل بگاڑ دے گی۔“

”پولیس نہیں آئے گی“ اول خان نے وثوق سے کہا ”آگئی تو میں اسے سنبھال لوں گا۔ اس مرحلے پر وہ کام بگاڑنے کے بجائے ہمارے کام آئیں گے۔“

”پولیس کیوں نہیں آئے گی؟“ میں نے پوچھا۔ اس وقت فائرنگ کا سلسلہ تقریباً ختم چکا تھا۔ ایس ٹی ایف والے اپنی ہیبت برقرار رکھنے کے لیے لگاؤ کا فائر کر رہے تھے۔

”بد معاشوں کے اڈوں اور ڈیروں پر ہونے والے تصادم میں پولیس اس وقت آتی ہے جب خون ریزیاں ختم

دونوں تک پہنچ گئے۔

اپنے تین ساتھیوں کی مدد سے وہ گلی کے سرے تک آئے تو اول خان نے انہیں اپنی گاڑی کی طرف بلا لیا۔ ہم دونوں نے گاڑی سے اتر کر ان کا استقبال کیا۔ دونوں کے چہروں پر ہنس مکھ ہوئے تھے۔ اول خان نے پیٹھ تھپک کر انہیں شاباشی دی اور کچھ دیر کے لیے انہیں اپنی گاڑی کے ایرکنڈیشنر کے سامنے بیٹھنے کا مشورہ دے کر رخصت کر دیا۔

اسی لمحے ایرٹیس پر ایگل فائیو کی بھرائی ہوئی آواز گونجنے لگی۔ وہ اپنے ساتھیوں کو ایگل فور اور ٹائٹن کی واپسی کی خوش خبری سنا رہا تھا۔

سنائے میں اچانک اسٹرائیک پونٹ کی ایک گاڑی انجن کی بھاری آواز گونجنے لگی۔ گاڑی کا ایرکنڈیشنر چلانے کے لیے انجن اشارت کرنا ضروری تھا غالباً اس طرف موجود گاڑی کے عملے نے اپنے ساتھیوں کی ابتدائی طبی امداد کے لیے اول خان کے مشورے پر عمل کرنا شروع کر دیا تھا۔ ”کچھ دیر پہلے تم پولیس والوں کی آمد کی دعائیں کر رہے تھے؟“ درمیان میں دوسرے مسائل آجانے کے باوجود اول

”پانچ منٹ ناکافی ہیں“ میں نے اسے مشورہ دیا ”اندر جانے والے دھوئیں کا شکار ہو جائیں گے۔“

”اس کثیف دھوئیں کے اثرات صرف دس منٹ تک برقرار رہتے ہیں اور پھر یہ تیزی سے فضا میں تحلیل ہوتا چلا جاتا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ پانچ منٹ بعد وہ اندر جاسیں گے تو دھوئیں کے مضر اثرات بڑی حد تک زائل ہو چکے ہوں گے۔“

”کیا یہ کسی قسم کا زہر ہلا دھواں ہے؟“ میں نے تجسس سے پوچھا۔

”زہریلے کے بجائے تم اسے اعصاب شکن دھواں کہہ سکتے ہو“ اول خان نے بتایا ”یہ تنفس کی نالیوں کے ذریعے محض ایک سے ڈیڑھ منٹ میں اپنے شکار کے اعصاب مفلوج کر کے اسے بے ہوش کر دیتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اب اندر کوئی مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہا ہو گا۔ کافی دیر سے ان کی طرف سے کوئی گولی نہیں چلائی گئی اس لیے میں اطمینان سے تمہارے ساتھ بیٹھا ہوا ہوں۔ ان کی طرف سے فائرنگ کا آغاز ہونے پر میں گھبرا گیا تھا۔“

”یہ پہلا مقابلہ ہے جس میں ہم ابھی تک گاڑی سے اترے نہ ہم نے کوئی گولی چلائی اور قصہ ختم ہوتا نظر آ رہا ہے“ ایمان داری کی بات یہ ہے کہ اس وقت مجھے بھی اپنا ذہن ہر قسم کے دباؤ سے آزاد محسوس ہوا تھا ورنہ پہلے میں بھی فکر مند تھا۔

اول خان کی جیب اس وقت بھی سفید عمارت کی بگلی سڑک پر ایسی جگہ کھڑی ہوئی تھی جہاں سے ہم عقبی گلی کی گنگرائی کر سکتے تھے۔ اول خان کے دونوں آدمیوں کے انتظار میں میری نظریں بار بار اسی گلی کی طرف اٹھ رہی تھیں۔

جس وقت سفید عمارت گاڑھے اور سیاہ دھوئیں کی لپیٹ میں آئی تھی تو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کالے دھوئیں کے وہ زہنی بادل گھنٹوں تک وہیں گھبرے رہیں گے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دھواں تحلیل ہوتا جا رہا تھا۔ اس میں سے کہیں کہیں عمارت کے خدوخال جھانکنے لگے تھے۔

خدا خدا کر کے سفید مکان کے احاطے کی پچھلی دیوار سے یکے بعد دیگرے دو تاریک ترانسانی ہوئے تنگ و تاریک گلی میں کودے۔ ان کی حالت ابتر تھی اور وہ دہرے ہو کر لڑکھڑاتے ہوئے ہماری طرف آرہے تھے۔ یہ غنیمت تھا کہ وہ اس وقت بھی اپنے قدموں پر چلنے کے قابل تھے۔

میں ان کی مدد کے بارے میں سوچتا رہ گیا۔ اندھیرے میں اچانک کہیں سے تین افراد نکلے اور دوڑتے ہوئے ان

رشتوں کے مسئلہ کا مکمل حل

پیشہ ور لوگوں اور اداروں میں اپنی دولت کو ضائع کرنے کی بجائے بین الاقوامی سطح پر اپنے پیغامات شائع کرائیں اور فوری نتائج حاصل کریں اندرون ملک اور بیرون ملک مقیم پاکستانی اور غیر پاکستانی خواتین و حضرات کے رشتے حاصل کریں اور اپنے پیغامات روزنامہ ڈاٹ کام میں شائع کرائیں یا آپ اپنے معیار کے مطابق رشتے گھر بیٹھے حاصل کریں۔ رشتوں کی لسٹ بذریعہ ڈاک روانہ کر دی جاتی ہے۔ آپ کا نام، تصویر، گھر کا پتہ ٹیلی فون نمبر اگر آپ چاہیں تو شائع کر دیا جاتا ہے۔ یا روزنامہ ڈاٹ کام کی معرفت اپنی میل وصول فرمائیں۔

www.ROZNAWA.com

Call: 0303-6502293

خان کو میری بات یاد تھی۔

”وہ آگے تو تمہارے آدمیوں کا کام آسان ہو جائے گا ورنہ میراں سے قیدیوں کی لمبی کھپ لے جانی ہوگی“ میں نے کہا۔

”میں تمہاری بات نہیں سمجھ سکا۔ تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟“ اول خان نے الجھ کر پوچھا۔

”سیدھی سی بات ہے“ میں نے جواب دیا ”تم سمیت کوئی بھی راجا کو نہیں پہچانتا اس لیے سارے بے ہوش قیدیوں کو اسٹیشن فور لے جانا ہوگا۔ پولیس والے آگے تو وہ راجا کی نشاندہی کر دیں گے اور تمہارے آدمی بے مقصد محنت سے بچ جائیں گے۔“

اس وقت اپریٹس مصروف ہو چکا تھا۔ ایگل ٹو اپنے بقیہ ساتھیوں کو اندر گھسنے کے بارے میں فردا فردا ہدایات دے رہا تھا۔ اندر سے ہو کر واپس آنے والے دونوں آدمیوں کو اس نے باہر روک کر گاڑیوں کی نگرانی کی آسان ذمہ داری سونپی تھی۔

فازنگ کا شور تھے کچھ دیر ہو چکی تھی اس لیے قرب

وجہ کے مکانوں میں زندگی کے آثار پیدا ہونے لگے تھے۔ ہر شخص یہ جاننے کے لیے مضطرب ہو گا کہ راجا کے اڈے پر کیا ہوا تھا اور اس وقت کیا ہو رہا تھا۔ ان لوگوں کو ایک باریہ یقین ہو جاتا کہ باہر نکلنے میں ان کی جانوں کو کوئی خطرہ نہیں تھا تو وہ ایک ایک کر کے گھروں سے باہر نکلنا شروع کر دیتے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس گنجان آبادی میں ایسا جم غفیر جمع ہو جاتا کہ اسے سنبھالنا اور سکون سے اپنا کام جاری رکھنا دشوار ہو جاتا۔

میں نے اول خان کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے پستول سے ایک ہوائی فائر کر دے اور وقفے وقفے سے ایسا ہی کرتا رہے تاکہ کوئی اپنے گھر سے باہر نکلنے کی ہمت نہ کر سکے۔ اول خان نے ایک لمحے کے لیے میرے مشورے کی افادیت پر غور کیا اور پھر گھڑکی سے داہنا ہاتھ باہر نکال کر آسمان کی طرف فائر کر دیا۔

فائر ہوتے ہی آس پاس کے مکانوں سے آنے والی آوازیں دم توڑ گئیں۔ یوں معلوم ہوا جیسے سب کو یکایک سانپ سونگھ گیا ہو۔

”تم بدترین لمحات میں بھی معمولی باتوں کو نظر انداز نہیں کرتے“ فائر کرنے کے بعد اول خان نے ہنستے ہوئے کہا ”مگر اس وقت ایک اہم بات بھول رہے ہو۔“

مجھے کبھی اپنی کارکردگی پر ناز نہیں رہا تھا پھر بھی مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اس وقت مجھ سے کوئی چوک ہوئی تھی۔

میں نے کہا ”میں بھول رہا ہوں تو تم یاد دلادو۔“

”ہمیں صرف راجا کی تلاش نہیں ہے، ہمارا اصل شکار جوشی ہے اور ہم ان دونوں کو نہیں پہچانتے۔ راجا کی نشاندہی پولیس کر سکتی ہے۔ جوشی کو کون پہچانے گا؟“

”دیرانے بھی اسے برسوں پہلے دیکھا تھا۔ خیر یہ کوئی ایسا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ راجا کا کوئی کمزور آدمی تھوڑے سے تشدد کے بعد یہ بھی بتا دے گا۔“

”شناخت ہو جائے گی۔ اس کے گھر کا کوئی فرد اگر اسے پہچان سکتا ہے۔ میں صرف یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ راجا پر کھیل ختم نہیں ہوگا۔“

اس کی بات درست تھی۔ دہلی میں اٹل بسواس تک رسائی کے مقصد سے شروع ہونے والا کھیل دھیرے دھیرے طویل پکڑتا جا رہا تھا۔ اٹل سے زریٹھ، چندن گرنانی اور چوڑا سے ہوتے ہوئے ہم جوشی اور راجا تک پہنچ چکے تھے لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کھیل کی آخری کڑی کب ٹوٹے گی۔

”ایک طرف را والوں کی وہ مضبوط صف آرٹی تھی تو دوسری طرف ان کے امریکی حلیف بھی ان کے شانہ بشانہ چل رہے تھے۔ دہلی میں اٹل اور زریٹھ سے پہلے جان امتحان مارا گیا۔ جان ایٹکوف کراچی سے ڈر کر بھاگ گیا۔ لیری پر دہشت سے جان لیوا ہارٹ انیک ہو گیا۔ ان کا منظر نامہ اس وقت خالی تھا۔ دیکھنا یہ تھا کہ ان کی طرف سے کون سا نیا مہرہ ہمارے سامنے آتا ہے۔“

ایگل ٹو کا دیا ہوا وقت پورا ہو چکا تھا۔ اسٹرائیک فورس کے دس میں سے آٹھ آدمی بیگ وقت تین سمتوں سے سفید مکان کے احاطے کی طرف بڑھے اور ماہرانہ پھرتی کے ساتھ دیواریں عبور کر کے اندر کود گئے۔ ان میں سے دو افراد باہر رہ گئے تھے۔

وہ دونوں اپنے نظام تحفظ پر دھونیں کے اثرات سے اس حد تک گلو خلاصی حاصل کر چکے تھے کہ انہیں انٹرکنڈیشنز کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ گاڑی کا انجن بند کر کے اپنی سب مشین گئیں تاکہ ایسی جگہوں پر پوزیشن لے چکے تھے جہاں سے سفید مکان کی تینوں سمتوں پر نظر رکھ سکیں۔

اول خان نے ایک مرتبہ پھر گھڑکی سے اپنا ہاتھ باہر نکالا اور دوسرا ہوائی فائر کر دیا۔ اس کے آدمیوں کو پہلے فائر کے ساتھ ہی اس کے ارادے کا اندازہ ہو چکا تھا۔ اس لیے اس بار بھی کہیں سے کوئی رد عمل سامنے نہیں آیا۔ یہ ضرور ہوا کہ فاز کی دم توڑتی ہوئی گوج میں یکایک سازن کی آواز سنائی دینے لگی۔

مجھے اپنے کانوں پر زیادہ زور دینے کی ضرورت نہیں پڑی۔

کیونکہ وہ آوازیں تیزی سے قریب آتی جا رہی تھیں۔ وہ یقینی طور پر دو سائزن تھے یا پھر کسی ایک گاڑی پر دو سائزن بیٹھ رہے تھے۔ مجھے اول خان کی کسی ہوئی بات یاد آگئی کہ پولیس والے غیر ضروری جانی نقصان سے بچنے کے لیے ہمیں بھی اندھا دھند مداخلت نہیں کرتے۔ موقع مل جائے تو کسی نہ کسی طرح اپنے حریف کو کسی طرح یا خبر ضرور کر دیتے ہیں کہ آنے والے لمحوں میں اس کا قانون کے محافظوں سے ٹکراؤ ہونے والا ہے۔ جن مجرموں کے دل میں قانون کا ذرا بھی خوف ہوتا ہے۔ وہ میدان چھوڑ کر فرار کی راہ اختیار کر لیتے ہیں اور اگر پولیس کے نرسے میں آجائیں تو مقابلہ کیے بغیر ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔

سعد آباد کے اس سفید مکان میں یقینی طور پر مجرموں کی ایک جمعیت بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔ ان میں سے کوئی پولیس سے مقابلے یا فرار کی راہ اختیار کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ لے دے کروہاں اسپیشل ٹاسک فورس کا راج تھا جو خود قانون کے خفیہ محافظ کے درجے پر فائز تھی۔

اس وقت تک سفید عمارت کے گرد پھیلے ہوئے سیاہ دھوئیں کے بادل تحلیل ہو چکے تھے۔ اول خان کی جتنی رائے تھی کہ دھوئیں کا سیاہ بادل چھٹ جانے کے بعد وہ عمارت داخلے کے لیے محفوظ تھی۔ دم گھٹنے کے کسی خطرے کے بغیر اندر وقت گزارا جاسکتا تھا۔

”کیوں نہ ہم اندر چلیں“ میں نے تجویز پیش کی۔
”میں خود بھی یہی سوچ رہا تھا لیکن چند منٹ توقف کرو۔ اگر کوئی پولیس پارٹی ادھر آ رہی تھی تو مجھ ہی کو ان سے بات کرنی پڑے گی“ اول خان نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ اس کا پیش کیا ہوا عذر معقول تھا۔ میں نے خاموشی اختیار کر لی۔

”سر! ہم اندر داخل ہو چکے ہیں“ اپریش پر ایگل ٹوکی آواز آنے لگی ”اس پہلے کمرے میں ایک آدمی بے ہوش پڑا ہوا ہے۔ ہم اس کے ہاتھ پیر باندھ کر آگے بڑھیں گے۔ میں جیسے جیسے کوئی نئی چیز دیکھوں گا، آپ کو رپورٹ دیتا رہوں گا۔ اور!“

”میں منتظر رہوں گا۔ اور اینڈ آل!“ اول خان نے مختصر سا جواب دے کر اپریش وٹس بورڈ میں ڈال دیا۔ سائزن کی آوازیں اس قدر قریب آچکی تھیں کہ ان سے وحشت ہو رہی تھی۔ ہم دونوں گاڑی سے اتر کر شلتے ہوئے بغلی گلی سے میدان کے متوازی دوڑتی ہوئی سڑک پر نکل آئے۔ سڑک پر دور سے دو گاڑیوں کے ہیڈ لیمپس اور کمبین

چند لمحوں میں وہ دونوں پولیس موبائلز، اسٹرائیک یونٹ کی تیسری گاڑی کے پیچھے رگ گئیں اور متعدد مسلح سپاہی پچھلے حصوں سے واندن سڑک پر کود گئے۔ ان میں سے کوئی بھی غیر مسلح نہیں تھا۔ ان کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ ذرا سا شبہ ہونے پر کہیں بھی فائر جھونک ماریں گے۔

میں نے پہلی ہی نظریں یہ بھانپ لیا کہ موبائلز کی اگلی نشستوں سے اترنے والے افسروں میں سب انسپکٹر کے عہدے سے بڑا کوئی افسر نہیں تھا۔ میرے اور اول خان کے اطمینان نے انہیں تذبذب میں ڈال دیا تھا۔ ان کے ہاتھ بیلٹ ہولسز تک گئے مگر وہیں جم کر رہ گئے۔ اسٹرائیک یونٹ کی منفرد ساخت کی بکتر بند گاڑی نے بھی پولیس والوں کو ہم سے مرعوب کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

”تم لوگ کون ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو؟“ ایک سب انسپکٹر نے اپنی جگہ چھوڑے بغیر دنگ لہجے میں پوچھا۔

اول خان نے داہنا ہاتھ فضا میں بلند کر کے کہا ”ہم قانون کے نام پر یہاں آئے ہیں۔ تم قریب آؤ تو میں تم کو اپنی شناخت دکھا سکتا ہوں۔“

اول خان کی پیشکش پر وہ گڑبڑا گیا۔ اس نے بوکھلائے ہوئے انداز میں اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا پھر یکایک ہولشہرے ریوالور نکال کر ہم دونوں پر تان لیا ”پنہ ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔ اگر تم درست ثابت ہوئے تو میں تم سے معافی مانگ لوں گا۔“

اول خان نے بلا تردد اس کی ہدایت کی تعمیل کی۔ میں نے بھی اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔

وہ ہماری طرف سے بہت چوکنا تھا۔ اس کے ساتھیوں نے بھی اپنے پستول اور ریوالور نکال لیے تھے لیکن وہ اس قدر اچھے ہوئے تھے کہ ان میں سے کسی نے ہم پر ہتھیار تاننے کی ہمت نہیں کی تھی۔ اس وقت ہماری خود اعتمادی ہماری بے گناہی کا سب سے بڑا ثبوت تھی۔

وہ سب انسپکٹر سنہیل سنہیل کر ہماری طرف بڑھنے لگا۔ جب ہمارا اور اس کا درمیانی فاصلہ چند قدم رہ گیا تو اول خان کے ہونٹوں سے سرسراہٹ ہوئی دھیمی آواز نکلی ”ہم دونوں اسپیشل ٹاسک فورس کے آدمی ہیں۔“

رپورٹ سنا دی تھی اور بندھے ہوئے مجرموں کو ایک جا کرنے میں مصروف ہو گیا تھا۔

دروازے سے چند قدم کے فاصلے پر اسرائیک یونٹ کا ایک مسلح کمانڈو مستعدی سے کھڑا ہوا تھا۔ اول خان کی موجودگی میں اس کی طرف سے کسی تعرض کی گنجائش نہیں تھی۔ اندرونی کمروں سے متعدد افراد کے بولنے اور چلنے پھرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ مجرموں کو زہریلے دھوئیں کے اثر میں لاکر بے ہوش کیا جا چکا تھا اس لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ وہ آوازیں اسرائیک یونٹ کے کمانڈوز کی تھیں۔ ایگل ٹوکو کسی طرح اطلاع مل گئی کہ اول خان کچھ پولیس افسران کے ساتھ اندر داخل ہو چکا تھا۔ اس نے راستے میں ہی ہم لوگوں کا استقبال کیا اور بتایا کہ عمارت کی چٹلی اور اوپری منزل سے کل آٹھ بے ہوش افراد پکڑے گئے تھے۔ ان سب کے ہتھیار اور میگزین ان کے قریب سے ملے تھے۔ ان میں سے ایک قیدی کا داہنا شانہ بہت بری طرح زخمی تھا۔ درد کی شدت کی وجہ سے وہ زخمی بے ہوشی کی حالت میں بھی رہ رہ کر کرا رہا تھا۔

ایگل ٹو نے سب سے زیادہ سنسنی خیز خبر یہ سنائی کہ اوپر کے ایک کمرے میں ایک لاش ملی تھی۔ اس کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے۔ اس کے دہانے میں ہتھیار کی نال ڈال کر کھوپڑی کی طرف اس طرح فائر کیا گیا تھا کہ چکراتی ہوئی گولی اپنے ساتھ پورا ہتھیار نکال لے گئی تھی۔ متوفی کے زخم سے رواں تازہ خون سے پتا چل رہا تھا کہ اس کے قتل کو زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ میرے لیے وہ اس مہم کی سب سے اہم خبر تھی۔

مجھے پورا یقین تھا کہ ایگل ٹوک کی دریافت کی ہوئی لاش جوشی کی ہوگی۔ اس رات راجا کے ہاتھوں وہی قتل ہو سکتا تھا۔ راجا چوڑا کے اشاروں پر چل رہا تھا۔ چوڑا کی پوری کوشش تھی کہ جوشی کو اس کے دشمنوں کی دسترس سے دور رکھا جائے۔ حالات و واقعات کی بنا پر اس نے سمجھ لیا تھا کہ جس طرح وہ جوشی کے ذریعے ویرا اور پھر ڈینی تک پہنچنا چاہ رہا تھا بالکل اسی طرح ویرا جوشی کو اپنا آلہ کار بنا کر چوڑا کا کام تمام کرنا چاہ رہی تھی۔

راجا کے آدمیوں نے اول خان اور اس کے ساتھی کو کسی قیمت پر جوشی کے گھر تک نہیں پہنچنے دیا۔ درمیان میں ذرا سی مملت ملنے ہی وہ جوشی کو زبردستی اٹھا لائے۔ متوفی کے بندھے ہوئے ہاتھ پیر اس بات کے گواہ تھے کہ وہ اپنی مرضی سے سعید آباد کے اس مکان میں نہیں پہنچا تھا۔

ایس ٹی ایف کا نام اس سب انسپکٹر کے لیے نیا نہیں تھا۔ اول خان کا انکشاف سن کر اس کے ہاتھ یوں لرزے کہ ریو اور اس کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچا۔ اس نے مزید کوئی شناخت دیکھنے کا انتظار کیے بغیر ریو اور ہولسٹر میں اڑسا اور ایدیاں بجا کر سیلوٹ کر ڈالا۔

اول خان نے خفیہ سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنے ہاتھ گرا لیے۔ وہ اپنی جیب میں سے کچھ نکالتا ہوا آگے بڑھا۔ اس نے کوئی چیز سب انسپکٹر کے سامنے پیش کی۔ اول خان کی پشت میری طرف تھی۔ میں یہ نہ دیکھ سکا کہ وہ کیا چیز دکھا رہا تھا۔ اس بار سب انسپکٹر نے دوبارہ اسے سیلوٹ پیش کر دیا۔ اس سینئر سب انسپکٹر کا نام زاہد تھا۔ باضابطہ شناخت کے بعد وہ اول خان کے سامنے بچھا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھی اور سپاہی دوستانہ انداز میں ہمارے گرد مٹ آئے تھے۔

”اس عمارت سے ہم پر دھواں دھار گولیاں برسائی گئی ہیں۔“ اول خان نے دو منزلہ سفید گھر کی طرف اشارہ کر کے ان کو بتایا ”ہم راجا اور جوشی نام کے ایک مغوی کی تلاش میں یہاں آئے تھے۔ انہوں نے ہماری گاڑیاں دیکھتے ہی فائر کھول دیا۔ انہیں دھوئیں کے بم فائر کر کے زیر کیا گیا ہے۔ میرے آدمی اندر گئے ہوئے ہیں۔“

میں اول خان کے ساتھ بہت سی مہمات میں شریک رہا تھا۔ کئی بار اس نے پولیس والوں کو اپنی شناخت کرائی تھی مگر میں کبھی یہ نہ دیکھ سکا کہ وہ اپنی مشکل ترین شناخت کے لیے کیا شعبہ استعمال کرتا تھا۔ یہ حیرت کی بات تھی کہ وہ ایک غیر تحریری اور ماورائے آئین فورس کا مقامی کمانڈر ہوتے ہوئے ایسی مستند شناخت کا حامل تھا جسے کوئی ذمہ دار افسر مسترد کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔

اول خان نے اس بارے میں مجھے کبھی کچھ نہیں بتایا۔ میں نے بھی اس سے کچھ پوچھنا مناسب نہیں سمجھا لیکن میرے دل میں اس بارے میں گہرا تجسس جاگزیں تھا جو اس موقع پر دور رہنے کے بجائے مزید گہرا ہو گیا تھا۔

جب انسپکٹر زاہد کی ہدایت پر پولیس والوں کی نفری اس گھر کے گرد پھیل گئی۔ زاہد ہمیں اپنے دو ماتحتوں کے ساتھ لے کر گھر کے محلے ہوئے دروازے میں داخل ہو گیا۔ اس کے دونوں ماتحت عمدے میں اے ایس آئی اور ہیڈ کانسٹیبل تھے۔

اندر جانے سے پہلے میں اول خان کے ایمار اس کی گاڑی میں سپرٹریٹس نکال لایا تھا جو خاموش تھا۔ شاید ایگل ٹو نے ہماری عیصر حاضری میں مجرموں کے بارے میں اپنی مکمل

کسی وجہ سے جوشی اس قدر اہم تھا کہ چوڑا ہر قیمت پر اسے زندہ رکھنا چاہتا تھا ورنہ کوئی بھی شخص نہایت بے خوفی سے جوشی کو اس کے گھر میں مار سکتا تھا۔ وہ لوگ اسے اٹھا کر سعد آباد لے آئے۔ وہاں ہمارے حملے کے بعد راجا کو اوراک ہو گیا کہ جوشی کا معاملہ اس کی توقع سے زیادہ سنگین ہے۔ اس کے پیچھے لگے ہوئے لوگ آسانی سے جان نہیں چھوڑیں گے۔ جب اس کے آدمی اسٹرائیک یونٹ کے ساتھ فائرنگ کا تبادلہ کر رہے تھے تو وہ یہ خطرہ بھانپ گیا کہ جوشی کسی بھی وقت اس کی گرفت سے نکل جائے گا۔ اسے ہماری تحویل سے بچانے کے لیے اس نے جوشی کو راہ سے ہٹانے کا ارادہ کیا اور اس کے حلق سے کھوپڑی میں گولی اتار دی۔ جوشی کے معاملے میں ہماری بھاگ دوڑ رانگلاں گئی تھی۔ ہمارے حریف بیشک کے لیے اس کا منہ بند کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

راجا کے ہاتھوں جوشی کی موت کا یقین ہو جانے کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا کہ راجا کے لیے زندگی ایسی جہنم بنا دی جائے کہ وہ گڑگڑا کر اپنی موت کی دعائیں مانگتا رہے لیکن اس کی زندگی کا سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتا چلا جائے۔

اس کا یہ جرم ناقابل معافی تھا کہ وہ رقم کے لالچ میں را والوں کے ہاتھ بکا ہوا تھا۔ چند سکیوں کے لیے اس نے اپنی لگام چوڑا کے ہاتھوں میں دے دی تھی۔

میرا ذہن تیزی کے ساتھ کام کرتا رہا۔ اس دوران میں ایگل ٹو ہمیں اس کمرے میں لے گیا جہاں آٹھوں بے ہوش قیدی بندھے ہوئے پڑے تھے۔ زاہد نے ان قیدیوں پر پہلی نظر ڈالتے ہی مایوسی سے اعلان کر دیا کہ ان میں راجا شامل نہیں تھا۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے سب انسپکٹر زاہد کا وہ انکشاف کسی گھونے کی طرح میرے سینے پر پڑا ہو۔

”ان میں اس کے سارے خاص آدمی موجود ہیں۔“ زاہد نے قیدیوں کا قریب سے جائزہ لیتے ہوئے کہا ”مجھے حیرت ہے کہ اس کے باوجود وہ غائب ہے۔ ان میں کم از کم تین آدمی ایسے ہیں جو سائے کی طرح ہر وقت اس کے ساتھ رہتے ہیں۔“

”پھر وہ کہاں گیا؟“ اول خان نے گھمبیر لہجے میں سوال کیا۔

”مجھے شبہ ہے کہ ابتدا میں وہ ہمیں تھا۔ اسی کی ہدایت پر تم لوگوں پر فائرنگ شروع ہوئی۔“ زاہد نے پر خیال انداز میں اپنا نظریہ پیش کرنا شروع کیا ”کسی مرحلے پر اس کو اندازہ ہو گیا

کہ اس کے آدمی زیادہ دیر تک جم کر نہیں لڑ سکیں گے۔ وہ انہیں مقابلے میں مصروف چھوڑ کر خاموشی سے فرار ہو گیا۔“

”مگر کہاں اور کیسے؟“ اول خان نے اپنے ہاتھ پر ہاتھ مار کر پوچھا ”باہر ہم موجود تھے۔ یہاں سے چڑیا کا بچہ بھی باہر نہیں گیا۔“

”تم نے مکان کو تین اطراف سے گھیرا ہوا تھا۔“ زاہد نے قتل سے جواب دیا ”چوتھی سمت میں مکانوں کا سلسلہ ہے۔ وہ دیواریں پھیلا لٹکتا ہوا“ اندر ہی اندر کہیں نکل گیا ہو گا۔ فضا زبردست فائرنگ سے لرز رہی تھی۔ علاقے کی پوری آبادی کونوں کھدروں میں دبکی، خوف سے کانپ رہی ہوگی۔ کسی کو ہوش نہیں ہو گا کہ راجا کس کس کے مکان سے ہوتا ہوا فرار ہوا ہے۔ یہ بات مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ اس گھر میں یہ خانہ ہے نہ کوئی خفیہ راستہ۔ بھاگنے کے لیے اس نے پڑوس کے گھروں کی راہ اختیار کی ہوگی۔“

”وہ لاش کہاں ہے؟“ اول خان نے ایگل ٹو سے پوچھا پھر خود کلامی کے انداز میں بولا ”وہ لاش راجا کی بھی ہو سکتی ہے۔“

اول خان کے ذہن پر امید کا راج تھا۔ میں نے اس کی خوش گمانی دور کرنے کی کوشش نہیں کی۔ لاش دیکھتی ہی زاہد چچ کا انکشاف کر سکتا تھا۔

اس بار اسٹرائیک یونٹ کے اراکین وہیں رکے رہے۔ زاہد نے بھی اپنے ہاتھوں کو وہیں رکنے اور قیدیوں کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے کا حکم دیا اور ہم تینوں ایگل ٹو کے ساتھ زبوں کی طرف چل دیے۔

”لاش کی حالت بہت خراب ہے۔“ ایگل ٹو نے راستے میں ہمیں آگاہ کیا ”کھوپڑی کا بیشتر حصہ اڑا ہوا ہے۔ بھیجا چھت پر چپکا ہوا ہے۔“

کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شاید تینوں اپنی اپنی جگہ کچھ سوچ رہے تھے۔

پہلی منزل کا وہ کراواقی کوئی قید خانہ نظر آرہا تھا۔ وہاں برہنہ فرش پر پڑی ہوئی لاش کی حالت عبرت ناک تھی۔ عام آدمی کے لیے اسے نگاہ بھر کر دیکھنا محال تھا۔ پٹھا ہوا دانہ بڑا ہوا تھا۔ پیشانی موجود تھی مگر سر کا پچھلا حصہ گولی کے ساتھ اڑ کر چھت سے لو تھڑوں کی شکل میں چپک گیا تھا۔ میں نے جبکہ کر زخم پر نگاہ ڈالی تو وہ ہر لحاظ سے نازہ تھا۔ زخم پر تھے ہوئے خون کے لو تھڑوں کی سرفی، سیاہی میں تبدیل ہوتا شروع نہیں ہوئی تھی۔

”کرو۔“

”اس میں وقت لگے گا۔“ زاہد نے اپنی مجبوری بیان کی
”معاملہ قتل کا ہے۔ جب تک ڈی ایس بی وغیرہ لاش کا معائنہ
نہ کر لیں ہم یہاں کی کسی چیز کو نہیں ہٹا سکتے۔“
اول خان نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا اور زاہد کے
ساتھ باہر چل دیا۔

زاہد نے قیدیوں پر محنت کرنے کا وعدہ دہرا کر ہمیں بہت
تپاک سے رخصت کیا۔ اسٹرائیک یونٹ کا اسکو ڈاول خان
کی ہدایت پر تیزی سے اسٹیشن فور کی طرف روانہ ہو گیا۔
اول خان کی گاڑی خاصہ فاصلے سے ان کے پیچھے تھی۔
صبح کے ساڑھے چار بج چکے تھے۔ فضا میں نسیم بحری
کے جھونکے تیر رہے تھے۔ کہیں کہیں سے پرندوں کے
چھپھانے کی آوازیں بھی آرہی تھیں مگر آسمان پر بدستورات
کی گہری سیاہی کا راج تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ ہم اجالا ہونے
سے پہلے گھر واپس پہنچ جائیں گے۔
”وقت کچھ برا لگیا ہے۔“ راستے میں اول خان مضطرب
آواز میں بڑبڑایا ”ہر طرف سے مسلسل ناکامیوں کا منہ دیکھنا
پڑ رہا ہے۔“

”کبھی کبھی ایسا ہوتا رہتا ہے۔ جب مسلسل کامیابیاں
حاصل ہو رہی ہوں تو ہم یہ نہیں سوچتے کہ ایسا کیوں ہو رہا
ہے۔“

”بات توقعات کی ہوتی ہے۔ تم اٹل کو بہت مشکل شکار
سمجھ کر بھارت کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ اسے آسانی سے
مار کر تم کو بچی دلی خوشی حاصل ہوئی ہوگی۔ میں جوشی اور راجا
کو کسی گمنامی میں نہیں سمجھ رہا تھا لیکن دونوں ہمیں چونا لگا
گئے۔ قلق صرف اس بات کا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”میں محسوس کر رہا تھا کہ راجا کے فرار کی خبر پاتے ہی تم
اچانک بد دل ہو گئے تھے ورنہ میں مزید کچھ وقت وہاں گزارنا
چاہ رہا تھا۔ پولیس والوں کے ساتھ چھان بین میں شامل ہو کر
ہم بہت سی نئی باتیں معلوم کر سکتے تھے جن سے آئندہ مدد مل
سکتی تھی۔“

”سب بیکار تھا۔ ہم تفتیش چلانے اور مقدمے والے
لوگ نہیں ہیں۔ اصل بات یہ تھی کہ راجا اپنے گھر کی حدود
میں نہیں تھا۔ وہ کہاں سے اور کیسے نکل بھاگا؟ یہ جاننے سے
ہمارے لیے کوئی فرق نہیں پڑ سکتا تھا۔ اپنی ناکامی پر میں واقعی
بد دل ہو گیا تھا۔“

”مجھے امید نہیں تھی کہ راجا اس قدر چلاک ثابت
ہوگا۔“ میں نے اعتراف کیا ”تمہاری طرح میں بھی یہی سوچ

”مجھے افسوس ہے۔ یہ راجا نہیں ہے۔“ زاہد نے
مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا ”میں اسے نہیں جانتا۔ آٹھوں
زندہ قیدیوں سے میں کسی نہ کسی حد تک واقف ہوں۔“
”ہمارا کام ادھورا رہ گیا۔“ اول خان نے متاسفانہ لہجے
میں مجھ سے کہا ”تمہاری داستان میں یہ لاش کسی کی ہو سکتی
ہے؟“ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے مایوسی کے غلبے کی وجہ سے
اس کا دماغ ماؤف ہو گیا ہو۔

”اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے ہیں۔ پیر بھی
باندھے ہوئے ہیں۔ یہ جوشی ہو سکتا ہے۔“
”اگر تم مجھے اس لاش کے بارے میں کچھ بتا سکو تو میرا
کام آسان ہو جائے گا۔“ زاہد نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔
”اگر میرا اندازہ درست ہے تو یہ بمبئی بازار میں رہتا
تھا۔ اس علاقے کے تھانے سے تمہیں پوری تفصیل مل
جائے گی۔“ میں نے جواب دیا۔

”ساری محنت کا ارت گئی۔ اسے قتل کر دیا گیا اور راجا
بھاگ گیا۔“ اول خان نے مایوسی سے کہا ”اب یہ سیدھا
سادا تمہارا کیس ہے۔“

”اس میں ایس بی ایف کا ذکر نہیں آئے گا۔“ زاہد نے
اس سے تائید چاہی۔
”ہرگز نہیں۔“ اول خان نے سختی سے کہا ”تمہارا یہ
سوال غیر ضروری ہے۔ خیالی چیزوں کا کسی ریکارڈ میں ذکر
نہیں آتا۔“

”سوری سر! میں پوری بات سمجھ گیا۔ اپنے افسران بالا
کو بھی سمجھا دوں گا۔“ زاہد نے مستعدی سے کہا۔
”تم ان قیدیوں کو جانتے ہو۔ ان کی زبانیں کھلو۔
ہمیں علم ہونا چاہیے کہ راجا کہاں ہے۔“ میں نے زاہد کو
تلقین کی۔

”تم بے فکر رہو۔ راجا اس علاقے کا سب سے مضبوط
بد معاش ہے۔ کسی طرح گرفت میں نہیں آتا تھا۔ اب اس
کے آدمیوں پر ہاتھ پڑ گیا ہے تو میں ان سے کھایا پیا تک
اگلاؤں گا۔ اگلے چوبیس گھنٹوں میں یہ طوطوں کی طرح
بولنے لگیں گے۔“

ہم نیچے پہنچے تو قیدیوں کو ہوش میں لانے کی کوششیں
جاری تھیں لیکن ان کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا۔
”یہ دو گھنٹے سے پہلے ہوش میں نہیں آئیں گے۔ ان
کے اعصاب ماؤف ہیں۔“ اول خان نے پولیس والوں کو
مشورہ دیا ”یہ آٹھوں سرکاری مہمان خانے میں جا کر ہی
آنکھیں کھولیں گے۔ انہیں یہاں سے لے جانے کی تیار

رہا تھا کہ ہم اچانک اسے گھیریں گے اور کسی خوف زدہ چوہے کی طرح پکڑ کر اسٹیشن فورے لے جائیں گے۔ وہاں مار مار کر اس سے سب کچھ اگلا لیا جائے گا۔“

”عام دادا گراور بد معاش اتنے چالاک نہیں ہوتے۔“
اول خان نے سڑک سے اپنی نظریں ہٹائے بغیر پُر خیال آواز میں کہا ”وہ قانون کے محافظوں میں چھپی ہوئی کالی بھینٹوں کی ملی بھگت سے اپنے دھندے چلاتے ہیں اور گردو پیش سے بہت زیادہ باخبر نہیں ہوتے۔ برا وقت آنے والا ہوتا ہے تو تنخواہ دار مخبر انہیں پہلے سے ہوشیار کر دیتے ہیں اور وہ بروقت زیر زمین چلے جاتے ہیں۔ اچانک کوئی ناگہانی افتاد سر پر آن پڑے تو قانون کو لٹکارے بغیر ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ راجا کا معاملہ ہی مختلف نکلا۔“

”اس کے طور طریقے بڑے گروہ بندوں جیسے ہیں۔ تمہیں زاہد سے کریدنا پڑے گا کہ راجا کا ماضی بھی ایسا ہی رہا ہے یا وہ آج کل نئے طور طریقوں پر چل نکلا ہے۔ مجھے شبہ ہو رہا ہے کہ اس کی پشت پر کوئی اور ہے جو اسے چلا رہا ہے۔“

”اب تک کے واقعات سے یہ بات کھل چکی ہے کہ چوڑا نے اس کے سر پر اپنا ہاتھ رکھا ہوا ہے۔ وہ دل کھول کر راجا کی مدد نہ کر رہا ہوتا تو اس کے آدمی بمبئی بازار کی گلیاں آبادی میں میرا مقابلہ نہ کرتے۔ بھارتیوں نے ہماری زندگی مفلوج کرنے کے لیے اپنی تجویروں کے منہ کھولے ہوئے ہیں۔“

”چوڑا ایک روایتی سفید پوش مجرم ہے۔ وہ راجا کو وسائل فراہم کر سکتا ہے لیکن قانون سے مقابلے اور فرار کے گرنہیں ہتا سکتا۔ مجھے راجا کا معاملہ زیادہ گہرا اور پر اسرار معلوم ہو رہا ہے۔ اب ہمیں اس کی تہ تک پہنچنا ہوگا۔“

”تمہاری یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔“ اول خان سر ہلاتے ہوئے بولا ”جلال کے کمپیوٹر پر چوڑا کا ریکارڈ بے داغ ہے۔ وہ پیسے کے زور پر اور اپنا دامن بچا کر کام نکالنا جانتا ہے لیکن مجرمانہ منصوبہ بندیوں کے رموز و نکات سے کھیلنا اس کے بس سے باہر ہے۔“

سڑک کا ہلکا سا خم طے کرتے ہی ہمیں آگے بھیڑ بھاڑ نظر آنے لگی اور اول خان نے بے ساختہ اپنی گاڑی کی رفتار کم کر لی۔

راجا کے اڈے کی طرف جاتے ہوئے ہم شیر شاہ سے گزر رہے تھے تو وہاں ہر طرف ویرانی اور سناٹے کا راج تھا۔ ہم کسی رکاوٹ کے بغیر وہاں سے گھوم کر حب ریور روڈ پر

مڑ گئے تھے لیکن اس وقت وہاں متعدد گاڑیاں رکی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ اسی کے ساتھ سڑک پر کافی افراد بھی موجود تھے۔

”معلوم ہوتا ہے کہ آگے کوئی حادثہ ہو گیا ہے“ اول خان نے اپنی رائے ظاہر کی۔

”رکنے کے بجائے اپنا راستہ بنا کر آگے نکلنے کی کوشش کر دیا پھر گاڑی واپس گھما لو۔ ہم اندر سے ہو کر نکل جائیں گے۔“ میں نے مشورہ دیا۔

قریب پچھنچے پر راستہ بالکل مسدود ملا۔ لوگوں نے پوکھلا ہٹ میں اپنی گاڑیاں سڑک پر بے ترتیبی سے روک دی تھیں۔ وہی سسی کسر آس پاس سے جمع ہونے والے لوگوں نے پوری کر دی تھی۔ اول خان نے گاڑی روک کر ایک آدمی سے معلوم کیا تو ہمیں پتا چلا کہ کچھ دیر پہلے ایک تیز رفتار گاڑی ڈرائیور کے قابو سے باہر ہو کر تنگ چوراہے کی دیوار پر چڑھ گئی تھی۔ دھماکے کی آواز سن کر تھڑوں، کانٹوں اور گھروں میں سوئے ہوئے سب لوگ ہڑبڑا کر باہر نکل آئے تھے۔ وہاں سے گزرنے والی اکاؤ گاڑیاں بھی جائے حادثہ پر رکتی چلی گئیں اور یوں تھوڑی دیر میں وہاں ٹریفک جام ہو گیا۔

حادثے کا شکار ہونے والی گاڑی کے زخمی ڈرائیور کو ایک ٹیکسی میں ڈال کر اسپتال لے جایا جا چکا تھا لیکن تماشائیوں کی چمچ پھل برقرار تھی۔

غصیت یہ تھا کہ صبح کی اولین ہواؤں کے خشک جھونکوں نے جھوم کاموڈ نہیں بگڑنے دیا تھا۔ ہر شخص رضا کارانہ طور پر ہمیں راستہ دینے کے لیے تیار تھا۔ اول خان نے وہاں رک کر راستہ صاف ہونے کے انتظار میں اپنا وقت برباد کرنے کے بجائے اسٹیرنگ پر اپنے کمالات دکھانے کو ترجیح دی اور ہم رینگ رینگ کر انسانوں اور گاڑیوں کے اس انبہ سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس مختصر سے حصے سے آگے سڑک دور دور تک صاف تھی۔

ہم اٹن پر اچالے کی کوئی کرن نمودار ہونے سے پہلے گھر پہنچ گئے۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ویرا اور سلطان شاہ کا مسود خوش گوار تھا۔ ان دونوں میں اگر کوئی جھڑپ ہوئی بھی تھی تو اس کے اثرات زائل ہو چکے تھے۔

”تم دونوں بہت جلد واپس لوٹ آئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا؟“ ویرا نے اپنی بے رحمانہ رائے کے اظہار کے لیے کسی تنقید کا تکلف کیے بغیر کہہ ڈالا۔

”یہ بڑی کامیابی ہے کہ ہم صحیح سمت میں کام کر رہے

وہ بھی دیراکا ہم نوا تھا۔ میں نے اپنے کمرے کا رخ کرنے کے بجائے ڈرائنگ روم کے صوفے پر اپنے ہاتھ پیر پھیلادیے۔



راجا کی نشاندہی کے سلسلے میں حلال نے اپنے معمولات سے ہٹ کر میری غیر معمولی مدد کی تھی اور میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اس بارے میں کوئی پیش رفت ہوتے ہی میں اسے آگاہ کروں گا۔ میں نے ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر اس کے دفتر کا فون ملایا تو اس وقت گیارہ بج چکے تھے۔

یہ میری خوش قسمتی تھی کہ وہ اس وقت اپنے دفتر میں موجود تھا۔ میری آواز پہنچانے ہی اس نے فون پر چمکنا شروع کر دیا۔

”میں نے رات کو تمہیں بہت پریشان کیا“ میں نے موقع پاتے ہی کہا ”میں تمہارا ممنون ہوں کہ تم نے ریکارڈ کی چھان بین کر کے راجا کی نشان دہی کی۔ چوپڑا کے معاملات میں وہ پوری طرح ملوث ہے۔ اس کے ستارے اچھے تھے کہ آج صبح سویرے ہم اسے پکڑنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔“

”مجھے رپورٹ مل چکی ہے“ حلال کے اس انکشاف نے مجھے حیران کر دیا ”رات کو تم سے آخری بار بات کرنے کے بعد میں نے اپنے اسٹاف کو راجا کی دور سے نگرانی پر مامور کر دیا تھا۔ ان سے مجھے پتا چلا ہے کہ رات کو ایس بی ایف والے چار گاڑیوں میں بارہ افراد کے ساتھ وہاں پہنچے تھے۔“

”پھر تو تمہیں یہ بھی معلوم ہو گا کہ وہاں ایک لاش موجود تھی؟“ اس کے خاموش ہوتے ہی میں نے قلمہ دیا۔

”رات کو بلکہ آج منہ اندھیرے فوری طور پر اس کی شناخت نہیں ہو سکی تھی لیکن پولیس کو اس بارے میں کوئی شبہ مل گئی تھی“ صبح رونما ہونے والے واقعات دہرانے کے بجائے اس نے نئی بات شروع کر دی۔ وہ کہہ رہا تھا ”تو بچے بیٹھادر تھانے کا عملہ جوشی کے ایک بیٹے کو لے کر وہاں پہنچا اور اس لڑکے نے اپنے باپ کو شناخت کر لیا۔ مجھے یقین ہے کہ راجا نے اسے چوڑا لکی ہدایت پر مارا ہوگا۔“

”میں نے ابتدا میں محسوس کر لیا تھا کہ جوشی کوئی اہم بات جانتا تھا اور چوپڑا اسے ہر قیمت پر اپنے دشمنوں سے دور رکھنا چاہتا تھا۔ اس کی جوشی سے دوستی تھی۔ وہ اسے مروانے پر آمادہ نہیں تھا لیکن کھیل بگڑا دیکھ کر اسے وہ ناگزیر فیصلہ کرنا پڑ گیا۔“

”ویری گڈ!“ ریسپور پر اس کی تحسین آمیز آواز ابھری ”اس بارے میں میری اور تمہاری سوچ یکساں ہے۔ وہ جوشی

”اول خان نے بیٹھے ہوئے جواب دیا ”راجا کوئی غیر متعلق آدمی نہیں ہے، جوشی اسی کی تحویل میں تھا۔ راجا نے نظریہ سرر منڈلا تا دیکھ کر اسے مار ڈالا اور خود بھاگ گیا۔“

”تم ایک لاش کی دریافت کو کامیابی سمجھتے ہو تو سمجھتے ہو میں تو اسے ناکامی کہوں گی کہ راجا تمہیں جل دے کر نکل گیا“ ویرا نے سگریٹ کا کش لے کر کہا۔

”وہ زیادہ دیر تک ہماری گرفت سے نہیں بچ سکے گا“ میں نے جواب دیا ”اب ہم اس کی راہ پر لگ چکے ہیں۔“

”یہ سب نفسانفسی کی نحوست ہے جو ہم ایک کے بعد دوسری ناکامی کا منہ دیکھتے چلے جا رہے ہیں“ ویرا نے چیخ کر کہا ”میں نے اپنی ڈیوٹیہ اینٹ کی مسجد بنانے کی کوشش کی تو چوپڑا نے اپنے گھر میں دو من کا تالا ڈال کر غائب ہو گیا۔ اول خان نے بنا جھنڈا بلند کرنا چاہا تو جوشی پھسل کر ہاتھ سے نکل گیا۔ اب دونوں مجھے چھوڑ کر راجا کے پیچھے گئے تو وہ جل دے گیا۔“

”اس تو اس نیچے پر پختی ہوں کہ صرف اتفاق میں برکت ہے۔“

”مذہ سے کدھا ملا کر چلو گے تو کامیابیاں تمہارے قدم میں لگی۔“

”کیوں نہ زاہد کو فون کیا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ اسے کچھ باتیں معلوم ہوئی ہوں“ میں نے ویرا کی تقریر کو نظر انداز کر کے اول خان سے کہا۔

”بے سود ہے“ اول خان نے اپنی رسٹ واپس پر نظر ڈال کر جواب دیا ”ابھی وہ تھانے نہیں پہنچا ہوگا۔ لاش ملنے کے بعد جائے واردات پر اس کا کام بہت بڑھ گیا ہے۔“

”بے کار بیٹھ کر اپنے ذہنوں اور جسموں کو تھکانے سے باز ہو گا کہ ہم چاروں بھی غزالہ کی طرح کچھ دیر آرام لیں۔ یہ صبح اور رات کا آخری سنگم ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس نیند آہی جائے“ سلطان شاہ نے ہلکی سی انگڑائی لے کر یزید پیش کی۔

اول خان نے یکایک اپنی جگہ چھوڑ دی اور کہا ”میں بھی سوچ رہا تھا“ میں چلا ہوں۔“

اول خان ایک طویل وقفے سے اپنے اہل و عیال سے ٹٹا ہوا تھا۔ اس نے پوری رات ہمارے ساتھ گزار دی تھی۔ اسے مزید رکنے پر مجبور کرنا مناسب نہیں تھا۔ ویسے بھی اسے لیے فوری نوعیت کا کوئی کام نہیں رہا تھا۔ ہم تینوں خوش دلی سے اسے رخصت کر دیا۔

”اب مجھے تفصیل سے بتاؤ کہ وہاں کیا ہوا؟“ اول خان چلے جانے کے بعد ویرا اچھے پکڑ کر بیٹھ گئی۔ سلطان شاہ بشرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اس نئی باز پرس کے سلسلے میں

کو مروانا چاہتا تو اس کے گھر میں ہی مروا سکتا تھا۔ اسے وہاں سے اٹھوانے کی ضرورت نہیں تھی۔“

”راجا کے ہاتھ آنے کے بعد یہ گتھی سلجھ سکے گی کہ جوشی کی کیا اہمیت تھی“ میں نے کہا۔

”اس بارے میں شاید راجا کچھ نہیں بتا سکے گا۔ اصل جواب صرف چوپڑا دے سکتا ہے۔“

”اس کا نہیں کوئی پتا نہیں چل رہا۔ ایس نی ایف والے اس کے مقفل گھر کی گمراہی کر رہے ہیں۔ کسی نے ادھر کا رخ کرنے کی کوشش نہیں کی۔“

”وہ اپنے توصل خانے میں دھکا ہوا ہوگا۔ کب تک وہاں چھپا رہے گا۔ کسی نہ کسی وقت اسے باہر آنا پڑے گا“ جلال کی آواز میں تلخی در آئی ”اب نبی اطلاع یہ ہے کہ نوود کی پوسٹنگ کراچی کے توصل خانے میں کردی گئی ہے۔ وہاں ہمارے دو شکار جمع ہو گئے ہیں۔“

نوود کے بارے میں جلال مجھے پہلے بتا چکا تھا کہ وہ اپنے تقرری دستاویزات کے ساتھ اسلام آباد پہنچ چکا تھا۔ وہ آئی بی کے ایک بہت اہم اہلکار کا قاتل تھا۔ مجھے یاد تھا کہ جلال نے اس سے عبداللہ عرف ولی رام کے قتل کا بدلہ لینے کا عہد کیا ہوا تھا۔

”تم فکر نہ کرو۔ یہ دونوں کسی بھی وقت ہماری گرفت میں آجائیں گے۔ اس وقت مجھے راجا کی فکر ہے۔ اس کے فرار سے میں ذاتی طور پر اپنی سبکی محسوس کر رہا ہوں۔“

”کام کے سلسلے میں“ میں ذاتیات کا قائل نہیں ہوں مگر راجا کے بارے مجھے بھی خلش ہے۔ وہ حرام زادہ ایک پاکستانی ہوتے ہوئے راولوں کے ہاتھ بکا ہوا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اسے شہر کے دوسرے بد معاشوں کے لیے عبرت کی مثال بنادیا جائے۔“

”اس پر تین سبتوں سے کام ہو رہا ہے“ جلال کے اشتعال کا اندازہ لگا کر میں نے اسے دلاسا دیا ”ایس نی ایف اس کی پوری ہوئی ہے۔ تمہارے آدمی اس پر کام کر رہے ہیں اور پولیس والوں نے بھی اس کی تلاش شروع کر دی ہے۔ وہ زیادہ دیر تک آزادی کے سانس نہیں لے سکے گا۔“

ہمارے پاس معلومات کے تبادلے کے سوا کوئی بڑی خبر نہیں تھی۔ تھوڑی دیر کی گفتگو کے بعد میں نے فون بند کر دیا۔ اس درمیان میں ویرا ڈرائنگ روم میں آ بیٹھی تھی۔ وہ مجھ سے سوال کیے بغیر نہ رہ سکی ”کس سے بات ہو رہی تھی؟“

”جلال نے تھوڑی سی بات کہی کہ راجا کے گھر سے ملنے والی لاش جوشی کی تھی“ میں نے اسے بتایا۔

”اس میں کون سی نئی بات ہے۔ تم نے تو صبح سویرے مجھے بتادیا تھا کہ وہاں جوشی کو مارا جا چکا تھا“ ویرا نے اعتراض کیا۔

”وہ میرا اندازہ تھا۔ ہم میں سے کوئی بھی جوشی کو نہیں جانتا تھا۔ میں نے لاش کے بندھے ہوئے ہاتھ پیروں سے اندازہ لگایا تھا کہ وہ لاش جوشی کی ہوگی۔ اب جلال نے بتایا ہے کہ متونی کو شناخت کیا جا چکا ہے۔“

”کیا یہ بات حیران کن نہیں ہے کہ وہ اسلام آباد میں بیٹھ کر بھی اتنا باخبر رہتا ہے“ ویرا نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

”وہ کوئی عام سرکاری افسر نہیں ہے“ انجیلی جنس بیوڈو کا ایک اہم عہدے دار ہے۔ وہ ملک میں درپردہ رونما ہونے والے واقعات سے بے خبر رہے تو مجھے صدمہ ہوگا۔ ہر اہم بات اور واقعے سے باخبر رہنا اس کے فرائض منصبی میں شامل ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ وہ یہ ذمہ داری پوری خوش اسلوبی سے پوری کرتا ہے۔“

”وہ واقعی حیران کر دینے والی صلاحیتیں رکھتا ہے“ ویرا نے اعتراف کیا ”سلطان شاہ نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے کشمیر محنت سے اپنا سارا ریکارڈ کنگال کر چوپڑا اور راجا کے درمیان تعلق کا سراغ نکالا تھا۔ یہ ذہانت ہر ایک کے پاس نہیں ہوتی۔“

”جو لوگ پورے خلوص سے کام کرنے پر یقین رکھتے ہیں“ وہ اپنے لیے کوئی نہ کوئی راہ نکال لیتے ہیں۔“

”تم اس سے راجا کے سوا کون دونوں کی بات کر رہے تھے؟“ ویرا نے یوں چونک کر پوچھا جیسے اسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آگئی ہو۔

”چوپڑا اور نوود“ میں نے بتایا ”اسے بھی اسلام آباد سے کراچی پہنچ دیا گیا ہے۔“

”اوہ!“ ویرا ایک گرا سانس لے کر بولی ”وہ سراپر عبداللہ کے خون کے انتقام کا معاملہ ہے۔ میں سمجھ رہی تھی کہ موجودہ واقعات کے سلسلے میں ایپانگ کوئی نایام تمہارے سامنے آ گیا ہے۔ اس وقت ہماری توجہ کئی سمتوں میں بٹی ہوئی ہے۔“

”جوشی کے قتل سے ایک باب بند ہو گیا۔ اب ہمارا توجہ کا مرکز صرف چوپڑا کی ذات ہے۔“

”تو کیا تم نے راجا کو اس کے حال پر چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے؟“ ویرا نے حیرت سے پوچھا۔

”راجا اور چوپڑا ایک سلسلے کی دو کڑیاں ہیں۔ باری

ان دونوں کو ان کے انجام تک پہنچادیا جائے گا۔“ میں سختی سے کہا۔

”اس بار یہ عجیب اتفاق ہے کہ دونوں پاکستانی ہیں۔ رامنشن کو آگے بڑھانے والوں میں کسی غیر ملکی کا نام سے سامنے نہیں ہے۔“

”دونوں پاکستانی ہیں۔ ایک ہندو اور دوسرا مسلمان۔ دونوں رائے ہاتھوں یکے ہوئے ہیں“ وہ اعتراف کرتے ہیں۔ میں نے اپنے حلق میں تلخی سی گھلتی ہوئی محسوس کی۔

”کیا تمہیں یقین ہے کہ راجا مسلمان ہے؟“ ویرا نے وہ پوچھ کر کچھ چونکا دیا۔ وہ کہہ رہی تھی ”اس کے نام سے ظاہر نہیں ہو تا کہ وہ کون ہے؟“

”یہ میرا قیاس ہے۔ میں اب اس کی تصدیق کر لوں گا“ نے دھیر سے کہا۔

غزالہ اور سلطان شاہ اپنے اپنے چائے کے گب اٹھائے سے برآمد ہوئے اور اگر ہمارے ساتھ بیٹھ گئے۔

ہمارے درمیان گفتگو کا سلسلہ چلتا رہا۔ پچھلے واقعات بارے میں غزالہ کی معلومات سب سے کم تھیں اس لیے سب سے زیادہ تجسس تھی۔ وہ بہت کم سوالات کرتی تھی جب اس کی طبیعت میں تجسس بیدار ہوتا تھا تو وہ بال کی سن نکالتی چلی جاتی تھی۔

ان باتوں کے درمیان اول خان کا فون آگیا۔ اس کی سے خوش ہوئی بڑی تھی۔

”مبارک ہو۔ تمہارا گندا شکار آخر کار پھندے میں لگیا۔“ اس کی مسرت سے مغلوب آواز میرے کانوں میں

”اس وقت کم از کم تین نام میرے سامنے ہیں۔ تم کس سے کر رہے ہو“ میں فوری طور پر اس کا اشارہ نہیں سمجھ

”مجھے سب سے زیادہ نفرت راجا سے ہے اور وہی اپنی قی کے پھندے میں پھنسا ہے۔“

راجا کے بارے میں اول خان کے وہ الفاظ سن کر خوشی میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ میں نے برجوش لہجے میں ”اب بیلایل بچھواتے رہو گے یا اس سے ملعون کے ام آئے کے بارے میں کچھ اور بھی بتاؤ گے۔“

”صبح سعید آباد سے واپسی پر شیر شاہ میں نظر آنے والا سیڈنٹ تم کو یاد ہے؟“ اول خان اس وقت میرے صبر کا نلنے پر ملامت لے رہا تھا۔

”اچھی طرح یاد ہے“ میں نے جلدی سے کہا ”وہ بھولنے

والا واقعہ نہیں تھا۔“

”راجا کی گاڑی کو وہ حادثہ پیش آیا تھا۔ گھر سے نکل کر وہ بدحواسی کے عالم میں فرار ہوا تھا۔ اس موٹر پر اپنی گاڑی پر قابو نہیں رکھ سکا اور گاڑی چوراہے کی اونچی منڈیر توڑتی ہوئی گھاس پر چڑھ گئی۔ وہ بہت بری طرح زخمی ہوا ہے۔“

”تم کو کیسے پتا چلا کہ حادثے کا شکار ہونے والی کار اسی کی تھی؟“ میں نے بے تابی سے سوال کیا۔

”ابھی ابھی میں زاہد سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔ یہ خوش خبری اسی نے سنائی ہے۔“

”شیر شاہ کے علاقے میں ہونے والے حادثے کا سعید آباد کے تھانے سے کیا تعلق نکل آیا؟“ مجھے اس کی سنائی ہوئی خبر پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

”بھاگتے ہوئے راجا کو اپنی کوئی گاڑی استعمال کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ وہ چھتیس اور دیواریں پھلانگتا ہوا کافی دور جانے کے بعد بار پھنکا اور گھر کے باہر کھڑی ہوئی کار چارکر لے بھاگا۔ فائرنگ کا طوفان تھمنے کے بعد لوگ گھروں سے

نکلے تو گاڑی کے اصل مالک کو چوری کا علم ہوا۔ اس نے اسی وقت تھانے میں رپورٹ درج کرا دی۔ حادثے کا شکار ہونے والی گاڑی کے بارے میں چھان بین شروع ہوئی تو پتا چلا کہ

سعید آباد تھانے میں اس کی چوری کی رپورٹ درج ہے۔“

”اوہ! تو یوں کہو کہ زاہد کو مالِ مسروقہ کی شناخت کے لیے شیر شاہ تھانے جانا پڑا تو اسے حقیقت کا علم ہوا ہو گا“ میں نے اس کی بات کا ٹکڑا کر کہا۔

”ہاں۔ وہ بھی بہت خوش تھا اور کار کے حادثے کو قدرت کا عتاب قرار دے رہا تھا۔“

”اب راجا کہاں ہے؟“ اول خان کی گفتگو میں آنے والے واقعوں سے مجھے سخت الجھن ہو رہی تھی۔ میں اس واقعے کی ساری جزئیات جلد از جلد جان لینے کے لیے بے چین تھا اور وہ نے تلے ٹکڑوں میں اپنی کمائی سنار تھا۔

”حادثے کے بعد وہ اسپتال میں بے ہوش پڑا ہوا ہے۔“ اول خان نے ایک مرتبہ پھر مختصر جواب دینے پر اکتفا کیا۔

”اس کی سخت ترین نگرانی کی ضرورت ہے“ میں نے مضطربانہ لہجے میں کہا ”وہ بہت مکار آدمی ہے۔ ہوش میں آتے ہی اسپتال سے فرار ہونے کی کوشش کرے گا۔“

”زاہد نے اپنے افسروں کو بتادیا ہے کہ وہ ایس ٹی ایف کا مطلوب مجرم ہے۔ تم فکر نہ کرو، مسلح پولیس کے ساتھ میرے حلق و چونڈ آدمی بھی اسپتال کی نگرانی برامو رہیں۔“

”اب راجا کہاں ہے؟“ اول خان کی گفتگو میں آنے والے واقعوں سے مجھے سخت الجھن ہو رہی تھی۔ میں اس واقعے کی ساری جزئیات جلد از جلد جان لینے کے لیے بے چین تھا اور وہ نے تلے ٹکڑوں میں اپنی کمائی سنار تھا۔

”حادثے کے بعد وہ اسپتال میں بے ہوش پڑا ہوا ہے۔“ اول خان نے ایک مرتبہ پھر مختصر جواب دینے پر اکتفا کیا۔

”اس کی سخت ترین نگرانی کی ضرورت ہے“ میں نے مضطربانہ لہجے میں کہا ”وہ بہت مکار آدمی ہے۔ ہوش میں آتے ہی اسپتال سے فرار ہونے کی کوشش کرے گا۔“

”زاہد نے اپنے افسروں کو بتادیا ہے کہ وہ ایس ٹی ایف کا مطلوب مجرم ہے۔ تم فکر نہ کرو، مسلح پولیس کے ساتھ میرے حلق و چونڈ آدمی بھی اسپتال کی نگرانی برامو رہیں۔“

”اس وقت اپنے ذہن کو اتنا نہ تھکاؤ۔ یہ دور کی باتیں ہیں۔ اس وقت ہمیں اپنی ساری توجہ راجا پر مرکوز رکھنی چاہیے۔“

اے باپ کی لاش پہچان لی ہے" میں نے اسے یاد دلایا۔

”میں تمہاری طرف سے کسی اچھی خبر کا منتظر رہوں گا۔ یہ جان کر شاید تم کو بھی خوشی ہو کہ اب یہاں صرف چوہا نہیں ہے، اس کے ساتھ ساتھ نوود بھی کراچی آگیا ہے۔“

”اس خبر سے جلال کو زیادہ خوشی ہوئی۔ وہ عبد اللہ کے قتل کے بعد اس پر خار کھائے بیٹھا ہے“ ہنسی کے ساتھ اول مان کی آواز آئی۔

”مجھے یہ اطلاع اسی نے دی ہے۔ اب تم یک سو ہو کر اپنی توجہ راجا پر مرکوز کرو اور ہاں، یہ تو بتاؤ کہ راجا کا مذہب کیا ہے؟“ بات ختم کرتے ہوئے مجھے اچانک ویرا کا اٹھایا ہوا نکتہ یاد آگیا جس کی نظری اہمیت بھی مگر عملی طور پر راجا کا مذہب غیر اہم تھا۔ بنیادی بات یہ تھی کہ وہ غدار اور اپنے وطن کا مجرم تھا۔ اس کے مذہب کو درمیان میں لائے بغیر میں اس کو کیفر کردار تک پہنچانا تھا۔

”وہ جھوٹا اور دوغلا ہے۔ خود کو نو مسلم کہتا ہے“ اول مان تاراج تھا۔ ”پہلے عیسائی تھا تو کبھی گرجا نہیں گیا تھا۔ دو سال پہلے کی ضرورت کے تحت مسلمان ہوا تو مسجد کی صورت تک نہیں دیکھی۔ مذہب کے حوالے سے مسلمان اس پر اعتبار کرتے ہیں نہ عیسائی، یہ بات تمہیں اچانک کیوں یاد آگئی؟“

”ہاں ویرا اسے بحث ہو گئی تھی“ میں نے ہنس کر گول ول سا جواب دیا۔

”اس سے بحث مت کیا کرو۔ اس لڑکی نے نکتہ آفرینی کا غصہ کا دماغ لیا ہے۔ وکالت کا پیشہ اختیار کر لیتی تو اپنے فیول کا ہیجان کر دیتی۔“

”میں تمہاری اس نصیحت پر عمل کرنے کی کوشش کروں۔ تم راجا پر اپنا کام شروع کرو۔“

سعید آباد سے واپسی پر راستے میں ایک حادثے کا منظر لگتا تھا اس قدر معمولی اور لا تعلقی واقعہ تھا کہ میں نے کسی سے اس کا ذکر کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا۔ فون بند کرنے کے بعد میں نے ان بتیوں کو راجا کے انوکھے حادثے کے بارے میں بتانا شروع کیا تو ان کی آنکھیں حیرت سے پھیلی گئیں۔

یہ بات واقعی تعجب خیز تھی کہ ہم اپنے جس مجرم کو بڑے میں ناکامی کے بعد واپس لوٹ رہے تھے، وہ ہمارے راستے میں حادثے کا شکار ہو چکا تھا، ہم وہاں سے گزرے مگر ہم نے اس واقعے کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ ہم وہاں رک بھی تے تو نہیں کچھ پتہ نہ تھا کہ قسمت کی ستم ظریفیاں کیا گل لارہی تھیں۔ سب سے پہلی بات یہ تھی کہ ہم اپنے مجرم کو

اس کے چرے مہرے سے نہیں پہچانتے تھے اگر وہ جائے حادثہ پر پڑا ہوتا تب بھی ہم اسے نہیں پہچان سکتے تھے کہ وہ راجا تھا۔ دوسری اور اہم ترین بات یہ تھی کہ اس وقت تک حادثے کے زخمی کو جائے حادثہ سے اسپتال کی طرف لے جایا جا چکا تھا۔

”یہ مقدر کی نیرنگیاں ہیں۔“ ویرا اسگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے بولی ”جو کبھی کبھی اپنا رنگ دکھاتی ہیں۔“

”جو ہوا وہی سب سے بہتر تھا۔“ غزالہ نے مسکراتے ہوئے کہا ”وہ ٹوٹی ہوئی پنڈلی کے ساتھ اسپتال کا قیدی بن گیا اور وہاں پولیس والوں نے اسے شناخت کر لیا۔ جب کسی مجرم کی شامت آتی ہے تو اس کے گرد اسی طرح گھیرا تنگ ہوتا ہے۔“

”اب اسٹیشن فور میں، میں اس کی خدمت کروں گا۔“ سلطان شاہ نے اپنی دونوں ہتھیلیوں کو زور زور سے آپس میں رگڑتے ہوئے اعلان کیا ”اسے اپنی چھٹی کا کھایا پیا تک یاد آجائے گا۔“

”میں تم سے متفق نہیں ہوں۔“ غزالہ نے نرمی سے کہا ”طاقت کے بل پر کسی کو زیر کرنا تیسرے درجے میں شمار ہوتا ہے۔“

”تو تمہارا کیا خیال ہے؟ ہم کو اس ملعون کی ضیافت کینی چاہیے!“ ویرا نے تیوریاں چڑھا کر پوچھا۔

”شاید ہم میں سے کسی نے اس کو نہیں دیکھا لیکن اب تک اس کے بارے میں جو باتیں سامنے آئی ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ وہ عمدہ منصوبہ بندی سے کام کرنے والا آدمی ہے۔ اس نے جوشی کو نکال لے جانے میں کامیابی حاصل کی، اپنے گھر سے کامیابی سے فرار ہو گیا۔ وہ تو اس کے ستارے گردش میں آگئے کہ اس کی چرائی ہوئی گاڑی حادثے کا شکار ہو گئی ورنہ ہم اس وقت اس کے نکل جانے پر اپنے ہاتھ مل رہے ہوتے۔“ غزالہ نے راس من بجا کر جواب دیا۔

”تمہاری بات واضح نہیں ہے۔“ ویرا نے فوراً اعتراض جڑ دیا ”جو کچھ کہنا چاہتی ہو، کھل کر کہو۔“

میں نے ان بتیوں کی گفتگو میں دخل دینے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ غزالہ کے ذہن میں کوئی نئی بات جنم لے چکی تھی۔

”ایک بار اول خان اسے اپنی تحویل میں لینے میں کامیاب ہو جائے تو وہ ہر وقت ہمارے رحم و کرم پر ہوگا۔“ غزالہ کہہ رہی تھی ”تم جب چاہو“ اس پر ہاتھ اٹھا کر تشدد کا آغاز کر سکتی ہو لیکن میرا اندازہ ہے کہ وہ تشدد کے سامنے

جھکنے والوں میں سے نہیں ہے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ سلطان شاہ بولا ”بعض مجرم بہت سخت جان ہوتے ہیں۔ ہر تشدد سہہ لیتے ہیں لیکن اپنی زبان نہیں کھولتے۔ ابھی ہم نے راجا کا سامنا نہیں کیا اور نہ اس کے رویے کے بارے میں کوئی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ تم جو کچھ کہہ رہی ہو وہ نرے قیاس پر مبنی ہے۔“

”ایک بار تم نے اس کے ساتھ مار دھاڑ شروع کر دی تو پھر اسے اپنے مفاہانہ رویے کا یقین نہیں دلا سکو گے۔“ غزالہ بولی۔

”تمہارا مشورہ ہے کہ ہم ابتدا سے ہی اسے چپکارنا شروع کر دیں؟“ ویرا نے پوچھا۔

”اس میں کیا قیاحت ہے؟“ غزالہ نے اس کے طنز کا اندازہ کر کے جوابی سوال کر ڈالا ”پیارے کر کے کسی بھی لمحے تھپڑ رسید کیا جاسکتا ہے۔ یہ منطقی عمل ہوتا ہے۔ تھپڑ مار کر پیار کرنا قطعی غیر منطقی رویہ لگتا ہے۔ راجا سمجھ لے گا کہ اسے دھوکا دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔“

”اسٹیشن فور کی کسی سنگلاخ کو ٹھہری میں وہ ہمارے ہمدردانہ رویے پر اعتبار کر لے گا؟“ اس بار سلطان شاہ نے سوال کیا۔

”وہاں سب کمرے ایک جیسے نہیں ہیں۔ یہ تم پر منحصر ہے کہ تم اسے کہاں بند کرتے ہو۔“ غزالہ نے بے پروائی سے جواب دیا۔

سلطان شاہ لا جواب ہو کر میری طرف دیکھنے لگا۔ ویرا اس کی اس حرکت سے چڑکربولی ”اپنے گرد کی طرف کیا دیکھ رہے ہو۔ بھی کبھی اپنی عقل بھی استعمال کر لیا کرو۔ تم اسے اتنی کفایت سے استعمال کرتے ہو کہ اسے زنگ لگ جائے گا۔“

”میں اسے استعمال کروں یا نہ کروں میرے پاس عقل تو ہے۔“ سلطان شاہ نے اسے ترکی بہ ترکی جواب دیا ”تم سرے سے اس نعمت سے محروم ہو۔“

”میرا حال تم جیسا ہوتا تو میں بہت پہلے تم تینوں کو کہیں مروا چکی ہوتی۔ یہ بات تم سے زیادہ ڈینی جانتا ہے۔“

”تم کو بھی اپنی بات کی تصدیق کے لیے میرے گرد کی تصدیق کی ضرورت ہے۔“ سلطان شاہ نے زہر خند کے ساتھ کہا ”درست کہا ہے کسی دانائے کہ عورتیں ناقص العقل ہوتی ہیں۔ اپنے قول سے اپنے ہر فعل کی تردید کرتی ہیں۔“

”عورتوں کو ناقص العقل نہ کہو۔ ابھی غزالہ نے تم کو لا جواب کر دیا تھا۔“

”وہ ڈینی کی بیوی ہے۔ اس میں مروانہ وقار اور مجھ بوجھ کے آثار ملتے ہیں۔ میں صرف تمہاری بات کر رہا ہوں۔“

”فضول باتوں میں وقت برباد نہ کرو۔“ میں نے ان دونوں کو تادیب کی ”ہمیں جلد از جلد کسی فیصلے پر پہنچنا چاہیے۔ اول خان نے اسٹیشن فور لے جاتے ہی اس کی ٹھکانی شروع کرادی تو ہم کوئی دوسری راہ اختیار نہیں کر سکیں گے۔“

”تم بھی تو ساری باتیں سن رہے ہو۔ کھٹے کیوں بنے ہوئے ہو؟ اپنی بھی کوئی رائے دو۔“ ویرا مجھ سے الجھ گئی۔

”میں سب کچھ سن رہا ہوں لیکن مصلحت کے پیش نظر خاموش ہوں۔ پہلے میں تمہاری رائے سننا چاہتا ہوں۔“

”میں تمہاری مصلحت کا مطلب خوب سمجھتی ہوں۔ تم غزالہ کا ساتھ دینا چاہ رہے ہو۔“

”دریں چہ شک!“ سلطان شاہ بے ساختہ بول پڑا ”زندگی بھر کے ساتھی ہیں۔ دونوں ہمیشہ ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے۔ تم کو کیا اعتراض ہے۔“

”مجھے کیوں اعتراض ہوگا۔“ ویرا نے فوراً فلابازی کھائی ”سوچی سمجھی حکمت عملی کے تحت ہم کبھی بھی کر سکتے ہیں۔ مجھے اعتراض راجا کی خاطر تواضع بر تھا۔ مجھے اس تصور سے گھن آرہی تھی کہ ہمیں ایک غدار کی ناز برداریاں کرنی پڑیں گی۔“

”الفاظ کے ہیر پھیر سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ناز برداریاں تو اب بھی کرنی پڑیں گی۔“ سلطان شاہ نے اسے سلگانے کی کوشش کی۔

اس بار ویرا نے اپنی کھوپڑی قابو میں رکھی اور نرمی سے کہا ”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بعد میں اس کے سر پر جو تے مار کر ناز برداری کا ازالہ کیا جاسکتا ہے۔“

ان تینوں کی اس طویل گفتگو میں میری ساری توجہ کام کے مرکزی نکتے پر مرکوز رہی تھی۔ باتوں یا باتوں میں انہوں نے مجھے ایک نئی راہ بھائی تھی۔ میں نے مزید چند ثانوں تک غزالہ کی تجویز کے مضمرات پر غور کیا اور پھر مبالغہ فون پر اول خان سے رابطہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ آلہ اسے ابتدا سے ہی نئی پالیسی پر عمل پیرا ہونے کا موقع مل سکے۔



ایس ٹی ایف کے فیلڈ اسپتال کا وہ کمرات صاف تھرا اور آرام دہ تھا۔ اونچی اور ڈھلوان چھت والی ٹیڑھ کی کسی حصے میں فاسل سیلنگ لگا کر اس کمرے کی اونچائی

مناسب حد تک کم کر دی گئی تھی تاکہ دیوار میں نصب اتر
کنڈیشنر کو پوری طرح اپنی کارکردگی دکھانے کا موقع مل سکے۔
کمرے میں صرف ایک سرجیکل بیڈ پڑا ہوا تھا۔ سفید
چادر والے بستر پر راجا بے ہوشی کی حالت میں پڑا ہوا تھا۔
اس کی پوری دانتی پنڈلی پر نچنے کے اوپر سے گھٹنے کے نیچے تک
موٹا اور سفید پلاسٹریڈ چڑھا ہوا تھا اور وہ آنکھیں موندے بستر پر
پڑا ہوا تھا۔

اول خان اسپتال پہنچا تو راجا ہوش میں آچکا تھا۔ وہ درد
اور تکلیف سے بری طرح کراہ رہا تھا۔ اس وقت راجا کی
پنڈلی پر کچلا سٹریچڑھا ہوا تھا۔ وہ اسپتال کے جنرل وارڈ میں
کسی لاوارث مریض کی طرح اکیلا پڑا ہوا تھا جبکہ دوسرے
مریضوں کے پاس ایک دو تیمار دار موجود تھے۔ اسپتال کا طبی
عملہ راجا کی آہ و فغاں سے قطعی لا تعلق نظر آ رہا تھا۔ وارڈ
کے دروازے پر ایک مسلح سپاہی اپنی بندوق لیے بیٹھا تھا۔
اس کے دوسا بھی نیچے مثل رہے تھے۔

اول خان باہر موجود بھیڑ میں اپنے دو آدمیوں کو دیکھتا
ہوا سیدھا آرتھوڈیک ایک اینڈ سرجیکل وارڈ کے ڈیوٹی ڈاکٹر کے
کمرے میں پہنچا تھا۔ رسمی تعارف کے بعد وہ ڈاکٹر اسے اپنے
ساتھ لے کر راجا کے بستر تک پہنچا اور اول خان کو بتایا کہ
شدید ضرب کی وجہ سے راجا کی پنڈلی کی ہڈی تین جگہ سے
ٹوٹ کر گوشت اور عضلات میں پیوست ہو گئی تھی۔ آپریشن
اور اسٹین لیس اسٹیل کی پیڈوں کے سہارے کے بغیر ہڈیوں کو
اصل جگہ پر جوڑنا ممکن تھا۔

اسپتال والوں نے فرسٹ ایڈ میں کچلا سٹریچڑھا کر راجا
کو درد کش دواؤں کے انجکشن دیے ہوئے تھے۔ شام کو اس
کی پنڈلی کا آپریشن ہونا تھا۔
سب انسپکٹر زاہد کے ایما پر وہ پولیس کیس بن چکا تھا۔
راجا پر قانون کے محافظوں سے مسلح مقابلے، فرار، کاری
جوئی، غیر محتاط ڈرائیونگ اور پھر حادثہ کرنے کے متعدد
لزامات تھے۔ اس کو اسپتال کا عملہ اپنی صوابدید پر رخصت
نہیں کر سکتا تھا۔

اول خان نے ڈیوٹی ڈاکٹر کو عندیہ دیا تھا کہ وہ اپنے طور پر
راجا کی طبی دیکھ بھال کا خواہاں تھا۔ اس نے اسپتال سے زاہد
کو فون کیا۔ وہ تھا نے میں موجود تھا۔ تھوڑی دیر میں اسپتال
پہنچ گیا اور کافذی خانہ پر کی کے بعد اول خان کو راجا کو لے
بانے کی اجازت مل گئی۔
اس کے اسپتال پہنچنے سے پہلے موبائل فون پر میری اور
س کی تفصیلی بات ہو چکی تھی۔ وہ راجا کو اپنے ساتھ لانے

کے بندوبست سے گیا تھا۔ اسپتال سے نکلنے کے بعد اس نے
راستے سے ہی اپنے عملے کو قیدی کے قیام کے بارے میں
بریف کر دیا تھا۔ وہ اسٹیشن فور پہنچا تو راجا کے لیے وہ کمر اتیار
تھا جہاں وزیر ایک نرس کے روپ میں موجود تھی۔
دور افتادہ اور دشوار گزار علاقوں میں مہمات سر کرتے
ہوئے اس فیلڈ اسپتال کی بہت زیادہ افادیت ہوتی ہوگی لیکن
کراچی جیسے شہر کے مضافات میں کی کمپیننگ کے دوران کبھی
اس کو استعمال کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔
وہ یونٹ ایس بی ایف کا ایک لازمی حصہ تھا۔ راجا
والے کمرے کے ساتھ ایک اور کمرے میں مزید دو بستر پڑے
ہوئے تھے۔ جملہ تین بستروں والے اس مختصر سے یونٹ کو
چلانے کے لیے کوئی طبی عملہ یا ڈاکٹر نہیں تھا۔ ضرورت پیش
آنے پر ایس بی ایف کے عام اراکین میں سے کسی کو بھی
وہاں متعین کیا جاسکتا تھا کیونکہ فرسٹ ایڈ کی حد تک وہ سب
ہی باقاعدہ تربیت یافتہ تھے۔ اسٹیشن فور کے عملے میں کم از کم
چار افراد ایسے تھے جو ضرورت پیش آنے پر کسی بھی مریض کو
ڈرپ یا انجکشن لگا سکتے تھے۔

راجا کو وہاں لا کر کسی کو بھی اس کا علاج کرانا مقصود
نہیں تھا۔ بس نرمی سے اسے راہ راست پر لا کر اس سے
سب کچھ اگلوں تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ راجا کو
ابتدائی طور پر یہ یقین ہو جائے کہ وہ کسی اچھے اسپتال میں ماہر
معالجین کی تحویل میں تھا۔
دیر کو راجا کی دیکھ بھال پر مامور کرنے کی تجویز اول
خان کی تھی۔ دیر ا خوب صورت اور چالاک ہونے کے ساتھ
ساتھ راجا کی آمد کے پورے پس منظر سے بھی واقف تھی۔ وہ
موقع محل کے مطابق راجا سے بہت کچھ اگوا سکتی تھی۔ اس
کی مدد کے لیے اول خان نے اپنے عملے کے دو آدمی سفید
وردیوں کے ساتھ دیر کے ہمراہ لگا دیے تھے۔ اس سارے
بندوبست کے بعد وہ کمرہ کسی اچھے اسپتال کا حصہ معلوم
ہونے لگا تھا۔
راجا کی دانتی پنڈلی کی ہڈی اس بری طرح مجروح ہوئی
تھی کہ وہ اپنے طور پر بستر سے اترنے کے قابل بھی نہیں رہا
تھا۔ یہ خطرہ نہیں تھا کہ وہ اس کمرے کی بند دیواروں کے
علاوہ کچھ اور دیکھ لینے میں کامیاب ہو جاتا جس سے اس کے
ذہن میں شبہات پروان چڑھنے لگتے۔
اسے کوئی بیماری نہیں تھی۔ اس کا اگلو مسئلہ درد اور
افیت کا تھا۔ اس کے تدارک کے لیے اول خان نے باتوں
باتوں میں اسپتال کے ڈیوٹی ڈاکٹر سے معلوم کر لیا تھا کہ راجا کا

حوالات میں پہنچا دیا جاتا۔" ویرا نے اس کے قریب جھک کر سرگوشیانہ آواز میں کہا "بروت پتا چل گیا اور تم کو وہاں سے نکال کر یہاں پہنچا دیا گیا۔"

"کیا یہ بھی کوئی اسپتال ہے؟" راجا کی نظریں مسلسل ویرا کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کی ذات کا سحر راجا پر اتنی تیزی سے کام کر رہا تھا کہ وہ کراہتا یا نکل بھول گیا تھا۔ اس کے چہرے سے اذیت کے آثار جھٹک رہے تھے مگر وہ اپنی تکلیف برداشت کر رہا تھا۔

"ہاں۔۔۔ آں!" ویرا نے بے پروائی سے جواب دیا "پرائیویٹ اسپتال سمجھ لو۔"

"تم کون ہو اور کس کے لیے کام کر رہی ہو؟" راجا کے ہونٹوں سے رازدارانہ آواز آمد ہوئی۔

"یہ بات نہیں بتائی جاسکتی۔" ویرا نے اس کے سر سے اپنا ہاتھ ہٹالیا۔ راجا سے ابتدا لپٹی چند مکالموں کے تبادلے کے بعد اس نے مزید گفتگو کے بارے میں اپنا ذہن بنالیا تھا۔

"ابھی تم نے کہا تھا کہ میں اپنے خیر خواہوں میں ہوں۔ خیر خواہ ایک دوسرے سے ایسی رازداری نہیں برتتے۔" راجا کی آواز خوشامد نہ ہو گئی "دیکھو! تم کو نہیں معلوم کہ میں کتنے بڑے عذاب سے بچ کر نکلا ہوں۔ میں زخم کی تکلیف برداشت کر سکتا ہوں مگر اپنے ذہن پر چھائی ہوئی سنگین پریشانیوں کو برداشت کرنا میرے بس سے باہر ہے۔ تم شریف اور نیک لڑکی ہو۔ خدا کے لیے میری مدد کرنے کی کوشش کرو۔"

"میں بس اسی حد تک تمہاری خیر خواہ ہوں کہ تمہیں کوئی ایذا نہیں پہنچاؤں گی۔ میں تمہیں اپنی شناخت نہیں بتا سکتی۔"

"پھر مجھے یہاں کیوں لائی ہو؟" راجا نے ایک مرتبہ پھر ویرا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں "وہیں سرکاری اسپتال میں سڑنے دیتیں۔ وہاں سے میں حوالات اور جیل چلا جاتا۔ تمہیں میری پروا کرنے اور مجھے یہاں لانے کی کیا ضرورت تھی۔"

"شاید چوٹوں نے تمہارے دماغ پر اثر ڈالا ہے۔" ویرا نے ہمدردانہ لہجے میں کہا "میں تمہیں یہاں نہیں لائی۔ مجھے نہیں معلوم کہ تم کو کس نے یہاں پہنچایا۔ میں کسی کی ستخواہ دار ہوں۔ اس نے مجھے یہاں آکر تمہاری دیکھ بھال کا حکم دیا اور میں یہاں آ گئی۔"

"اگر تم صرف بیمار دار ہو تو تمہیں یہ کیوں بتایا گیا کہ سرکاری اسپتال سے میری گرفتاری کا خطرہ تھا؟" راجا کی

درد دور کرنے اور نیند لانے کے لیے کن دواؤں اور انجکشنوں کی ضرورت پڑے گی۔ اگلے دو دن کی ضروریات کے لیے وہ دوائیں خرید لی گئی تھیں۔

میں نے راجا کی نرسنگ کے بارے میں ویرا کو اول خان کی تجویز سے آگاہ کیا تو میرا اندازہ تھا کہ وہ سچ کر اس خشک اور ناگوار کام سے انکار کر دے گی مگر اس نے غیر معمولی خوشی کے ساتھ وہ ذمے داری قبول کر لی۔ اس وقت ویرا کی نگاہوں میں ایسی چمک عود کر آئی تھی جیسی شکار کو سامنے دیکھ کر بلی کی آنکھوں میں پیدا ہو جاتی ہے۔

راجا کو اسپتال سے روانگی کے وقت ایک مسکن دوا کا انجکشن دیا گیا تھا جس کے زیر اثر وہ مسلسل بے ہوشی یا مدہوشی کی حالت میں تھا۔ ویرا اسے چھوڑ کر دو مرتبہ میرے اور اول خان کے پاس آ چکی تھی۔ اسے راجا کی طویل بے ہوشی سے سخت کوفت ہو رہی تھی۔

اس نے اپنی دوسری سگریٹ سے آخری کش لے کر بچے ہوئے ٹکڑے کو فرش پر اڑی سے مسل دیا اور اپنی کرسی راجا کے سرہانے کی طرف کھسکا لی۔

ویرا نے اپنا ہاتھ راجا کی پیشانی پر رکھا اور پھر ہولے ہولے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ چند منٹ میں ہی ویرا کی انگلیوں کے نرم نسوانی لمس کا کمال سامنے آ گیا اور راجا نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔

وہ بستر پر جت لیٹا ہوا تھا۔ کمرے میں اپنے ساتھ کسی اور کی موجودگی کا احساس کر کے سرگھبراؤ اس کی نظریں ویرا سے چار ہوئیں۔ ویرا کے ہونٹوں پر ایک بے ساختہ مسکراہٹ تیر گئی۔ اسے خوشی ہوئی کہ اس کا شکار ہوش میں آ رہا تھا اور وہ اس سے کھیل سکتی تھی۔

ویرا کے حسین چہرے پر نظر پڑتے ہی راجا چند ثانیوں کے لیے کراہنا بھول گیا اور پلکیں جھپک کر ویرا کو یوں دیکھنے لگا جیسے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا ہو۔

"تم کون ہو۔ اس وقت میں کہاں ہوں؟" چند ثانیوں بعد راجا نے مکرور آوازیں پوچھا۔

"میں تمہاری خدمت گار ہوں اور تم اس وقت اپنے خیر خواہوں میں ہو۔" ویرا نے مسکرا کر اسے یقین دلایا۔

"تم بہت اچھی ہو۔ یہ وہ جگہ تو نہیں ہے جہاں میں پہلے پڑا ہوا تھا۔"

"وہ سرکاری اسپتال تمہارے لیے چوہے دان بن رہا تھا۔ صحت یابی کے بعد تمہیں وہاں سے کسی تھا نے کی

”روزی! تم بہت چالاک ہو یا پھر سادہ لوح ہو۔

تمہارے ایک جواب سے میرے سر سے بہت بڑا بوجھ ہٹ جائے گا۔“

”اس وقت تم اپنی چوٹ کو بالکل بھولے ہوئے ہو۔“
ویرا نے اس کی پٹلی کے پلاسٹر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے یاد دلایا۔

”تم جیسی حسین لڑکی بیمار دار ہو تو زخموں کی کک ماند پڑ جاتی ہے۔ میں ویسے بھی ہمال پرست ہوں۔ خوب صورت لڑکیاں کسی کی بھی دوست یا بیوی ہوں، مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔ اگر تم کرسی چھوڑ کر میرے بیڈ پر بیٹھ جاؤ تو میرے زخموں کو زیادہ آرام لے گا۔“

”میں ایک نرس ہوں اور اپنے مریض کی تکلیف کم کرنے کے لیے اس کی ہر جائز خواہش کا احترام کرتی ہوں۔“
ویرا نے کرسی سے اٹھ کر کہا ”تم کوئی چھیڑ چھاڑ نہ کرنے کا وعدہ کرو تو مجھے تمہارے بستر پر بیٹھنے میں بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

”میں کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کروں گا۔ بس تمہارا ہاتھ پھونکا جا ہوں گا۔“

ویرا ہنستے ہوئے راجا کے بستر پر بیٹھ گئی اور اپنا دہنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔

”ہاں تو تمہارے پاس کا کیا نام ہے؟“ ویرا نے اپنا دہنا ہاتھ چھڑانے کی کوئی کوشش کیے بغیر پوچھا۔

”میں اس کا نام نہیں لے سکتا۔“ راجا نے ایک گھبرا سانس لے کر کہا۔

ویرا نے نرمی سے اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا ”اس کا مطلب ہے کہ میری اور تمہاری مجبوری یکساں ہے۔“

”اسی سے مجھے شبہ ہو رہا ہے کہ ہم کسی ایک بڑے کو جواب دہ ہیں۔“

”پھر تم پہل کرو۔“ ویرا نے اس سے مطالبہ کیا ”میں وعدہ کرتی ہوں کہ تم سے کوئی چال بازی کیے بغیر تمہارے بتائے ہوئے نام کی تصدیق یا تردید کروں گی۔“

راجا نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ چھت کی طرف نظریں جم کر کچھ سوچتا رہا پھر فیصلہ کن انداز میں بولا ”نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ میں کوئی خطرہ مول نہیں لوں گا۔ ہو سکتا ہے کہ تم کو میرا یہی امتحان لینے کے لیے یہاں بھیجا گیا ہو۔ میں بھول کر بھی اس کا نام نہیں لوں گا۔“

”تمہاری مرضی ہے۔ میں تمہیں مجبور نہیں کروں گی۔ تم بھی مجھے مجبور مت کرو۔“

آنکھوں سے الجھن جھانک رہی تھی۔
”اس کا جواب بتانے والوں کے پاس ہو گا۔ تم آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرو۔ زیادہ نہ بولو!“

”تم بہت اچھی اور ہمدرد ہو۔ خوب صورت بھی ہو۔“
راجا نے چند ثانیوں کے توقف کے بعد کہا ”تم نے اپنا نام نہیں بتایا۔“

”میری تعریفوں کا شکریہ!“ ویرا نے ایک ادا کے ساتھ مسکرا کے کہا ”میرا نام روزی ہے۔“

”اوہ۔۔۔ کس قدر خوب صورت نام ہے۔“ ویرا نے اندازہ لگایا کہ وہ پینتربیل کر اس کی خوشامدوں پر اتر آیا تھا۔ وہ دھیمی آواز میں کہہ رہا تھا ”تم واقعی گلاب کی طرح خوب صورت ہو۔ تمہارا گلابی رنگ، حسین وجود، شیریں آواز اور مہربان نگاہیں۔ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ تم میری بیمار دار ہو۔“

”آج میری ڈیوٹی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کل کسی اور کو بھیج دے۔“ ویرا نے بے حجابی سے کہا اور اپنی کرسی ذرا دور کھینچ لی۔

”تم کس کی بات کر رہی ہو۔ آخر اس کے بارے میں مجھے کیوں نہیں بتا رہیں۔ مجھے یہ جاننے کا حق ہے کہ میں کس کا مہمان ہوں۔“

”ابھی تو مجھے یہ بھی پتا نہیں کہ تم مہمان ہو یا قیدی۔ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل ہوتے تو کوئی بات واضح ہوتی۔“ غیر محسوس طور پر اسے اس کا کر، اس کی محدودوصلہ افزائی کر کے ویرا نے پسائی اختیار کرنی شروع کر دی تھی ”اس وقت تم کسی معذور کی طرح بستر پر بڑے رہنے پر مجبور ہو۔“

”یہ میرے مقدر کی خرابی ہے کہ میری گاڑی چور ہے پر چڑھ گئی۔ تم کھینچنے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں کہ جس نے مجھے یہاں لانے کے لیے اتنے پاپڑ پیٹے ہیں، وہ میرا دشمن نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے کہ ہم دونوں کسی ایک ہی شخص کو جواب دہ ہوں۔“

ویرا اس کی زبان سے ایسی ہی کوئی بات سننے کی منتظر تھی۔ اس نے کسی جوش کا مظاہرہ کیے بغیر دھیرے سے کہا ”تم اپنے پاس کا نام بتا دو۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہیں سچ بتا دوں گی۔“

”کیا پتا ہو گی؟“ راجا نے بے چینی سے پوچھا۔
”یہی کہ میں تمہارے پاس کے لیے کام کر رہی ہوں یا نہیں۔“ ویرا نے سادگی سے کہا۔

”میری اور تمہاری حیثیت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ میں زخمی ہو کر معذور ہو چکا ہوں۔ تم آزاد ہو۔“

ویرا نے اس کی بات کاٹ دی اور کہا ”ہماری مجبوریوں کا ان باتوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تم نے ایک ہی رٹ لگا کر میرا موڈ زیادہ خراب کیا تو میں کوشش کروں گی کہ وہ آج رات کے لیے میری جگہ کسی اور کو یہاں مامور کر دے۔“

راجا نے اضطراری طور پر ویرا کا بازو تھام لیا اور خوشامد انداز میں بولا ”ایسا نہ کرنا۔ ذرا سی دیر کی باتوں کے بعد ایسا لگ رہا ہے جیسے میں مدت سے تمہیں جانتا ہوں۔ میں اس مسئلے کا کوئی اور حل سوچتا ہوں تاکہ ہم اپنے بڑے سے عہد شکنی کیے بغیر ایک دوسرے کو پہچان سکیں۔“

”ضرور سوچو مگر پہلے میرا بازو چھوڑ دو۔“ ویرا نے خشک لہجے میں کہا ”ورنہ میں بہتر سے اتر کر دوبارہ کرسی پر بیٹھ جاؤں گی یا کمرے سے چلی جاؤں گی۔“

راجا نے اسی لمحے ویرا کا بازو چھوڑ دیا۔ اس کے چہرے سے جھٹک رہا تھا کہ اپنی چوٹ اور دوسری پریشانیوں کے باوجود وہ ویرا کی اداؤں پر ریشہ خطمی ہو چکا تھا۔

”میری ٹوٹی ہوئی بڑی کے بارے میں تمہارے ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟“ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد راجا نے پوچھا۔

”انہوں نے پلاسٹر کے بعد لیے جانے والے ایکسرے دیکھے ہیں۔ جوڑ ٹھیک بیٹھے ہیں۔“ ویرا نے سفید جھوٹ بولا۔

”پچھر وہ کہ شہید بیسیں کیوں اٹھ رہی ہیں۔“ راجا نے کراہ کر سوال کیا۔

”بڑی تین جگہ سے ٹوٹی تھی۔“ ویرا نے سنی سنائی بات دہرا دی ”ٹوٹی ہوئی بڑیوں کی نوکوں نے اندر کا گوشت ادھیڑ ڈالا ہے۔ جب تک نگوں کے وہ زخم مندمل نہیں ہوں گے“

”میںیں اٹھتی رہیں گی۔ ان کو برداشت کرنا ہو گا۔“

”میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے۔ کیا مجھے فون مل سکتا ہے۔“ راجا نے اچانک موضوع بدل دیا۔

”فون یہاں سے کافی دور ہے۔ اسے یہاں تک لانا ممکن نہیں ہے۔ اگر تم ذرا سی ہمت سے کام لو تو میں تمہیں وہیل چیر پر وہاں تک لے جاسکتی ہوں۔“ ویرا نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے رواروی میں جواب دیا۔

”خدا کا خوف کرو روزی!“ وہ بے ساختہ بول پڑا ”میں اپنے بیڈ پر ملنے جلنے سے قاصر ہوں اور تم مجھے وہیل چیر پر بیٹھے کا مشورہ دے رہی ہو۔“

”مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تمہاری حالت اتنی خراب ہے۔“ ویرا نے سادگی سے کہا ”تمہیں اسپتال سے یہاں بھی

”ویرا نے ویرا کی پشت ہاتھ مار کر کہا۔“

تو لایا گیا ہے۔“

”اسپتال سے منتقلی کے دوران میں بے ہوش تھا۔ ہوش کے عالم میں تکلیف ناقابل برداشت ہے۔ خدا ایسا دکھ دشمن کو بھی نہ دے۔“ اس نے بستر پر کسماتے ہوئے کہا پھر قدرے توقف کے بعد پوچھا ”کیا تھوڑی دیر کے لیے کوئی موبائل فون نہیں مل سکتا۔ میری سب چیزیں گاڑی ہی میں رہ گئیں۔“

ویرا خود ہی تجویز پیش کرنا چاہ رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اول خان نے راجا کے اس کمرے میں کئی حساس ترین ایف ایم مائیک لگائے ہوئے تھے جو سانسون کے زیروم کی آوازیں بھی نشر کر سکتے تھے۔ ان مائیکروفونز کے ذریعے اول خان اپنے دفتر میں میرے ساتھ بیٹھا ایک ایک لفظ سن رہا تھا۔ اگر راجا فون پر کسی سے بات کرنا تو ویرا وہاں موجود ہوتی یا نہ ہوتی، ہم لوگوں کو راجا کے رابطوں کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلوم ہو سکتا تھا۔

راجا سے روبرو مل کر ویرا نے یہ سمجھ لیا تھا کہ اس جرم کے بارے میں غزالہ کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ وہ بہت زیادہ محتاط اور سخت جان حریف تھا۔ اس پر براہ راست تشدد کا آغاز کر دیا جاتا تو وہ مر جاتا لیکن اپنی زبان ہرگز نہ کھولتا۔

تشدد سے گریز کر کے ہم لوگوں نے جو متبادل راستہ اختیار کیا تھا وہ طویل ضرورت ثابت ہو رہا تھا مگر بے گھر نہیں تھا۔ ویرا نے اس کے ساتھ کچھ وقت گزار کر یہ اندازہ لگایا تھا کہ راجا شہر میں جو کچھ کرتا پھر رہا تھا اس کے لیے اسے کسی مضبوط شخص کی پشت پناہی حاصل تھی جس کے نام کا اظہار آسان نہیں تھا۔

”موبائل فون کے لیے میں کوشش کر سکتی ہوں۔“ اس کی طرف سے خواہش کا اظہار ہونے پر ویرا کو اپنی شرٹلا عائد کرنے کا موقع مل گیا ”لیکن کال لمبی نہیں ہوگی اور تم کو میری موجودگی میں فون کرنا ہو گا۔“

”اختصار کی شرٹلا منظور ہے لیکن گفتگو کے دوران تم کو تحلیلہ فراہم کرنا ہو گا۔“

”یہ میری مجبوری ہے۔“ ویرا نے عذر پیش کیا ”میں بہانہ کر کے اپنے لیے فون مانگوں گی۔ اسے میں نے تمہارے پاس چھوڑ دیا اور فون دینے والے نے دیکھ لیا تو مجھے سخت کمی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ میری موجودگی سے تم کو کیا فرق پڑے گا۔“

”میں آزادی سے اور کھل کر بات نہیں کر سکوں گا۔“

اس نے ویرا کی پشت ہاتھ مار کر کہا۔

Downloaded from <http://paksociety.com>

ویرا نے اس کی حرکت پر کوئی اعتراض کیے بغیر جواب دیا ”اتنی دیر مجھ سے کھل کر باتیں کر رہے ہو۔ فون پر بھی کر لیتا۔ میں دوسری طرف کی آوازیں نہیں سن سکوں گی۔ تم جو بات چاہو کر سکتے ہو۔“

ان دونوں میں اس نکتے پر کچھ دیر تک تو تکرار ہوتی رہی۔ اس وقت راجا مصیبت میں پھنسا ہوا تھا۔ اس کی دانت میں ویرا اسے دھیرے دھیرے راہ دے رہی تھی۔ مجبور ہو کر اس نے اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔

”اب یہاں کیوں بیٹھی ہو۔“ راجا نے بے تکلفی سے ویرا کو دونوں ہاتھوں سے ہلکے سے دھکیلتے ہوئے کہا ”جاؤ اور جا کر موبائل فون لے آؤ۔“

ویرا ایک تجربے کار عورت تھی۔ وہ راجا کی ذہنی کیفیت کو اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔ وہ تکلیف میں مبتلا تھا اور اپنی الجھن سے بھی دوچار تھا لیکن ویرا کا جادو اس کے سرچڑھ کر بول رہا تھا۔ وہ ویرا کو چھونے اور چھیڑنے کا کوئی اضطرابی موقع ضائع نہیں کر رہا تھا۔ ویرا ایک مغربی دوشیزہ تھی۔ اس کے لیے ایک مشرقی مرد کی وہ پیش رفت بے معنی تھی۔ راجا کے ہاتھوں کے لمس سے اسے کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ وہ بس یہ سوچ رہی تھی کہ ان حرکتوں کے سحر میں گرفتار ہو کر اس کی موجودگی میں اپنے آقا کو فون کال کر لے تو وہ اپنا بڑا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔

اسے معلوم تھا کہ موبائل پر کیے جانے والے آخری فون نمبر اس پر اگلی کال تک محفوظ رہتے ہیں۔ محض ری ڈائل کا ایک بٹن دبا کر اس نمبر پر دوبارہ کال کی جاسکتی تھی۔ وہ راجا کو یہ موقع نہیں دینا چاہتی تھی کہ وہ اپنے آقا سے بات کرنے کے بعد کوئی فرضی نمبر ڈائل کر کے ایک اہم نمبر اڑا دے۔

جو کچھ کرنا تھا، فوری طور پر کرنا تھا۔ راجا کے آقا کے فون نمبر کا سراغ لگانے کے لیے اول خان کے موبائل کے اگلے بل کا انتظار نہیں کیا جاسکتا تھا۔

وہ کھکھلاتی ہوئی راجا کی مسہری سے اتری اور اٹھلائی ہوئی اس کمرے سے باہر نکل آئی۔

راجا ایک زخمی قیدی کی طرح کمرے میں پڑا رہ گیا۔ اس کی گمرانی کے لیے ملحق کمرے میں اول خان کے دو آدمی موجود تھے۔



”وہ بہت گندی اور گھناؤنی ذہنیت کا مالک ہے“ ویرا نے اول خان کے دفتر میں داخل ہوتے ہی کہا ”میں اسے دل پر جبر

کر کے اس کے ساتھ وقت گزار رہی ہوں۔“

”اس بارے میں‘ میں کچھ نہیں کہہ سکتا“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ”اس موضوع پر سلطان شاہ مسکت بات کر سکتا ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ میں غلط بیانی سے کام لے رہی ہوں“ ویرا نے غصے سے پوچھا۔

”ذہنی کے مذاق کو مذاق رہنے دیا کرو“ اول خان نے جلدی سے دخل اندازی کی ”تم نے راجا کو بہت خوش اسلوبی سے زیر کیا ہے۔ اسے پچکارنے کی تجویز غزالہ کی تھی لیکن میرا خیال ہے کہ غزالہ اسے اتنی خوبصورتی سے ہینڈل نہیں کر سکتی تھی۔“

”اب اسے موبائل فون کی ضرورت ہے“ ویرا نے اول خان سے کہا۔

”ہم اپنے ریسپورپر تم دونوں کی ساری گفتگو سن رہے تھے۔ تم نے کسی پریذیکٹ کے بغیر جس خوبصورتی سے راجا کو سنبھالا ہے، اس پر میرا دل خوش ہو گیا۔ ایسی برجستہ باتیں ہر کس و ناکس کو نہیں سوجھ سکتی تھیں“ اول خان نے جواب میں دوبارہ اس کی تعریف کی اور میز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی ”میرا فون پہلے سے میز پر تیار رکھا ہوا ہے۔ لے جاؤ اور اس کے حوالے کر دو۔“

”میرے ساتھ ایسا ظلم مت کرو“ ویرا یہ کہتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گئی ”اس کے ساتھ اتنا مغر کھا کر آ رہی ہوں۔ ایک پیالی چائے تو پلاؤ۔“

”چائے تمہارے کہنے سے پہلے آ رہی ہے۔ اسے یہ موقع نہ دینا کہ وہ فون کی میموری سے اپنا نمبر ہوا نمبر صاف کر سکے۔“

”میں نے محض اسی وجہ سے اس کے ساتھ رہنے پر اصرار کیا ہے“ ویرا نے ہنس کر کہا۔

”جب یہ کھیل ختم ہو جائے گا تو وہ تمہارے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر بھونچکا رہ جائے گا“ میں نے محفوظ ہوتے ہوئے بھرے کیا۔

”اس کے ہوش اڑ جائیں گے“ ویرا نے میری تائید کی ”ابھی تک اسے ایک لمحے کے لیے بھی شبہ نہیں ہوا کہ اسے دھوکا دیا جا رہا ہے۔“

”یہ تمہاری اداکاری کا کمال ہے، میں شوق سے اس کا اعتراف کر رہا ہوں“ اول خان بولا۔

”سب سے زیادہ اثر تمہارے ننھے سے فیملی اسپتال کے اڑکنڈیشنڈ کمرے نے ڈالا ہے۔ اس کمرے میں رہ کر ہر لمحے یہ

شرمندگی نہیں ہوگی۔ بس چارپانچ منٹ بعد یہ فون اسے واپس پہنچا دینا۔ میں صحت یاب ہوتے ہی ان خدمات کے صلے میں تمہیں خوش کروں گا۔“

ویرا خاموش رہی۔ اس کی خواہش رہی ہوگی کہ راجا جلد از جلد فون کراستعمال شروع کر دے۔

خاموشی کے وقفے کے بعد فون کی ہست مدھم میپ سنائی دی۔ راجا کے ملائے ہوئے نمبر سے رابطہ ہو گیا تھا اور اس کے موبائل فون کے ریسیور پر دوسری طرف کی کھنٹی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اول خان نے اپنی کرسی چھوڑی اور لپک کر پکھٹا بند کر دیا۔
”نکلیے کی مشینی گھول گھول بند ہوتے ہی میپ قدرے واضح ہو گئی۔“

”ہیلو!“ وہ دوسری طرف کی دھیمی، مردانہ اور خالص غیر ملکی آواز تھی۔

میں چونک پڑا۔ میں نے اول خان کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں بھی حیرت کے لہریے تیر رہے تھے۔

”سرا! میں ڈی ون بول رہا ہوں“ راجا نے انگریزی میں جواب دیا تھا۔ اس بار مجھے دہری حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔ شی کے عروج کے زمانے میں جہاں تک کراشناختی کو ڈی ون ہوا کرتا تھا اور وہ کراچی کی حدود میں شی کے کاروباری لین دین کا نام نہاد نگران ہوا کرتا تھا۔ اسے پس پردہ ہدایت دینے کی ذمہ داری میری تھی۔ اس بھولے برے کوڈ کے اعادے کے سوا دوسری حیرت ناک بات یہ تھی کہ راجا جیسا بد معاش بگڑی ہوئی لیکن خاصی قابل فہم انگریزی بول رہا تھا۔ اس کی صورت دیکھنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے ساری عمر کسی اسکول یا درس گاہ کی شکل نہیں دیکھی ہوگی۔

”یور آئی مین!“ بہت باریک مگر واضح آواز سنتے ہی میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ اگر اول خان نے پکھٹا بند کر کے کمرے میں سنا نہ کیا ہوتا تو راجا کو موبائل فون پر ملنے والا وہ جواب سننا دشوار تھا۔

میرے ذہن میں ماضی کے ہولناک ہولے سرا بھارنے لگے۔ آئی مین شی کے علاقائی سربراہ ہوتے تھے جو کسی بھی وقت کہیں پہنچ کر شی کے اہل کاروں کی کارکردگی کا جائزہ لے سکتے تھے۔ ان کا کوئی نام ہوتا تھا نہ شخصیت۔ آئی مین ہونے کے لیے ایک عدد سلور آئی کا مالک ہونا ضروری تھا اور اسی کو دکھا کر ہر آئی مین اپنا اختیار منواتا تھا۔

سونے کے سکوں پر چاندی سے بنی اور ابھری ہوئی ایک خوبصورت آنکھ شی میں اقتدار و اختیار اور جبروت کی علامت

احساس ہوتا ہے کہ ہم کسی بڑے اسپتال میں ہیں۔ یہ غلط فہمی اسے لے ڈوبی ہے ورنہ وہ ابتدا میں ہی بدگ گیا ہوتا۔“

”مرکزی خیال پیش کرنے کا یہ سرا غزالہ کے سر جاتا ہے“ اول خان نے میز پر ہاتھ مار کر کہا۔

ویرا نے اول خان کے آگے سے فون اپنی طرف سرکایا پھر ہاتھ کھینچ لیا۔

”کسے فون کرنا چاہ رہی تھیں؟ کرلو۔ دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا“ میں نے نرمی سے کہا۔

”غزالہ سے بات کرنا چاہ رہی تھی مگر ارادہ بدل دیا“ اس نے نیم دلی سے جواب دیا ”نہیں سلطان شاہ نے ریسیور اٹھالیا تو وہ میرا موڈ غارت کر دے گا۔“

اول خان کا اردلی چائے کی ٹرے لے آیا۔ ویرا کے لیے اضافی پیالی ٹرے میں موجود تھی۔

چائے نوشی کے دوران میں ادھر ادھر کی باتیں چلتی رہیں۔ ویرا خوش تھی کہ اس نے راجا کے ساتھ مقابلے کا پہلا مرحلہ کامیابی سے سر کر لیا تھا۔ اسے اعتماد تھا کہ وہ اپنے حریف سے مقابلے کا دوسرا دور بھی جیت لے گی۔

چائے کی پیالی ختم کرنے کے بعد ویرا، اول خان کا موبائل لے کر دوبارہ فیلڈ اسپتال کی طرف چل دی اور میں نے سگریٹ سلگا کر کرسی کی پشت گاہ سے ٹیک لگائی اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ میں یہ اندازہ لگانے سے قاصر تھا کہ راجا کس کے لیے کام کر رہا ہوگا۔ میں اس بارے میں جتنا سوچ رہا تھا۔ چوپڑا کا نام اسی قدر ابھر کر ذہن کی سطح پر نمایاں ہو رہا تھا۔ وہ دونوں ایک ہی تھیلی کے پٹے بٹے تھے۔ یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ راجا کو چوپڑا کے نام کے بارے میں اتنی رازداری اختیار کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

اس وقت تک جو حالات ہمارے سامنے آئے تھے، ان کے مطابق چوپڑا اور راجا کا گہرا گٹھ جوڑ ثابت ہو رہا تھا۔ بس جوشی کا کردار کہیں فٹ نہیں ہو رہا تھا۔

اس دوران میں ریسیور پر خاموشی چھائی رہی تھی۔ زخمی راجا شاید اپنے بستر پر خاموش پڑا اپنے مستقبل کے بارے میں فکر مند تھا۔

چند منٹ بعد ایف ایم ریسیور پر قدموں کی چاپ اور پھر ویرا کی آواز ابھری ”نو“ میں تمہارے لیے موبائل فون لے آئی ہوں۔ بات کرتے ہی یہ ڈیوٹی ڈاکٹر کو واپس پہنچانا ہوگا۔ اسے کسی کی اہم کال کا انتظار ہے۔“

”تم واقعی بہت پیاری اور کام کی لڑکی ہو“ راجا کی ہلکی سی رومان زدہ آواز سنائی دی ”میری وجہ سے تمہیں کوئی

تھی۔ راجا کا مخاطب اگر خود کو آئی مین کہہ رہا تھا تو وہ کم از کم ایک سلور آئی کا مالک تھا۔

ہم را اور امریکی ایجنسیوں کے پیچھے لگے ہوئے تھے اور ہماری بے خبری میں شی ایک بار پھر سر اٹھاری تھی۔ اس کا آئی مین کراچی میں فعال ہو چکا تھا مگر ہم غافل تھے۔ میں اپنی کہناں میز پر ٹکرا ریسیور کے اوپر جھک گیا تاکہ ہونے والی گفتگو کا ایک ایک لفظ سن سکوں۔

”سرا میں مشکل میں پھنس گیا تھا۔ نظر آ رہا ہے کہ میں اس مشکل سے نکل آیا ہوں۔ کیا میری یہ مدد تمہاری طرف سے آئی ہے؟“ راجا نے انک انک کراگریزی میں اپنا مفہوم ادا کیا تھا۔

”اس فریب میں نہ رہنا“ دوسری آواز غراہٹ میں بدل گئی ”مجھے تمہاری کسی مشکل کا علم نہیں ہے۔ کیا تمہیں یہ پاور کرانے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ تمہارے مددگاروں کو میں نے اس مہم پر بھیجا ہے؟“ اس کالب ولجہ سرا سرا امریکی تھا اور آواز سے وہ گھٹا معلوم ہو رہا تھا۔

”نہیں سرا“ راجا نے اس کی بات مکمل ہوتے ہی وضاحت کی ”مجھے کسی نے کچھ پاور کرانے کی کوشش نہیں کی۔ ٹی بی تائید کی وجہ سے حالات کچھ ایسے رخ پر چلے گئے ہیں کہ میرا دھیان تمہاری طرف چلا گیا تھا اور میں نے تم کو فون کر لیا۔“

”میں جانتا ہوں۔ تم بلا وجہ مجھے فون نہیں کر سکتے۔ میری یہ وارننگ یاد رکھنا کہ اس وقت تم تلوار کی دھار پر چل رہے ہو۔ ڈینی اور ویرا اس شہر میں ہو سکتے ہیں۔ وہ جہاں بھی ہوتے ہیں اپنے دشمنوں کے لیے سنگین خطرہ بن جاتے ہیں۔ اپنے اصل کام کے ساتھ تم کو ان کی سرکوبی کا خیال بھی رکھنا ہے۔“

”مجھے یاد ہے سرا“ وہ جواب دیتے ہوئے راجا کو معلوم نہیں تھا کہ ویرا اس کی نرس کے روپ میں وہیں موجود تھی۔ وہ کہہ رہا تھا ”تم نے ان دونوں کی نشاندہی والے انعام میں سے کوئی حصہ نہ لینے کی یقین دہانی کرا کے مجھے زبردست تحریک دی ہے۔ میں نے ان تک پہنچنے کے لیے کچھ اور لوگوں سے مراسم استوار کر لیے ہیں لیکن اس وقت میری داہنی پبڈلی ٹوٹی ہوئی ہے۔ آج صبح میری گاڑی کو حادثہ پیش آیا تھا۔“

”اوہ نہ!“ غراہٹ کی وجہ سے راجا کی بات ادھوری رہ گئی ”مشکلات میں گھر گئے ہو تو تم کو مجھ سے دور اور الگ تھلک رہنا چاہیے۔ میں خود تمہاری خبر خیر رکھوں گا اور فضا سازگار ہونے پر رابطہ کروں گا اب تم مجھے فون نہ کرنا۔“

ایک لائن ڈراپ ہو گئی۔ آئی مین خراٹ آدمی تھا۔ اس نے بھانپ لیا تھا کہ راجا سے بات کرنے میں خطرہ پوشیدہ تھا۔ اس نے اپنا حکم صادر کرتے ہی فون بند کر دیا۔

”یہ اچانک آئی مین کہاں سے نکل آیا؟“ لمحہ بھر کی خاموشی میں اول خان نے حیر زدہ آواز میں پوچھا۔ اس کا جواب دینے کی نوبت نہیں آئی کیونکہ ایف ایم ریسیور پر چھایا ہوا مختصر سکوت ٹوٹ چکا تھا۔

”لاؤ۔ مجھے دے دو“ ویرا کی محتاط اور سنجیدہ آواز ابھری ”تمہاری بات ہو گئی ہے۔ میں فون لوٹا دوں؟“

”یہ نمبر فون کی میموری میں چلا گیا ہے“ اس یار راجا کا لہجہ بدلا ہوا تھا ”اسے صاف کروں پھر فون لے جانا۔“

ویرا اسے احسن سمجھ رہی تھی۔ اس نے نمبر حاصل کرنے کے لیے خاصا جتن کیا تھا۔ راجا کا جواب سن کر اس کی کھوپڑی سبک گئی۔ ریسیور پر اس کی تلخ آواز ابھری ”میں کہہ رہی ہوں فون واپس دو ورنہ میں تمہارا منہ توڑ دوں گی۔“

”اوہو۔۔۔ اپنے ان نرم و نازک ہاتھوں سے منہ توڑو گی۔ میں۔۔۔ م۔۔۔“ راجا کی استغاثہ آواز یکایک بے معنی آوازیں میں بدل گئی۔ شاید بستر کے قریب کھڑی ہوئی ویرا نے فون چھیننے کے لیے اس پر حملہ کر دیا تھا۔ میری چھٹی حس پہلے ہی خطرے کا اعلان کر چکی تھی۔

میں کرسی سے اٹھ رہا تھا کہ ٹھک کے چند ثانیوں بعد کھٹاک کی بھاری آواز آئی اور میں نے اسی لمحے اول خان کے موبائل فون کی فاتحہ پڑھ لی۔ میرا اندازہ تھا کہ راجا نے ویرا کے چار حانہ تیور دیکھتے ہوئے موبائل دیوار پر دے مارا تھا۔ ہم دونوں ایک لمحے کے لیے دفتر میں نہیں رکے اور باہر دوڑ لگادی۔ میں اول خان سے آگے فیلڈ اسپتال کی طرف دوڑ رہا تھا۔

ہمارے پہنچنے تک ویرا حالات پر قابو پا چکی تھی۔ ایس ٹی ایف کے دونوں اہل کار اس کے پیچھے کھڑے ہوئے تھے۔ راجا بسترِ اقدت سے تڑپا ہوا چیخ چیخ کر مغلفات بک رہا تھا۔ اس کے پیروں کی طرف والی دیوار کے نیچے فرش پر ٹوٹے ہوئے موبائل فون کے ٹکڑے اور پرزے کھڑے ہوئے تھے۔

”خاموش!“ میں نے کمرے میں پہنچتے ہی اس کے رخسار پر زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔

دشمنوں کی بڑھتی ہوئی تعداد نے راجا کو نروس کر دیا۔ اس نے مدیانی انداز میں چیخ کر کہا ”اس چیزیل نے میرا گلا

جاسوسی ڈائجسٹ کے مقبول سلسلے کتابی شکل میں دستیاب ہیں

قیمت فی حصہ - 60 روپے

ڈاک خرچ فی حصہ - 23 روپے

شکاری

20 حصے (مکمل)

مکملیت ایک ساتھ منگوانے پر مابقی قیمت صرف - 1000 روپے

قیمت فی حصہ - 60 روپے

ڈاک خرچ فی حصہ - 23 روپے

مجاہد

11 حصے (مکمل)

مکملیت ایک ساتھ منگوانے پر مابقی قیمت صرف - 600 روپے

قیمت فی حصہ - 60 روپے

ڈاک خرچ فی حصہ - 23 روپے

گمراہ

8 حصے (مکمل)

قیمت فی حصہ - 60 روپے

ڈاک خرچ فی حصہ - 23 روپے

مفسرِ رور

6 حصے (مکمل)

قیمت فی حصہ - 60 روپے

ڈاک خرچ فی حصہ - 23 روپے

صدر یوں کا بیڑا

5 حصے (مکمل)

کسی بھی کتاب کے چار حصے ایک ساتھ منگوانے پر ڈاک خرچ - 29 روپے

کسی بھی قسم کی حمایت حاصل کرنے کے لئے رقم پیشگی بذریعہ منی آرڈر ارسال کریں

پوسٹ بکس 23

کراچی 74200

kitabiat1970@yahoo.com

کتابیات پبلی کیشنز

رمضان چیمبرز بلور یا اسٹریٹ آئی آئی چندریگر روڈ

فون: 5802551-5895313-5802552 فیکس: 5802551

نشانہی میں ہماری مدد کرو گے تو فائدے میں رہو گے ورنہ کتے کی موت مارے جاؤ گے ہمیں معلوم ہے کہ تم شی کے کسی آئی مین اور چوڑا کے لیے کام کر رہے ہو۔ ہم ان کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں، اپنے مقدر کا فیصلہ کرنے کا اختیار تم کو ہے۔“

”تم چوڑا اور آئی مین کے بارے میں جان چکے ہو تو مجھ سے اور کیا سننا چاہتے ہو؟“ اس نے مایوسی سے کہا ”مار ڈالو مجھے۔“

”تم پھر ہمک رہے ہو“ میں نے اپنی مصالحانہ پالیسی جاری رکھی ”ہم تمہیں مارنا نہیں زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ ہمارے سامنے دو نام ہیں۔ ہم تم سے ان کے کرتوتوں کے بارے میں سننا چاہتے ہیں۔ تم ہمارا وقت برباد کرو گے یا ہمیں گمراہ کرنے کی کوشش کرو گے تو بدترین خسارے میں رہو گے۔“

اس کا چہرہ تاریک پڑ گیا تھا اور آنکھوں میں دہشت کے سائے گرے ہو گئے تھے۔ اس نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر پوچھا ”تم کون ہو؟“

”یہ بتانا زرداری کے منافی ہوگا۔ تم یہ سمجھ لو کہ ہمارا تعلق ایک خفیہ سرکاری ایجنسی سے ہے۔“

”مج تم لوگوں نے میرے گھر پر دھاوا بولا تھا؟“ اس نے خوف زدہ آواز میں پوچھا۔

میں نے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی اور کہا ”تم اپنے آدمیوں کو دھوکے میں رکھ کر وہاں سے بھاگ گئے۔ اس کا انجام تمہارے سامنے ہے۔ تم دیکھو گے کہ تمہاری طرح ایک دن ڈینی اور ویرا بھی ہماری قید میں ہوں گے۔“

آخری فقرہ بروقت میرے ذہن میں آیا اور میں نے اسے الفاظ کے قالب میں ڈھال دیا۔ مجھے شبہ سا ہوا تھا کہ ڈینی اور ویرا سے اپنی خاصیت کا اظہار کر کے میں اسے زیادہ آسانی سے شیشے میں اتار سکوں گا۔“

”تم ایجنسی کے آدمی ہو، پھر بھی ڈینی اور ویرا کے دشمن ہو!“ اس کے خوف زدہ لہجے میں حیرت سمٹ آئی۔

”یہ دشمنوں کا پروپیگنڈا ہے کہ ایجنسیاں ان دونوں کو پال رہی ہیں۔ ان کے نام برسیبل تذکرہ آگئے۔ تم ان کو چھوڑو اور اپنی بات کرو“ میں نے کہا۔

”میں کسی شی کو نہیں جانتا۔ ہیروئن کالین دین کرنا ہوں۔ اس دھندے میں، میں اکیلا نہیں ہوں۔ یہاں سے قبائلی طاقتوں تک ہزاروں لوگ ملوث ہیں۔ ان کو کوئی نہیں پوچھتا کہ جی میں مجھ کو پکڑنے کے بجائے تم قبائلی علاقوں

ببایا۔ میرے پورے بدن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ میری پنڈلی میں آگ بھڑکی ہے۔ کسی ڈاکٹر کو بلاؤ، ہائے میں مرا!“

”ادا کاری کرنے کی ضرورت نہیں“ اول خان نے ڈپٹ کر کہا ”ہوش میں رہ کر بات کرو، یہاں کوئی ڈاکٹر نہیں ہے۔ تم نے ہوش کے ناخن نہ لیے تو ہم تمہاری ٹوٹی ہوئی پنڈلی کو ریزہ ریزہ کر دیں گے۔“

”میری پنڈلی کو ہاتھ نہ لگانا“ اول خان کی دھمکی پر وہ لرز کر رہ گیا اور گھٹیا لگا۔

”ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ سچ بتاؤ کہ ابھی تم فون پر کس سے بات کر رہے تھے؟“ میں نے سوال کیا۔

”تم دیکھ رہے ہو کہ میرا کیا حال ہے۔ میں کہاں پڑا ہوا ہوں۔ میں نے مدد کے لیے اپنے ایک دوست کو فون کیا تھا۔“ ”یہ جھوٹا ہے۔ ڈی ون بن کر کسی بڑے سے بات کر رہا تھا“ ویرا غصے سے دباڑی۔

”تم خاموش رہو“ میں نے ویرا سے کہا ”ہم نے اس خبیث کی پوری گفتگو سنی ہے۔ شی والے حرام زادے یہاں پھر سراٹھا رہے ہیں۔“

”تم جھوٹے ہو“ وہ حلق کے بل چیخا ”میں کسی شی کو نہیں جانتا، نہ میرا اس سے کوئی تعلق ہے۔“

اس بار اول خان خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ اس نے جھپٹ کر راجا کا داہنا پیر تھما اور اسے ایسا جھک دیا کہ اس کی جان نکل گئی۔ اس سے نرمی سے جو کچھ اگلوایا جا سکتا تھا وہ ہمارے سامنے آچکا تھا۔ اس سے آگے وہ کچھ بولنے پر آمادہ نہیں تھا اس لیے تشدد کا آغاز ناگزیر ہو چکا تھا۔

راجا ایک بے ساختہ چیخ مارنے کے بعد خاموش ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھوں سے دہشت اور اذیت نیک رہی تھی۔ نگاہیں ہم لوگوں کے چہروں پر ناچ رہی تھیں۔

میرے دل میں آئی کہ راجا کو اپنی اور ویرا کی اصلیت سے آگاہ کر دوں تاکہ اس کا رہا سہا دم خم بھی ختم ہو جائے لیکن اسی لمحے میں نے اپنا وہ ارادہ ترک کر دیا۔ ایسی باتیں بتادینے سے راجا کو یہ معلوم ہو جائے کہ اسے کسی قیمت پر زندہ نہیں چھوڑا جائے گا اور وہ سختی سے اپنی زبان بند کر لیتا۔ اس سے اسی وقت تک کچھ اگلوایا جا سکتا تھا جب تک اس کے دل میں اپنی زندگی کی کوئی آس برقرار رہتی۔ میں وہ آس توڑ کر معلومات حاصل کرنے کی راہ مسدود نہیں کر سکتا تھا۔

”سنو!“ میں نے کچھ دیر کے توقف کے بعد نرمی سے کہا شروع کیا ”ہم امن پسند لوگ ہیں۔ تم سے تصادم نہیں تعاون چاہتے ہیں۔ یہاں سراٹھانے والی غیر قانونی قوتوں کی

انجشن لگتے ہی راجا کے درد میں کچھ کمی واقع ہوئی اور اس نے اپنی کہانی دوبارہ چھیڑ دی ”پھر کسی وجہ سے ویرا خود جوشی کو فون کر بیٹھی۔ وہ اس سے چوپڑا کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ جوشی نے بے خبری میں اسے چوپڑا کا پتا بتا دیا پھر چوپڑا کو بھی فون کر دیا کہ اس کی بلیک کوئٹن اسے ڈھونڈ رہی ہے۔ چوپڑا اس پر ناراض ہوا اور اسے بتایا کہ اس کی بلیک کوئٹن ہی اصل میں ویرا ہے جوشی اسے پکڑوانے کی کوشش کرے۔

”چوپڑا اپنے گھر سے غائب ہو گیا۔ مشتعل لوگوں نے اس کے گھر کے پھیرے لگانے شروع کر دیے۔ اسے شبہ تھا کہ اس تک پہنچنے میں ناکام ہونے کے بعد ویرا جھٹلا کر جوشی پر ہاتھ ڈالے گی۔ وہ کام چھوڑنے کے بعد بزدل ہو گیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ چوپڑا مجھ سے ہیروئن لیتا ہے۔ چوپڑا کو ڈر تھا کہ وہ

میں پوست کی فصلوں کو آگ کیوں نہیں لگاتے؟“
”ہمیں ہیروئن سے کوئی دلچسپی ہے اور نہ پوست کی فصلوں سے۔ پہلے ہمیں چوپڑا کے بارے میں پتاؤں میں نے خشک لہجے میں کہا۔

”وہ میرا خریدار ہے۔ ہمیشہ اچھے داموں پر بڑی مقدار لیتا ہے“ اس نے بلاتامل جواب دیا۔
”وہ بھارت کا ایک ذمے داری سفارتی ملازم ہے“ ہیروئن کا کیا کرتا ہے؟“ میں نے اس انکشاف پر حیرت سے پوچھا۔

”مفت بانٹا ہوگا۔ مجھے پتا نہیں کہ وہ اس کا کیا کرتا ہے۔ وہ میرا ایک اہم خریدار ہے۔“

وہ بھارتیوں کی مکاری کا ایک نیا ثبوت تھا۔ وہ جرائم پیشہ لوگوں سے براہ راست مراسم بڑھانے کے بجائے ان کے کاروباری رفیق بنے ہوئے تھے اور آڑے وقت پر اس رفاقت سے بھرپور فائدہ اٹھاتے تھے جس کا شاید واجبی سا معاوضہ دیتے ہوں۔

”اگر وہ صرف ہیروئن کا خریدار ہے تو تم جوشی کے خون کے پیاسے کیوں ہو گئے؟“ میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

وہ شاید پہلے سے اس سوال کی توقع کیے بیٹھا تھا۔ کسی توقف کے بغیر بولا ”وہ ہیروئن کی لائن کا پرانا پانی ہے۔ دھندا چھوڑ چکا ہے۔ مگر میں اب بھی اس کے قیمتی مشوروں سے فائدہ اٹھاتا تھا۔ ہم تینوں ڈپٹی اور ویرا کے فراق میں بھی تھے۔ میری طرح چوپڑا اور جوشی کو بھی لاکھوں ڈالر کے انعام کا لالچ تھا۔ ہمیں یقین تھا کہ وہ دونوں گندی نالی کے کیڑے ہیں۔ کسی نہ کسی دن جرائم کی دنیا کا رخ ضرور کریں گے اور ہم انہیں پکڑوا دیں گے“ اس نے خاموش ہو کر بے اختیار اپنی مجروح ٹانگ پر ہاتھ رکھا اور کرانے لگا۔

شاید اس کے ذہن میں کوئی ناقابل برداشت ٹیس اٹھی تھی۔ اول خان نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر مجھے اشارہ کیا کہ راجا نے آخر کار رچ اگٹن شروع کر دیا تھا۔ میں سر کی جنبش سے تعجبی اشارہ کر کے رہ گیا۔ خود میرا بھی یہی خیال تھا کہ دھوکے میں بہت سی باتیں کھل جانے کے بعد راجا نے مجبور ہو کر رچ بولنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اپنی راست گوئی میں اسے زندگی کی خاصی امید نظر آرہی تھی جو آخر کار عیب ثابت ہوئی تھی۔
”اول خان کے ایما پر اس کا ایک آدمی درد دور کرنے والی دوا کا انجشن تیار کر کے لے آیا۔ راجا نے رضا کارانہ طور پر اپنا بازو پھیلا دیا۔

روحانی و فلکیاتی اور

ہومیوپیتھک سائنس کا مرکز

ہر قسم کے جسمانی، نفسیاتی اور روحانی علاج کے لئے
سیاگان کے علاوہ قاتل کی اول و خاتم اور اصل ہتھیاری دستیاب ہیں

آلفراز

آسٹرو ہومیوپیتھک سوسائٹی

زیگرانی: سید انور فرارز

اوقات ملاقات: شام 7 بجے تا رات 10 بجے

خواتین اور بچوں کے امراض کی ماہر

لیڈی ڈاکٹر امبرامروز (گولڈ میڈل)

اوقات ملاقات: صبح 10 تا دوپہر 1 بجے
شام 5 بجے تا رات 10 بجے

Phone & Fax (021) 5897126
E-mail address: alfaraz2000pk@yahoo.com

پتہ: 73- C ایڈون کنٹرول سٹریٹ نزد دارالہیاتی بوٹینڈری
فیز II ایکسپریس ٹرسٹ ڈسٹری بیوٹنگ کمپنی، کراچی

تھا۔ وہ کبھی سامنے نہیں آتا تھا۔ اس نے مجھ سے کبھی براہ راست لین دین نہیں کیا۔ ہمیشہ اس کا کوئی نہ کوئی آدمی پیسے دے کر مال لے جاتا تھا۔ وہ فون پر سودا طے کیا کرتا تھا۔

مجھے یاد آیا کہ آئی لی کے ریکارڈ میں راجا کا نام بہت مشکل سے دریافت ہو سکا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا ”وہ تم سے تو ملتا رہا ہوگا۔“

”بہت کم!“ اس کے جواب نے مجھے جلال کی صداقت کا قائل کر دیا ”بچھلے کئی برسوں میں وہ مشکل سے دو تین بار مجھ سے ملا ہوگا۔ وہ ہماری سوشل ملاقاتیں نہیں جن میں کوئی کاروباری لین دین نہیں ہوا تھا۔“

”اس نے ایک حادثے کے بعد تم کو مشتعل ہندوؤں کے ہاتھوں مرنے سے بھی بچایا تھا۔“

میری زبان سے وہ تذکرہ سن کر اس کی آنکھیں حیرت سے پیشانی پر جا چڑھیں ”یہ پرانی اور راز کی بات ہے۔ تم کو کیسے معلوم ہوئی؟ میرے اور چوڑا کے تعلقات کے بارے میں تمہاری معلومات قابل رشک ہیں۔“

”ہم بلاوجہ کسی کا پیچھا نہیں کرتے۔ وہ راکا آدمی ہے۔ تم اس سے میل جول کی وجہ سے عتاب میں آئے ہو۔ اسے اس کے بل سے نکال لاؤ۔ میں تمہیں فوری آزادی دلا دوں گا۔“ اس بار میں نے فریب دینے کے بجائے پورے خلوص سے پیش کش کی۔

اس نے ناہوسی سے اپنے سر کو جنبش دی ”اس کے لیے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ کسی کی بات نہیں مانتا۔ ویسے بھی تم میری زندگی کا وعدہ کر چکے ہو۔ پتا نہیں میں کب تک معذور پڑا رہوں۔ مجھے امید ہے کہ تم اپنے وعدے کا پاس کرو گے اور میں ایک بار پھر اپنی دنیا میں لوٹنے کے قابل ہو جاؤں گا۔“

”اس سے پہلے تمہاری دنیا کا چوڑا اور آئی مین سے پاک ہونا ضروری ہے۔ وہ دونوں برائی کے تناور درخت ہیں جنہیں کاٹنا ہوگا۔“

”اگر چوڑا واقعی راکا ایجنٹ ہے تو اس کو سزا ملنی چاہیے۔“ راجا بولا ”مگر آئی مین تو بے قصور ہے۔“

کچھ دیر پہلے وہ شی اور آئی مین سے اپنے تعلق کا اعتراف کرنے پر آمادہ نہیں تھا ”اس وقت بے خیالی میں اس کی وکالت کر بیٹھا تھا۔ میں نے اس تضاد پر زور دینا ضروری نہیں سمجھا۔ اس کے اعصاب کی شکستگی کے آثار نمایاں ہو چلے تھے۔ میرے حد سے بڑھے ہوئے دباؤ کی وجہ سے اس کا ندوس بریک ڈاؤن ہو سکتا تھا۔ بہتر یہی تھا کہ میں خصل سے

پکڑا گیا تو سب کچھ اگل دے گا اور اپنے ساتھ ہم دونوں کو بھی مروا دے گا۔ اس نے مجھ سے مدد کی التجا کی اور میں نے اپنے آدمی جوشی پر لگا دیے۔ ہماری توقع کے خلاف ویرا بہت باخبر نکلی۔ اس کے آدمی کل رات جوشی پر چڑھ دوڑے۔ میرے آدمی افرا تفری سے فائدہ اٹھا کر اسے اغوا کر لائے۔ آج منہ اندھیرے تم لوگ آئے تو میں سمجھا کہ ویرا جوشی کی بو سونگھتی ہوئی وہاں تک آگئی۔ میں قانون سے لڑنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ ویرا کے دھوکے میں، میں نے تمہاری گاڑیوں پر پکلی گولی چلا دی۔ میرے کسی آدمی نے غصے میں جوشی کا بھیجا اڑا دیا۔ سب کچھ الٹا ہوتا چلا جا رہا تھا۔ میں خاموشی سے نکل آیا۔“

اس نے اپنی دانست میں ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے جوشی کے قتل کا الزام اپنے سر سے اتار پھینکا تھا۔ مجھے اس ذمے داری کے تعین کی ضرورت نہیں تھی اس لیے میں نے اس نکتے پر کوئی اعتراض کرنے کے بجائے پوچھا ”تم نے ساری کتھاسنا ڈالی۔ یہ نہیں بتایا کہ چوڑا کہاں ہے؟“

وہ چند ثانیوں کے لیے بھیجکا۔ چوڑا اس کا خریدار اور گہرا دوست تھا لیکن اس وقت معاملہ خود اس کی ہٹا تھا۔ اس نے ایک فیصلے پر پہنچ کر زبان کھولی ”وہ اپنے توصل خانے میں رہ رہا ہے۔ میرا اس سے وہیں رابطہ ہوتا ہے۔ تم اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکو گے۔ ویسے بھی اس کا قصور کیا ہے؟“

”وہ پاکستانی ہے مگر راکے لیے کام کرتا ہے۔“ میں نے وہ بری خبر اسے سنائی ڈالی ”اگر وہ تم سے ہیروئن خریدتا تھا تو اسے مفت تقسیم کرتا ہو گا تاکہ یہاں رہنے بسنے والوں کو اجتماعی تباہی کی طرف دھکیل سکے۔ وہ کب تک توصل خانے میں پناہ گزین رہے گا۔ ایک نہ ایک دن وہاں سے نکلے گا اور پھر اس سے حساب لے لیا جائے گا۔“ میں نے چوڑا کے بارے میں بات کرتے ہوئے اپنے حلق میں کچی سی گھٹتی ہوئی محسوس کی تھی۔

”ہو سکتا ہے کہ ایسی نویت آنے سے پہلے اس کا اتاشی اس پر مہمان ہو جائے اور اسے کہیں اور چکی پوسٹنگ مل جائے۔“ راجا بڑبڑایا ”زیادہ سے زیادہ تم اس کے گھر والوں کو پکڑو لو گے اور تنگ کرو گے۔ وہ بہت چالاک آدمی ہے، بچ نکلے گا۔“

”تم اس سے کم چالاک نہیں تھے۔ سب کی نظروں سے پوشیدہ رہ کر ہیروئن کا دھندا کر رہے تھے مگر آج ہمارے قبضے میں ہو۔“ اول خان نے زبان کھولی۔

”میں اپنے کام کی وجہ سے کھل کر سامنے آنے پر مجبور

کام لے کر دھیرے دھیرے اس سے اپنے کام کی باتیں اگلاتا چلا جاتا۔

”تمہارے پاس آئی مین کی بے گناہی کا کیا ثبوت ہے؟“

میں نے اس سے ایک آسان سا سوال پوچھا۔

”میرے پاس اس کی کئی ہوئی باتوں اور اس کی دریا دلی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے“ آئی مین کے بارے میں اس کی مزاحمت دم توڑ چکی تھی۔

”اس خبیث کے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟“ اس بار میں نے قدرے تیزی سے سوال کیا۔

”میں حقیقت میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ میں نے آج تک اس کی صورت بھی نہیں دیکھی۔ ہر بار وہ مجھے خود فون کرتا ہے اور بحث کے ساتھ ٹارگٹ دیتا ہے۔ رقم حیرت ناک ذرائع سے مجھ تک پہنچ جاتی ہے اور میں اس کا ٹارگٹ پورا

کر دیتا ہوں۔ اس کے تعاون سے میرے کام نے بہت تیزی سے ترقی کی ہے“ انجانشن سے اس کے بڑھتے ہوئے دردمیں خاصا اضافہ ہوا تھا اور وہ قدرے سکون سے باتیں کر رہا تھا۔

”اس کے ٹارگٹ کیا ہوتے ہیں؟“ میں نے مجس لہجے میں پوچھا۔

”ہر مہینے وہ مجھے دس ہزار روپے کلو کے حساب سے ایک بڑی رقم دیتا ہے۔ میں کھپت کے مطابق اتنا خاص مال

مارکیٹ میں پھیلا دیتا ہوں۔ میرے بھاء دوسروں سے دس ہزار کم ہوتے ہیں جو مجھے اس سے پیشگی مل جاتے ہیں۔ ہر شخص میرے مال کی تلاش میں رہتا ہے۔“

میرے ذہن کے پرانے درتچے کھل گئے اور شی کی یادیں تازہ ہو گئیں۔ ہم نے ابتدا میں ہیروئن کی پڑاؤ مفت تقسیم

کی تھیں تاکہ نشے بازوں کو ہیروئن کے نئے نشے کی لت لگ سکے پھر ہم نے منگی ہیروئن خرید کر سستے داموں بازار میں

پھیلانی شروع کر دی۔ جب شہر میں ہر طرف ہیروئن کے نام کا ڈنکا بجنے لگا تو دام بڑھتے بڑھتے لقمہ بخش حدوں میں داخل

ہو گئے۔ اس وقت شی کا مقصد صرف یہ تھا کہ پاکستان اور افغانستان کے سرحدی علاقوں میں تیار ہونے والی زیادہ سے

زیادہ ہیروئن پاکستان کے بڑے شہروں میں کھپتی رہے تاکہ یورپ اور امریکا بھیجی جانے والی ہیروئن کی مقدار میں معتد بہ

حکم آ سکے۔

وقت بدل گیا تھا اگر شی کا ہدف نہیں بدلاتھا۔ شہر کی کسی معزز آبادی میں چسپا ہوا نیا آئی مین امریکی سرکار کے فنڈز سے

سرمایہ کاری کر کے کراچی میں ہیروئن کے تھوک دام میں دس ہزار روپے کی کلگرام کی کمی لچکا تھا۔

اطمینان

صاحبزادے نے اپنی دوست کے ساتھ ڈرائیون

سینا جانے کے لیے والد صاحب سے کاری چاہیاں مانگیں۔ اس شام بہت دھند پھیلی ہوئی تھی۔

”اس دھند میں تم ڈرائیون میں فلم دیکھنے جاؤ گے؟“ والد نے حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔

”فلم تو ہماری دیکھی ہوئی ہے۔“ صاحب زادے نے روانی میں جواب دیا۔

ہیروئن کی قیمت میں اس کی کا مقصد یقینی طور پر اس کی مقامی کھپت میں اضافہ کرنا تھا تاکہ پاکستانی فوجوانوں کی قیمت پر مغرب کے بے راہ روشناردوں کو ہیروئن کی تباہیوں سے محفوظ رکھا جاسکے۔

میں نے اس سے کہا ”کیا تم نے کبھی یہ سوچنے کی زحمت کی ہے کہ تمہارا آئی مین اپنی گرہ سے لاکھوں روپے کی سرمایہ

کاری کر کے کراچی میں ہیروئن کے دام گرانے کی کوششیں کر رہا ہے تاکہ یہ نشہ نادر طبقے کی دسترس میں بھی آ سکے۔“

”مجھے سوچنے کی ضرورت نہیں ہے“ اس نے آہستگی سے جواب دیا ”یہ بات تو وہ خود مجھ سے کہہ چکا ہے کہ اسے

پاکستان اور یہاں کے نادر نشے بازوں سے ٹوٹ کر محبت ہے۔ اگر اس کے وسائل اجازت دیں اور اس کا بس چلے تو

وہ یہاں ہر ہیروینچی کے لیے ہیروئن کی مفت ترسیل کا بندوبست کر دے۔ وہ بہت نرم دل اور دھکی انسان ہے۔ اس کے حالات سے واقف ہونے کے بعد یہ بات سمجھ میں آئی

ہے کہ وہ یہ سب کیوں کر رہا ہے۔“

مجھے راجا کی کم عقلی پر غصہ آ گیا۔ سامنے کا ایک سازشی نکتہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ پوری بات جان لینے کے

بعد بھی وہ اپنے آئی مین کی وکالت سے دستبردار نہیں ہوا تھا۔ میں نے ترش لہجے میں کہا ”اس نے ایسی کون سی کمائی

سنائی ہے جس نے تمہاری عقل پر پردے ڈال دیے ہیں۔“

”میری بات مان لو کہ وہ بہت دھکی انسان ہے“ راجا نے اصرار کیا ”وہ ہیروئن کے ہاتھوں اپنی دو جوان اولادوں کو

کھو بیٹھا ہے۔ بڑی بیٹی نے ہیروئن کے سرور میں آکر اپنے سونے ہوئے محبوب کا لگا تیز استرے سے کاٹ ڈالا اور جیل

کھیل بنایا ہوا ہے۔ تم کو معلوم ہے کہ اسلام میں مرتد ہونے والے کی سزا کیا ہے؟“ میں نے پیش میں کہا۔

”مجھے معلوم ہے کہ مسلمان مرتد ہونے والے کو مار دیتے ہیں اسی لیے میں نے دوبارہ عیسائی ہونے کا اعلان نہیں کیا۔“

”مجھے اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ اس وقت تمہارا مذہب کیا ہے۔ مجھے آئی مین کا فون نمبر چاہیے ورنہ تمہارا حلیہ بگاڑ دیا جائے گا۔“

”مجھے دھمکیاں دے کر تم بد عمدی کر رہے ہو۔ تم مجھے زندہ رکھنے کا وعدہ کر چکے ہو۔“

”میرا وعدہ مشروط تھا۔ تعاون کرو گے تو زندہ رہو گے ورنہ مار دیے جاؤ گے۔“

”تمہاری زندگی کسی مردے سے بدتر بھی ہو سکتی ہے۔“ ویرا نے کافی دیر بعد پہلی بار زبان کھولی ”تم میری قوت کا مظاہرہ دیکھ چکے ہو۔ ہم تم پر کوئی ہتھیار اٹھائے بغیر تمہارا حلیہ بگاڑ سکتے ہیں۔“

”آئی مین کو اپنے مقاصد کے حصول سے دلچسپی ہے۔“ اسے خاموش پاکر میں نے لقمہ دیا۔ میں اس سے مزید کچھ کام لینے کا فیصلہ کر چکا تھا اس لیے اس وقت راجا برتنند شروع نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔ میں نے اپنی بات جاری رکھی ”اس کو تم سے یا تمہاری زندگی سے ذرا برا بردہ چسپی نہیں ہے۔ جیسے ہی اسے یہ معلوم ہوا کہ آج کل تمہارے ستارے گردش میں آئے ہوئے ہیں، اس نے تم کو خود سے دور رہنے اور فون نہ کرنے کا حکم دے ڈالا۔“

”تم نے کسی طرح میری اور اس کی گفتگو سن لی ہے تو یہ اندازہ بھی لگایا ہو گا کہ میں اس سے انحراف نہیں کروں گا۔ مجھے مجبور نہ کرو۔“ وہ بولا۔

اس کا لہجہ نرم تھا۔ لوہا گرم ہو چکا تھا۔ میں نے اگلی چوٹ لگائی ”اس وقت تم ہماری تحویل میں ہو۔ اس کے فرشتے بھی تم تک نہیں پہنچ سکتے۔ مگر ہم تمہاری شہ رگ کے قریب ہیں۔ تمہارے ساتھ جو سلوک چاہیں کر سکتے ہیں۔“

”یہ لاٹوں کا بھوت ہے۔ باتوں سے نہیں مانے گا۔“ یہ کہہ کر ویرا دانت پیستی ہوئی آگے بڑھی اور میرے روکنے سے پہلے اس نے راجا کے منہ پر ایک زوردار گھونسا رسید کر دیا۔ گھونسے سے بچنے کے لیے اس نے اضطرابی طور پر اپنے بدن کو جھٹکا تو اس کی زخمی پنڈلی پر زور پڑا اور بے اختیار اس کی ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

راجا سے میری صبر آزما اور طویل باز پرس اور پھر اس

میں پہنچ گئی۔ وہاں مقدمے کی سماعت کے دوران میں وہ ہیروئن نہ ملنے کے سبب تڑپ تڑپ کر مر گئی۔ دوسرا بیٹا بھی ہیروئن نے برباد کر دیا۔ وہ ہیروئن جی لڑکیوں کی ایک ٹولی کے ساتھ ایسا غائب ہوا ہے کہ پانچ سال سے اس کی کوئی خبر نہیں مل سکی۔ ان دونوں زخموں نے اسے اندر سے زخمی کر کے رکھ دیا ہے اور وہ ہر ہیروئن جی کے لیے اپنے دل میں درد محسوس کرنے لگا ہے۔“

”یہ کہانی سرا سر جھوٹ اور بے قیاس ہے۔“ میں نے جھٹاکر اسے ڈانٹا ”تم نے اس سے یہ نہیں پوچھا کہ اس کی محبت کے لیے کیا امریکا میں ہیروئن بیچوں کا قحط ہے جو وہ دوڑا ہوا پاکستان چلا آیا ہے۔ امریکا میں ایسے امدادی پروگرام چلا کر وہ ایک دن اپنا کھویا ہوا بیٹا بھی تلاش کر سکتا تھا۔“

راجا لا جواب ہو گیا مگر بات بڑھانے کے لیے چند ثانوں کے بعد بولا ”تم اس پر یقین کیوں نہیں کر لیتے۔ اس سے ایسی باتیں کرنا سنگ دلی کے برابر ہے۔ اس کی باتیں بہت اثر انگیز تھیں جنہوں نے مجھے دل گرفتہ کر دیا۔ شاید میں تمہیں اتنے موثر انداز میں یہ سب باتیں نہیں بتا سکا۔“

”وہ جھوٹا ہے۔ یہ کہانیاں ان لوگوں پر اثر انداز ہو سکتی ہیں جو شی کو نہیں جانتے۔ وہ لوگ پاکستانی کی بتائی کے درپے ہیں۔ امریکا کے سیکرٹ صدارتی فٹز سے شی کو بھاری مالی مدد ملتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ گرانٹ دوبارہ جاری ہو گئی ہے۔ آئی مین اس گرانٹ کا ایک قلیل حصہ یہاں خرچ کر رہا ہے اور باقی رقم خود پی جاتا ہے۔“

”تم اس کی طرف سے بدظن ہو۔ میں تم سے بحث نہیں کروں گا۔“ اس نے ہتھیار ڈال دیے۔

”تم مجھے اس کا فون نمبر دو۔ میں تمہیں جلد ہی اس کا اصل چہرہ دکھا دوں گا۔“

”فون نمبر میں کسی قیمت پر نہیں دے سکتا۔“ اس نے تکیے پر اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا ”میں نے اس سے حلف لیا ہوا ہے کہ میں اس کا نمبر کسی کو نہیں دوں گا۔“

”تم جھوٹے ہو۔“ اسے اکھڑتا ہوا دیکھ کر میں اس پر برس پڑا ”ایک مسلمان اور عیسائی کے درمیان حلف کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ تم ایک سیانے مجرم ہو۔ تم نے اس سے سامنا ہونے بغیر اس سے سچا حلف نہیں لیا ہو گا۔“

”میری جان پر بی ہوئی ہے۔ میں تم سے جھوٹ نہیں بول رہا۔ میں مسلمان ضرور تھا تھا مگر اب اپنے عقائد سے تائب ہو کر دوبارہ عیسائی ہو چکا ہوں۔“

”خوب! تم نے اپنے مفادات کے لیے مذہب کو بھی

میزنی وارڈ کے باہر ایک صاحب بے تابی سے
ٹہل رہے تھے اور سگریٹ پر سگریٹ چھونک رہے
تھے۔ آخر لیڈی ڈاکٹر باہر آئی اور ان صاحب کو بتایا
”آپ ایک خوبصورت اور صحت مند بچے کے باپ بن
گئے ہیں۔“

ان صاحب نے گہرا سانس لے کر شکر یہ ادا کیا
اور وہاں سے رخصت ہونے لگے تو ڈاکٹر نے انہیں
واپس بلایا اور حیرت سے پوچھا ”کیا آپ خوشی کے اس
موقع پر اپنی بیوی سے دو چار باتیں نہیں کریں گے؟“
”جی نہیں...“ وہ صاحب رکھائی سے بولے
”بچھلے دو سال سے اپنی بیوی سے میری بول چال بند
ہے۔“

”بول چال بند ہے اور آپ بچے کے باپ بن
گئے؟“ لیڈی ڈاکٹر نے حیرت سے آنکھیں پھاڑتے
ہوئے کہا۔

وہ صاحب گویا برا منا کر بولے ”اس میں اتنی
حیرت کی کیا بات ہے؟ اب اتنی بھی ناراضگی نہیں
ہے۔“

اٹھانے کی ضرورت پیش نہ آتی۔“ ویرانے راجا سے رسمی سی
معذرت کی۔

”ہاتھ ڈھیلا پڑے تو تمہارے ہاتھ سے پٹنے میں بھی مزہ
آئے گا۔“ راجا نے ہم دونوں کی موجودگی کی پروا کیے بغیر
ڈھٹائی سے جواب دیا ”مگر تم بہت سفاک ہو۔ ذرا سی دیر میں
تم نے مجھ پر دو بار ہاتھ اٹھا کر اپنی خوب صورتی کو داغ دار
کر لیا۔ اب مجھے تم سے خوف آرہا ہے۔“

”تمہیں خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اب میں
تمہارے پاس نہیں آؤں گی۔“ میں کمرے سے باہر نکل رہا تھا
تو میرے کانوں میں ویرا کی آواز آئی۔

”ارے ڈارلنگ! ایسا غضب نہ کرنا۔“ اس بار راجا کی

کی جہت دھرمی سے ویرا ایک اشتعال میں آگئی تھی اور اسے
بری طرح رگید ڈالنا چاہتی تھی لیکن اس مرحلے پر راجا کے
ساتھ تشدد آمیز سلوک میری حکمت عملی سے متصادم تھا اس
لیے میں نے زبردستی اسے اپنے بازوؤں میں دبوچ کر راجا سے
دور ہٹا دیا۔

”میں اپنی بابت کوئی وعدہ کر سکتا ہوں لیکن روزی جیسے
اور لوگ بھی موجود ہیں۔ مجھے پتا نہیں کہ وہ تم سے کیا سلوک
کریں گے۔“ ویرا کو دور لے جانے کے بعد میں نے راجا کو
سمجھانے کی کوشش کی ”تم ہم سے بھرپور تعاون کر کے ہماری
ہمدردیاں جیت سکتے ہو۔“

”یہ نہ سمجھنا کہ تمہاری خاموشی سے آئی مین بچ جائے
گا۔“ اول خان نے تادیبی لہجے میں کہا ”موبا نل فون کی بلنگ
نمبروں کے ساتھ ہوتی ہے۔ ذرا سی کوشش کر کے میں
موبا نل فون کمپنی سے تمہارا ملایا ہوا نمبر معلوم کر سکتا
ہوں۔“

اول خان کی مضبوط دلیل سب سے زیادہ کارگر رہی اور
وہ سوچ میں پڑ گیا۔

ہم تینوں میں سے کسی نے اسے ٹوکنے کی ضرورت
محسوس نہیں کی۔ ہم اس کی لب کشائی کے منتظر تھے۔

”تم اس کے نمبر کا کہیں سے بھی سراغ لگاؤ وہ یہی سمجھے
گا کہ میں نے تمہیں فون نمبر دیا ہے۔“ آخر کار راجا نے گہرا
سانس لے کر تھکی ہوئی آواز میں اپنی زبان کھولی ”تمہیں مجھ
کو اس کی دسترس سے بچانا ہوگا۔“

”یہ ہماری بھی ضرورت ہے۔ تمہیں بچائے بغیر ہم اس
کی سرکوبی نہیں کر سکیں گے۔“ میں نے زور دے کر کہا۔

”میں سرکاری اسپتال نہیں جاؤں گا۔ صحت یابی تک تم
مجھے اسی اسپتال میں رکھو گے۔“ اس نے اپنا مطالبہ پیش
کر دیا۔

اس احمق کو علم نہیں تھا کہ وہ فیلڈ اسپتال اس کے لیے
ایک قید خانہ تھا اور ہم اس کی ذات سے تعلق رکھنے والے
لوگوں کا صفایا کیے بغیر اسے چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لیں
گے۔ میں نے نرمی سے جواب دیا ”ہم تمہاری اس خواہش کا
بھی احترام کریں گے۔“

اس نے شکست خوردہ انداز میں ”رک رک کر آئی مین
کا فون نمبر بتا دو جو ویرا نے فوری طور پر ایک کانڈ پر نوٹ
کر لیا۔ اس نمبر کے ابتدائی تین ہندسوں سے میں نے اندازہ
لگایا کہ آئی مین ڈینٹس یا کانڈیشن کے علاقے میں روپوش تھا۔
”تم پہلے ہی راہ راست پر آگئے ہوتے تو مجھے تم پر ہاتھ

باتیں کرنے میں مصروف تھا۔

”یہ بات صحیح ہے کہ زندہ رہ کر وہ عمر بھر دنیا کی تضحیک کا نشانہ بنا رہے گا مگر اس سے ہم کو کیا فائدہ ہوگا۔“ بات جہاں ختم ہوئی تھی، ویرانے وہیں سے شروع کر دی۔

”آئی مین سے بیٹنے کے لیے ہمیں راجا کی مدد کی ضرورت نہیں پڑے گی مگر چوڑا کو اس کے بل سے نکالنے کے لیے ہمیں اس کو استعمال کرنا پڑے گا۔ تم نے سنا نہیں کہ چوڑا اپنی جان کے خوف سے اپنے فوٹسل خانے میں روپوش ہے اور اپنے اتاشی کے ذریعے پاکستان سے باہر تبادلے کی کوششیں کر رہا ہے۔“

”اوہ!“ ویرا ایک گھرا سانس لے کر بولی ”یہ بات میں بھول ہی گئی تھی۔ چوڑا آسانی سے باہر نہیں آئے گا۔ اسے راجا کے ذریعے پھانسا ہوگا۔“

وہ بعد کی بات تھی۔ اس وقت دو باتیں فوری توجہ کی متقاضی تھیں۔ اول یہ کہ موبائل فون کمپنی سے یہ تصدیق کی جاتی کہ اول خان کے موبائل سے آخری فون کال اسی نمبر پر کی گئی تھی جو راجا نے ویرا کو لکھوایا تھا۔ اگر وہ تصدیق ہو جاتی تو پھر اس نمبر کے ذریعے آئی مین کی کیمین گاہ کا سراغ لگانا تھا تاکہ وہاں بھرپور کارروائی کا آغاز کیا جاتا۔

ہماری بے ترتیبی سے پھیل ہوئی بساط کے دو اہم مہرے آخر کار قابو میں آئے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ دیکھنا یہ تھا کہ پاکستان میں شی کے احباب کے پیچھے کیا مقاصد کار فرما تھے۔ یہ میرے تجربے کی بات تھی کہ پاکستان میں جب شی پورے زور و شور سے کام کر رہی تھی تو امریکی خفیہ ایجنسیوں نے اس خطے کو فراموش کیا ہوا تھا۔ شی کے زوال کی ساتھ پاکستان سی آئی اے کی ریشہ دوانیوں کا مرکز بن گیا تھا۔ انہوں نے پے در پے چوٹیں کھانے اور اپنے کئی اہم آدمی

گنوائے کے بعد پسائی اختیار کرنے اور شی کو دوبارہ میدان میں اتارنے کا فیصلہ کر لیا تھا تو وہ کوئی بڑی سازش ہو سکتی تھی جس کا سدباب کرنا ضروری تھا۔

اس وقت چوڑا اور آئی مین ہماری توجہ کا مرکز بنے ہوئے تھے تو حلال کی نظرس بھارت سے آئے ہوئے وٹوڈر مرکز تھیں جو عبداللہ کا قاتل تھا۔

اول خان نے اپنی ڈائری دیکھی اور موبائل فون کمپنی کا متعلقہ نمبر لانے میں مصروف ہو گیا۔

بے تابانہ آواز سنائی دی ”میں تو مذاق کر رہا تھا۔ تمہاری تیمار داری سے میری صحت یابی کی رفتار تیز ہو جائے گی۔“

”آئندہ تم نے غصہ دلایا تو میں تمہاری دوسری پنڈلی بھی توڑ دوں گی۔“ ویرا نے ہنس کر اسے سفائی سے جواب دیا اور تیزی سے ہمارے پیچھے آگئی۔

اول خان نے اپنے دونوں آدمیوں کو راجا کی دیکھ بھال کے بارے میں سرسری ہدایات دیں اور ہم وہاں سے نکل کر اول خان کے دفتری طرف چل دیے۔

”کیا بات ہے۔ وہ تم سے بیٹ کر بھی تمہارا گرویدہ ہے۔“ میں نے راستے میں ویرا سے پوچھا۔

”جو تے پڑیں گے تو اس کی طبیعت صاف ہو جائے گی۔“ ویرا نے فخت آمیز ہنسی کے ساتھ وضاحت کی ”ابا ش صفت مرد قبر میں پیر لٹکاے بیٹھا ہو تو تب بھی ہر خوب صورت عورت کو اپنا کھلونا بنانے پر تیار رہتا ہے۔ راجا

ان ہی بد فطرت لوگوں میں سے معلوم ہوتا ہے۔“

”اس کے ساتھ تمہارا رویہ بھی ناقابلِ فہم تھا۔“ اول خان نے مجھ سے کہا ”آخر میں مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے

تمہارے دل میں اس کے لیے کوئی نرم گوشہ پیدا ہو گیا ہو۔“

”اس ملک کے کسی غدار کے لیے میرے دل میں نرم گوشہ پیدا نہیں ہو سکتا۔“ میں نے پر عزم لہجے میں جواب دیا

”اسے قانونِ قدرت کے تحت اپنی بد عملی کی کڑی سزا مل چکی ہے۔ ہم اس کی ٹوٹی ہوئی پنڈلی کی کوئی سرجری نہیں کرائیں گے۔ ہڈیاں جہاں ہیں وہیں جڑ جائیں گی اور وہ ساری عمر اس

عذاب سے گزرنا رہے گا۔ وہ کبھی تن کر اپنے دونوں بیروں پر فاخترانہ چال نہیں چل سکے گا۔“

”پہلے تم نے اس کے خاتمے کا فیصلہ کیا تھا۔“ ویرا نے دبے لہجے میں مجھے یاد دلایا۔

”مگر پھر یہ بھی کہا تھا کہ ہم اسے زندہ رکھ کر اس کی زندگی کو دو سروں کے لیے عبرت کا نمونہ بنا دیں گے۔“

”موت ہر گناہ پر نتیج کی لکیر کھینچ دیتی ہے اور لوگ بہت جلد سب کچھ بھول جاتے ہیں۔“ اول خان نے میری تائید کی

”چھوٹی بڑی ناگوں پر اچھل اچھل کر چلتا ہوا راجا ہر ایک کے لیے عبرت کا ذریعہ بنا رہے گا۔ اس کی نیم معذوری اس کی موت سے بہتر ہوگی۔“

ہم دوبارہ اول خان کے دفتر میں پہنچ گئے۔ اس نے اپنی کرسی سنبھالتے ہی سب سے پہلے ایف ایم ریسور آف کیا

جس پر راجا کے کمرے میں ابھرنے والی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ راجا اس وقت اپنی دیکھ بھال کرنے والوں سے

انسانیت کے دشمنوں کے خلاف جاری اس جنگ کے باقی واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیے

یہ تھی کہ وہ میری طرف سے چندن کو بھیجے گئے فیکس کو آف دی ریکارڈ رکھنا چاہتے تھے۔ کراچی میں میری موجودگی ثابت کرنے کے لیے فیکس کو منظر عام پر لاتے تو پاکستان میں ان کے سیاہ کروٹوں کا بھانڈا پھوٹ جاتا۔ فیکس کو خفیہ رکھ کر وہ اپنے طور پر کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

اپنی اس مجبوری کی بنا پر بھارتیوں نے پہلے جان الیش کوف اور اس کے فرار کے بعد لیری ہف کو درمیان میں ڈالا تھا۔ لیری کی موت سے مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہمارا شاندار دشمن اچانک پیچھے ہٹا ہوا ہو۔ پہلے ہم را اور سی آئی اے کے عالمی شہرت یافتہ ایجنٹوں کے خلاف صف آرا تھے۔ اس وقت ہمارا مقابلہ جوشی اور راجا جیسے تیسرے درجے کے مقامی مجرموں سے ہو رہا تھا۔

اس امر میں کوئی کلام نہیں تھا کہ وہ مجرم بھی را کے مقامی رابطوں میں اہم مقام رکھتے تھے لیکن ان دونوں ناموں کے سامنے آنے کے بعد را یا ایک پس پشت چلی گئی تھی۔ میرے دل میں یہ خلش پھانسن بن کر چبھ رہی تھی کہ محض مصروف رہنے کے لیے ہم اپنے معیار سے بہت نیچے آگئے تھے۔

اول خان کی میز پر رکھے ہوئے ایف ایم ہائیڈر راجا اور نامعلوم غیر ملکی کے درمیان ہونے والی گفتگو میں آئی مین کا نام سن کر میں بری طرح چونکا تھا۔ اس وقت مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ ہم اپنے معیار سے گرا ہوا کوئی کھیل نہیں کھیل رہے تھے۔ جوشی کی ذات ہماری کسی بڑی کامیابی کا پہلا زینہ بننے والی تھی۔ جوشی کی بوسٹ کھینچے ہوئے ہم راجا کے خطرناک ٹھکانے تک پہنچے تھے اور اس مکار اعظم کو اپنے دام میں الجھانے کے بعد جوشی کے کسی نامعلوم آئی مین کا نام ہمارے علم میں آیا تھا۔

اول خان جتنی دیر فون پر موبائل فون کمپنی کے کسی ذمے دار شخص سے گفتگو کرتا رہا، میرا ذہن ان ہی باتوں میں الجھا رہا۔ اول خان کو اپنا پرسل آئڈنٹی ٹیکنیشن نمبر اپن کوڈ یاد نہیں رہا تھا اس لیے اسے فون پر اپنی شناخت میں قدرے دشواری ہوئی پھر اسے دوسری طرف سے وہ نمبر بتا دیا جس پر اس کے موبائل فون سے آخری کال کی گئی تھی۔ اول خان نے وہ نمبر بیڈ پر نوٹ کر کے دہرایا۔ نمبر کی تصدیق ہونے پر

اس نے شکریے کے ساتھ فون بند کر دیا۔
”یہ ہے تمہارے نئے آئی مین کا نمبر!“ اول خان نے پیڈ میرے سامنے ڈال دیا۔

راجا کا بتایا ہوا نمبر میرے ذہن میں محفوظ تھا۔ میں نے پیڈ پر ایک نگاہ ڈال کر اندازہ لگایا کہ راجا نے ہم سے غلط بیانی نہیں کی تھی۔ ہر طرف سے بری طرح گھر جانے کے بعد اس کے مضبوط اعصاب جواب دے گئے تھے۔ اس نے ہمارے سامنے شکست تسلیم کر لی تھی۔
”کیا تم اس نمبر پر کوئی وظیفہ پڑھ رہے ہو؟“ ویرا نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”تم ہر وقت بے مقصد باتیں کرنے پر تلی رہتی ہو۔“ میں نے خشک لہجے میں اسے لتاڑنا چاہا لیکن اس نے میری بات کاٹ دی۔

”یہ بے مقصد بات نہیں ہے۔ امریکا میں مشرقی عملیات کا بہت شہرہ ہے۔ تمہاری پیڈ پر بھی ہوئی نظروں سے شبہ ہو رہا تھا کہ تمہارے عمل کے زور سے کسی بھی لمحے وہ گنمان آئی مین پیڈ پھاڑ کر باہر نکل آئے گا۔“ ویرا کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔

میں نے ویرا کے منہ لگنا مناسب نہیں سمجھا اور اول خان سے مخاطب ہو گیا۔ ”نمبر کی تصدیق ہو گئی ہے۔ چاہو تو تم فون کرو۔“

”نہیں۔“ اول خان نے بے ساختہ جواب دیا ”یہ ٹیڑھا کام تم ہی کو مبارک ہو۔ مجھے شی اور اس کے بیڑوں کے بارے میں بہت زیادہ معلومات نہیں ہیں۔ میں زیادہ دیر تک بات نہیں سن سکا۔“

”تم ہی بہتر رہو گے۔“ ویرا نے برجستہ اس کی تائید کی ”وہ کراچی میں ہے۔ میری آواز سننے ہی مجھے پہچان لے گا۔“
”وہ مردانہ آواز سن کر مجھے بھی پہچان لے گا۔“

”اس کا انحصار اس بات پر ہو گا کہ تم اس سے کس حیثیت میں بات کرتے ہو۔“ اول خان نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

اول خان نے واقعی ایک اہم نکتے کی نشاندہی کی تھی۔ راجا کے آئی مین کا ذکر سننے ہی میرے ذہن میں نہ جانے کیوں یہ خیال سا گیا تھا کہ مجھے اس سے دوسرا آئی مین بن کر بات

سپیس ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔
تمام اشتہارات نیک بیٹی کی بنیاد پر شائع کئے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں ادارہ کسی بھی طرح ذمے دار نہ ہوگا۔



”تمہارے لیے ایک فون دو ٹکے کی چیز ہے۔ اپنے دفتر کے لیے کیوں نہیں منگوا لیتے؟“ ویرا نے تیوریوں میں بل ڈال کر سوال کیا۔

”میں اس کی کوئی افادیت نہیں سمجھتی۔ یہ چھانڈنی کا علاقہ ہے۔ ہر وقت کہیں نہ کہیں چاند ماری ہو رہی ہے۔“ اول خان نے وضاحت کی ”پس منظر سے آنے والی شوٹنگ کی آوازیں سن کر فون پر ہر ایک اندازہ لگا سکتا ہے کہ فون کیسے علاقے سے کیا جا رہا ہوگا۔ دوسری اور زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ہماری اکلونی سی ایس ڈی تمہارے گھر کے فون کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ اب اس کے بغیر رازداری کا پورا یقین نہیں ہوتا۔“

میں نے وہاں سے روانگی کا فیصلہ سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ راجا پوری طرح ہمارے قابو میں آچکا تھا اور غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ وہ کسی پرائیویٹ اسپتال کے کمرے میں زیر علاج تھا۔ اول خان کے ماتحت بہت سمجھ دار تھے۔ وہ جانتے تھے کہ روزی کی واپسی کے بعد انہیں قیدی کی نرسنگ کی ضروریات کس طرح پوری کرنی تھیں۔ آئی مین اور چوڑا کے بارے میں کوئی فیصلہ ہونے تک اسے بہتر تک محدود رہ کر اپنا وقت گزارنا تھا۔ اس کے لیے ہم میں سے کسی کا وہاں موجود رہنا ضروری نہیں تھا۔

اول خان نے کھڑے کھڑے اپنے فیلڈ فون پر اپنے کسی ماتحت کو اپنی روانگی سے آگاہ کر کے فون بند کر دیا۔ میرے اندازے کے عین مطابق اسے راجا کے بارے میں ایک لفظ بھی کہنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔

اسٹیشن فور سے واپسی پر ہمارے پاس دو گاڑیاں تھیں۔ میں گھر سے ویرا کو ساتھ لے کر اپنی گاڑی سے وہاں پہنچا تھا۔ اول خان اسپتال سے راجا کو لے کر سیدھا وہاں پہنچا تھا۔ میں نے اخلاقاؤ پر اکو اول خان کے ساتھ روانہ کر دیا اور خود ان کے پیچھے ہولیا۔

اسٹیشن فور سے واپسی کے اس سفر میں ہماری ٹیم بکھر گئی اور مذاکرات ادھر سے رہ گئے مگر میرا ذہن مسلسل کام کر رہا۔ راستہ زیادہ طویل نہیں تھا۔ ہم تھوڑی دیر میں گھر پہنچ گئے۔ وہاں غزالہ اور سلطان شاہ اپنے سینوں میں تجسس کا ایک سمندر لیے ہمارے منتظر تھے۔

میرا یہ ارادہ خاک میں مل گیا کہ ہم گھر پہنچتے ہی سرجوڈ کر جلد از جلد کسی نتیجے پر پہنچ جائیں گے۔ غزالہ بہت سنجیدہ اور بردبار تھی۔ وہ موقع کی نزاکت اور اس سے بھی بڑھ کر میرے تیوروں کو سمجھتی تھی۔ شی کے کسی آئی مین سے راجا

کرتی چاہیے۔ ایسی صورت میں اس کے لیے یہ سمجھنا دشوار نہ ہو تاکہ اس کے مخاطب کا نام ڈینی ہے۔ شی سے میری بغاوت کے بعد جی لائیڈ سے لے کر ہر چھوٹے بڑے کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ میرے ہاتھوں شی کے دو آئی مین مارے جا چکے تھے اور ان کی سلور آئیز میرے قبضے میں آچکی تھیں۔

جی لائیڈ۔۔۔ شی کا سربراہ تھا۔ یہ بات پوری طرح اس کے علم میں آچکی تھی کہ میں نے سلور آئیز پر قابض ہونے کے بعد ان کی مدد سے شی کے کئی شر ذوروں کو اپنی اطاعت پر مجبور کر کے ان کی گردنیں اڑا دی تھیں۔ اس نے پوری قوت کے ساتھ مجھے اپنے راستے سے ہٹانے کی کوششیں کیں لیکن محض میرے ناجائز تصرف کی وجہ سے سلور آئیز کی مقتدر حیثیت کو مجروح نہیں کیا۔ میرے ہاتھوں پے در پے ہماری نقصانات اٹھانے کے باوجود، دنیا بھر میں سلور آئی کو طاقت اور دبدبے کے علامتی سکے کے طور پر رائج رکھا تاکہ شی کی ساکھ کو کسی طرح کوئی نقصان نہ پہنچے۔

یہ جی لائیڈ ہی پالیسی کا تسلسل تھا کہ اس کی موت کے ایک طویل عرصے بعد پاکستان میں کوئی نیا آئی مین آن موجود ہوا تھا۔ اگر وہ خود آئی مین ہونے کا دعوے دار تھا تو اس کے پاس سلور آئی کا موجود ہونا ضروری تھا۔

ہمیں اس سے رابطے کا نمبر مل چکا تھا مگر وہ معاملہ اتنا سیدھا نہیں تھا۔ پوری حکمت عملی طے کیے بغیر اس سے رابطہ کرنا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔

”تم سوچ میں پڑ گئے۔“ مجھے خاموش پا کر اول خان نے ٹوکا ”اگر تم اس سے بات کرنے سے انچکا رہے ہو تو میں کر لوں گا۔“

میں آہستگی سے ہنس پڑا ”میرے پاس کئی راستے ہیں۔ میں اس سے اپنی اصل حیثیت میں بات کروں یا کوئی اجنبی نام اختیار کروں۔ یہ سوال مجھے تنگ کر رہا ہے۔“

”آج کل تو ویسے بھی تمہارے چار نام چل رہے ہیں۔“ اول خان نے مذاق میں کہا۔

”ڈینی، منظر، ماجد یحییٰ اور کرل داؤر ہونے کے ساتھ ساتھ تم آئی مین بھی ہو کیونکہ ایک سلور آئی آج بھی تمہارے قبضے میں ہے۔“ ویرا نے لقمہ دیا۔

”بات لمبی ہو جائے گی۔“ میں نے اپنی جگہ چھوڑ دی

”کیونکہ راستے میں اور گھر پہنچ کر یہ سب طے کر لیا جائے۔“ ”میں خود بھی یہی چاہ رہا تھا۔“ اول خان نے خوش ہو کر کہا ”گھر کے ایک فون پر ہم سب سکون سے تمہاری اور اس کی باتیں سن سکیں گے۔“

مشہور مصنفین کی مشہور کتابیں

روشنی کے مینار

قیمت -/150 روپے ڈائجسٹ -/25 روپے

اسلام کے خاموش مغفوں
اربابیہ کرام کے دلچسپ
اور مثر واقعات
ضیاء نسیم گلگامی کے قلم سے

عظمت کے مینار

قیمت -/150 روپے ڈائجسٹ -/25 روپے

ضیاء نسیم بلگرامی
کے مضامین
کا دوسرا مجموعہ

ایمان کا سفر

قیمت -/150 روپے ڈائجسٹ -/25 روپے

محمد الہ دین نواب کی
امام شافعی کی کتابوں کا مجموعہ
وہ فن پارے
جن کی آپ کو تلاش ہے۔

پچرا گھر

قیمت -/100 روپے ڈائجسٹ -/25 روپے

محمد الہ دین نواب کی
کتابوں کا دوسرا مجموعہ
جسے آپ آنکھوں سے نہیں
دل سے پڑھیں گے۔

آدھا چہرہ

قیمت -/250 روپے ڈائجسٹ -/25 روپے

محمد الہ دین نواب کی پہلا طویل
معاشرتی ناول بان کوٹ کے لیے
ایک نیا زاویہ نگاہ کی کہ بابائے
برہان پانچول چھپا کر رکھتے ہیں

کالی کمائیاں

قیمت -/30 روپے ڈائجسٹ -/23 روپے

جرائم ماہر شیطان اہم اوراق
طنز و مزاح، اسرار و خوف
سپینس اور تھررس پر
مبنی ۴۲ کمائیاں

نویسٹ کی چوہیاں

قیمت -/50 روپے ڈائجسٹ -/23 روپے

مشہور نویرک ٹیبلٹ جو یہ قیمت
چیزیں گل قدر معاوضے پر
چراغ ہے

-/200 روپے کی کتابیں ایک ساتھ منگائے پڑا کر خرچ معاف
یہ معاوضہ پیشگی بھی آرڈر ارسال کرنے پر ہی حاصل ہوتی

کتابیات پبلشرز
23 سبکس
74200 کراچی
رضوان مجیدز، بطور، ہاسٹ آف کنگ جہانگیر روڈ
فون: 6802651-6802652-6896313
E-mail: kashmiri@paksociety.com

کے تعلق کا انکشاف سن لینے کے بعد پاس نے خاموشی اختیار کر لی لیکن سلطان شاہ کے سوالات کا سلسلہ نہ رک سکا۔
”اب تم کچھ دیر کے لیے اپنی چونچ بند کرلو۔“ کافی دیر صبر کرنے کے بعد ویرا میری آنکھ کا اشارہ پا کر اس پر غرائی ”ہم یہاں تمہاری جرح کا جواب دینے نہیں، کچھ اہم مسائل پر بات کرنے کے لیے آئے ہیں۔ تم نے اپنے سوالات سے ہمارا آدھا بھیجا خالی کر دیا ہے۔“

”سب کو نہ گھینو صرف اپنی بات کرو۔“ ویرا کا اعتراض سنتے ہی سلطان شاہ کی ذہنی پر بد دل گئی ”عورتوں کے پاس ویسے ہی آدھا دماغ ہوتا ہے۔ وہ خالی ہو جانے کے بعد اب تمہارے پاس کچھ بھی نہیں رہا ہے۔ تم مسائل پر کیا بات کرو گی۔“

ویرا نے اس میرے پردائش مندی سے کام لیا اور بات بدھانے کے بجائے محل سے بولی ”چلو“ میں نہیں بولوں گی مگر اول خان اور ڈینی کو تو بات کرنے دو۔“
”میں نے انہیں کب روکا ہے۔ یہ اپنی باتیں کر لیں۔ میں خاموش ہوا جاتا ہوں۔“ سلطان شاہ نے ہتھیار ڈال دیے۔

”بھارتی اور امریکی دونوں تمہارے خون کے پیاسے ہیں۔“ چند ثانیوں کے توقف کے بعد اول خان نے زبان ٹھکولی ”ویرا نے صحیح کہا تھا کہ آج ان کے لیے تمہارے ایک چہرے کے چار نام ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ تم اپنے کس روپ میں انہیں زیادہ خطرناک لگ رہے ہو۔“
”ہم پٹری سے اتر رہے ہیں۔“ سلطان شاہ نے اسے ٹوکا ”ہئی مین کے مسئلے میں امریکی اور بھارتی کہاں سے آن چکے!“

”یہ سب ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔ کچھ دیر خاموش رہ کر ہماری باتیں سنو گے تو سب کچھ سمجھ میں آتا چلا جائے گا۔“ میں نے اسے گھور کر کہا پھر اول خان سے مخاطب ہو گیا ”یہ بات میں شرط یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ اس وقت ماجد یعنی سے سب سے زیادہ دہشت زدہ ہیں۔“
”تم پہلے بھی یہ بات کہہ چکے ہو حالانکہ جان الیش کوف اور لیری نے کھل کر ڈینی کے خلاف باتیں کی تھیں۔“ ویرا نے اعتراض کیا۔

”وہ ایک مدت سے میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں اور مجھے پکڑنے میں مسلسل ناکامیوں کا منہ دیکھ رہے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ پرانے زخم مندمل ہوتے جاتے ہیں۔ ماجد یعنی کا لگایا ہوا زخم نازہ ترین ہے۔ جان میرے ہاتھوں بننے والی

درگت کو عمر بھر فراموش نہیں کر سکے گا۔

”میں ڈینی سے متفق ہوں۔“ اول خان نے سہلا کر کہا
”ہی آئی اے کی مہم میں اب جان کی ذاتی پر خاش کا عنصر بھی
شامل ہو گیا ہے۔ وہ ڈینی سے پہلے ماجد کو پکڑ کر کفر کو دار تک
پہنچانا چاہے گا۔ اس کے بعد ڈینی کی باری آئے گی۔ مظہر کے
بارے میں امریکیوں سے زیادہ بھارتی بے چین ہیں۔“
”پھر تم کو ماجد بن کر آئی مین سے بات کرنی چاہیے۔
تمہارا اصل نام سننے ہی وہ بدک جائے گا۔“ ویرا نے فیصلہ
سنایا۔

وہ واقعی اس مسئلے کا سیدھا آسان۔ ترین اور منطقی
حل تھا۔ مجھے لمحہ بھر کے لیے حیرت ہوئی کہ وہ بات میرے
ذہن میں کیوں نہیں آسکی تھی۔

آدی تھا وہ تو مشکلات میں گھر کر کبھی کبھی خود کو بہت
بے بس محسوس کرنے لگتا ہے لیکن اسے اپنے اعتماد کے
ساتھیوں سے مشاورت کی سہولت حاصل ہو تو آپس کے بحث
و مباحثے سے نہ صرف دل کو ڈھارس ملتی ہے بلکہ بعض
مسائل کا آسان حل بھی سامنے آجاتا ہے۔

ماجد یعنی اچانک امریکیوں کے سامنے آنے والا ایک
نیا نام تھا جس نے جان کو بری طرح دہشت زدہ کیا ہوا تھا۔
اگر راجا سے کام لینے والا آئی مین بھی شی کی پرانی روایات
کے مطابق پاکستان میں کسی امریکی سازش کو پروان چڑھانے
کے ارادے سے آیا تھا تو اسے بھی میری زبان سے ماجد کا نام
سن کر بوجھ لگنا چاہیے تھا۔

جان کی طرح آئی مین بھی امریکی تھا۔ میں یعنی نزا دین
کر اسے آسانی سے اپنے لہجے سے دھوکا دے سکتا تھا۔

”کو شش کرو کہ وہ کسی طرح تم سے ملنے پر آمادہ
ہو جائے۔“ اول خان نے حسرت آمیز آواز میں مشورہ دیا۔

ویرا بے ساختہ ہنس پڑی اور بولی ”یہ اتنا آسان نہیں
ہو گا۔ تم شی کے طریقہ کار سے واقف نہیں ہو اس لیے یہ
بات کہہ رہے ہو۔ راجا اس کے لیے کام کر رہا تھا لیکن اس
نے بھی کبھی آئی مین کی صورت نہیں دیکھی۔ بس آواز سے
پہچانتا ہے۔“

”یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ اسے گڑے مڑے
اکھاڑنے کی کیا ضرورت تھی۔“ سلطان شاہ نے سوچتے
ہوئے کہا ”اس کے لیے یہ زیادہ آسان کام ہوتا کہ وہ اپنے
آئی مین ہونے کا اعلان کیے بغیر کسی اور خفیہ نام سے اپنا کام
شروع کر دیتا۔“

”اس وقت تم نے غیر معمولی ذہانت کا مظاہرہ کیا ہے۔“

میں نے اس کی تعریف کی ”اول خان کے دفتر میں ایف ایم
مانیٹر پر آئی مین کے الفاظ سننے ہی میرا ہاتھ ٹھنکا تھا اور میں غور
کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ بڑے ارادے لے
کر یہاں آیا ہے۔ راجا اور اس جیسے دوسرے بد معاشوں کے
ذریعے جب زیر زمین دنیا میں آئی مین کا نام گونجے گا تو شی کے
برائے نمک خوار خود بخود اس کے گرد جمع ہوتے چلے جائیں
گے۔ وہ شی کے نام اور ساکھ کو استعمال کر کے جلد از جلد
یہاں اپنا بڑا گروہ منظم کرنے کے چکر میں معلوم ہوتا ہے۔“

”آئی مین کا نام استعمال کرنے کا کوئی اور سبب نہیں
ہو سکتا۔“ غزالہ نے میری تائید میں لب کشائی کی ”ہو سکتا
ہے کہ اب کوئی جوائننگ کر کو بھی گھیرنے کی کوشش کرے۔ شی
کے پرانے آدمیوں میں اس کا نام سرفہرست ہے۔“

”اور وہ ڈینی کی وجہ سے دوسروں کے عتاب کا نشانہ بھی
بن رہا تھا۔“ ویرا نے ہنس کر یاد دلایا۔
”تم کو ہنسنے ہوئے شرم آتی چاہیے۔“ سلطان شاہ نے
تلخی سے کہا ”اسے سب سے زیادہ تم نے ستایا تھا۔ حد یہ ہے
کہ اسے بلک میل کرنے کے لیے اس کے شیر خوار بیٹے کو
انگوا کر کے فرضی نام سے زسری میں ڈال دیا تھا۔“

”کیا دن تھے وہ بھی!“ پرانے دنوں کا ذکر چھیڑنے پر ویرا
حسرت سے ایک گہرا سانس لے کر بولی ”اس وقت میرے
ذہن پر بس ایک ہی دھن سوار تھی کہ کسی طرح ڈینی تک پہنچ
جاؤں۔ اس جنون میں پتا نہیں کیا کیا کر گزری۔ اپنی ان
زیادتوں کا خیال آتا ہے تو مجھے نہ اذیت ضرور ہوتی ہے۔“

”یہ سودا تمہارے سر سے نکل گیا مگر اب تمہارے
دوسرے ہم وطنوں کے سروں میں سا گیا ہے۔“ غزالہ نے
ہلکے طنز سے کہا۔

”تم دونوں نے میرے ہاتھوں خاصے دکھ اٹھائے ہیں۔
تم کو اس تلخ کوئی کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ اس کے
اڑالے کے لیے میں تم کو بس ایک دعا دے سکتی ہوں کہ ڈینی
کے حاسدوں اور دشمنوں کو اس سے زیادہ ناکامی کا منہ دیکھنا
پڑے جتنا میں نے دیکھا تھا۔ تمہارا ڈینی پکا چھلاوا ہے
چھلاوا!“ ویرا بولی۔

”معلوم ہو رہا ہے کہ تم سب میری ٹانگ کھینچنے کے لیے
یہاں جمع ہوئے ہو۔“ میں نے خفت سے کہا۔

”یہ تمہاری قصیدہ گوئی نہیں ہے۔ بات سے بات نکل
رہی ہے۔“ اول خان نے کہا ”یہ واقعی اہم نکتہ تھا کہ نیا گروہ
بننا شی کی دوبارہ شیرازہ بندی سے زیادہ آسان اور محفوظ کام
تھا۔ اس کے لیے پیچیدہ راہ کیوں اختیار کی گئی۔“

لڑکی کی پہلی آواز کی طرح اس کا وہ سوال بھی میرے لیے غیر متوقع تھا۔ ایسے رابطوں میں تفصیلی تعارف اور مذاکرات نہیں ہوا کرتے۔ اصولی طور پر اسے آئی مین کا نام سننے ہی مزید باتوں کا سلسلہ موقوف کر کے اسے بلا دینا چاہیے تھا۔

مجھے شبہ ہوا کہ میرا بتایا ہوا نام آئی مین کی طبیعت پر گراں گزارا تو وہ فون پر آنے سے ہی انکار کر دے گا۔ فون نمبر کے سہارے اس کی کمین گاہ کا سراغ لگا کر وہاں دھاوا بولنا ہمارے لیے سب سے آسان اور محفوظ طریقہ تھا مگر میں ان معاملات کی یہ تک پہنچنے کے لیے تصادم کے بجائے فریب مذاکرات کی راہ اختیار کرنا چاہتا تھا۔ ”تمہیں میرے نام اور نسب سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔“ میں نے برہمی سے کہا ”میں اس کا دوست بول رہا ہوں۔“

”سوری سر! یہاں ان کے دوستوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے اور میں فون پر ان سب کی آواز پہچان سکتی ہوں۔ آپ کی آواز نی ہے اس لیے نام بتانا ضروری ہے۔“ اس کا جواب مہذب مگر سخت تھا۔ اس نے کھل کر اقرار نہیں کیا تھا مگر اس کی باتوں میں یہ امر پتا تھا کہ آئی مین اسی نمبر پایا جاتا تھا۔ ”میں اس کا دوست اور خیر خواہ ہوں۔“ میں نے ترشی سے کہا ”اسے اتنا ہی بتا دو۔ اگر وہ فون پر نہ آیا تو میں دوبارہ اسے رنگ نہیں کروں گا۔ مجھ سے بات نہ کر کے وہ سخت خسارے میں رہے گا۔“

”دوست اور خیر خواہ اپنے نام کے بارے میں اتنی راز داری سے کام نہیں لیتے۔“ اس کی آواز سنجیدہ ہو چکی تھی۔ ”تمہی ان احوال مجھے الفریڈ چپکا کہہ سکتی ہو۔“ اس بار میرا لہجہ خاصا تلخ ہو گیا۔

”ذرا ہولٹ کریں میں دیکھتی ہوں کہ کیا صورت حال ہے۔“ بولنے والی کی آواز بدستور نرم رہی۔ مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ میرا نام جانے بغیر فون پر آنے سے انکار کر دے گا مگر میرا وہ اندیشہ غلط ثابت ہوا۔ ”کون بول رہا ہے؟“ اس نے فون پر آتے ہی غراتی ہوئی آواز میں لڑکی کا سوال دہرایا۔ آواز میں نے پہچان لی کیونکہ میں اسے راجا سے بات کرتے ہوئے سن چکا تھا۔

”میرا نام ماجد ہے۔“ اس بار میں نے بلاتامل جواب دیا ”مجھے ایک بڑی رقم کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں، میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”میں نے تمہارا نام پہلی بار سنا ہے۔ اگر تم یہ سمجھ رہے

”اگر کوئی اور بات رہ گئی ہو تو وہ بھی صاف کر لو تاکہ میں آئی مین سے بات کرنے کے بارے میں سوچوں۔“ ”بس یہ دھیان رکھنا کہ ابھی تک چوڑا، جوشی، راجا اور آئی مین کے مراسم کے بارے میں کچھ نہیں سنبھلی۔“ غزالہ نے اول خان کی بات درمیان سے اچک لی اور بولی ”چوڑا اور جوشی کی دوستی کی بات پہلے ہی کھل چکی ہے۔ یہ بات مجھی سامنے آچکی ہے کہ جوشی کی راجا سے دوستی تھی۔ راجا آئی مین کے لیے کام کر رہا ہے۔“ ”تم درست نتیجہ اخذ کر رہی ہو مگر یہ بات نہیں معلوم ہو سکی کہ چوڑا اور راجا کے مراسم کس نوعیت کے تھے۔“ اول خان اپنے موقف پر قائم رہا۔

وہ ٹھک کہہ رہا تھا۔ چوڑا اور راجا ایک دوسرے سے بہت کم ملے تھے لیکن ان کے تعلقات میں گہرائی کا یہ عالم تھا کہ چوڑا نے اسے ایک بہت بڑے عذاب سے بچایا تھا اور اس نے چوڑا کے ایماء پر جوشی کو پہلے اغوا اور پھر قتل کر دیا تھا۔ موت کے ایک سو اگر اور اس کے عام سے خریدار کے درمیان اتنے گہرے تعلق کے اسباب کچھ اور ہی ہو سکتے تھے۔ ان تک پہنچنے کے لیے ہمیں ایک مرتبہ پھر راجا کی گوش مالی کرنے کی ضرورت تھی۔

میں اپنا ذہن بنا چکا تھا۔ وہ چاروں بھی میری اور آئی مین کی گفتگو سننے کے منتظر تھے۔ مجھے ان کے صبر کا امتحان لینے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں نے اسپیکر فون اپنی طرف کھسکایا اور آئی مین کا نمبر ملانا شروع کر دیا۔

دوسری کھنٹی بجتے ہی ریسپورپر ایک شوخ اور زندگی سے بھرپور، نسوانی آواز سنائی دی۔ بولنے والی نے۔۔۔ صرف ہیلو کہا تھا لیکن اس ایک لفظ سے ہی ظاہر ہو گیا تھا کہ اپنے لب و لہجے سے وہ امریکی نژاد تھی۔

میں وہ اجنبی نسوانی آواز سن کر ایک لمحے کے لیے بے پٹا گیا۔ میرے دہم میں بھی نہیں آسکا تھا کہ آئی مین کے سوا کوئی اور فون اٹھائے گا۔ فوری طور پر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اس سے کیا کون پھر خیال آیا کہ وہ آئی مین کے گھر میں اگر فون اٹھانے پر مامور بھی تو کسی نہ کسی حد تک اس کی رازدوں بھی رہی ہوگی۔ میں نے اپنی خاموشی کا دورانیہ اشتباہ حد تک طویل نہیں ہونے دیا۔

”میں آئی مین سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے دھیمی اور گہمیر آواز میں کہا۔

”اوہ، سر! لڑکی کی تیز زہ اور بے ساختہ آواز ابھری ”آپ کون بول رہے ہیں؟“

ہوئے ہیں۔“ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں مایہ کے روپ میں آئی مین کی نظروں میں اپنی ساکھ برقرار رکھنے میں کامیاب رہا تھا۔

”تم کراچی کے پولیس اسٹیشنوں میں سے کسی کا انتخاب کر سکتے ہو۔ تمہاری نظر مجھ پر کیوں پڑی؟“ وہ ہر طرح سے اپنا اطمینان کرنا چاہ رہا تھا۔

”وہاں ضابطے کی لمبی کارروائیاں ہوں گی۔ رقم تو فصل خانہ دے گا۔ وہ جاننا چاہیں گے کہ پولیس کا تجربہ کون تھا۔ میں ان کے سامنے آیا تو بات بھلا جائے گی۔“ میں نے پورے صبر اور سکون سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”پولیس والوں سے ہو کر مجھ تک آتے آتے وہ رقم آدمی رہ جائے گی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مجھ سے ڈینی کے بارے میں ہر بات معلوم کرنے کے بعد میرا ذکر سرے سے اڑا دیں اور ڈینی کی گرفتاری کی ٹوپی اپنے سر منڈھ کر انعام کے دعوے دار بن جائیں۔ میں ایک غریب الوطن یعنی ہوں۔ کراچی کی بگڑی ہوئی پولیس کا کیا بگاڑوں گا۔“

”تم یمنی ہو لیکن پاکستانیوں اور امریکیوں کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہو۔“ دوسری طرف سے طنز کیا گیا۔

”مجبوری ہے۔ لاکھوں ڈالر کے معاملے میں کوئی بھی بے ایمان ہو سکتا ہے۔“ میں نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”میں نے بہت جھان بین کی اور اپنی معلومات کو سینے سے لگائے بیٹھا ہوں۔ وقت گزر گیا تو ڈینی اپنا ٹھکانا بدل لے گا۔“ مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ آئی مین جیسا خزانہ شخص میری باتوں میں دلچسپی لینے اور گفتگو کو جاری رکھنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ سونے پر سہاگ یہ تھا کہ وہ جان الیش کوف والے واقعے سے باخبر تھا۔ میں نے اس بارے میں کوئی غلط بیانی نہ کر کے کسی حد تک اس کا اعتماد جیت لیا تھا۔

”تم میرا نام نہیں جانتے، صرف میرے لقب سے واقف ہو۔ تم کو علم ہو گا کہ مجھ سے تمہاری ملاقات کا کوئی امکان نہیں ہے۔“ وہ کہہ رہا تھا۔

”اس سودے کے لیے تم کو اپنا اصول توڑنا ہو گا۔ ملاقات کے بغیر بات نہیں بن سکے گی۔“ میں نے اصرار کیا۔ ”پھر شاید تم کو نہیں معلوم کہ آئی مین کیا منصب ہوتا ہے۔“ اس کی آواز سے تکبر اور نخوت کی بو آ رہی تھی۔

”مجھے سب معلوم ہے۔“ میں نے اس کے غور کو ختم کرنے کے لیے سرسری لہجے میں کہا۔ ”میں نے تمہیں بتایا کہ لوگوں اور خبروں کا کھوج لگانا آج کل میرا پیشہ ہے۔ تم سے رابطہ کرنے سے پہلے میں معلوم کر چکا ہوں کہ تم کس کے کوئی

ہو کہ کسی سلسلے میں مجھے بلیک میل کر لو گے تو یہ تمہاری خام خیالی ہے۔ میں اپنا پیسا فالٹو پر یاد نہیں کرتا۔“

”مجھے غلط نہ سمجھو۔“ میں نے دردمندانہ آواز میں احتجاج کیا۔ ”میں بلیک میل نہیں ہوں۔“

”پہلے یہ بتاؤ کہ تمہیں میرا فون نمبر کس نے دیا ہے۔“ اس نے میرے احتجاج کو نظر انداز کر کے پوچھا۔

”یہ میرا کاروباری راز ہے۔ اسے افشا نہیں کیا جاسکتا۔ میرا کام ہی روپوش اور پوشیدہ لوگوں کا سراغ لگانا ہے۔ جس طرح میں نے تمہارا فون نمبر معلوم کیا ہے اسی طرح میں نے ڈینی کا کھوج نکالا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کا پتہ تم کو بتا دوں۔“

”اور میں اپنی جیب سے انعامی رقم تمہارے حوالے کر دوں؟“ اس کی آواز طنز پر مبنی تھی۔

”یہ بات میں نے سب سے پہلے بتادی تھی کہ مجھے ایک بڑی رقم کی ضرورت ہے۔“

”ڈینی پر امریکی حکومت نے انعام مقرر کیا ہے۔ تم کو ان کے کسی افسر یا قاتل خانے سے رابطہ کرنا چاہیے۔“ اس کی آواز میں طنز زیادہ نمایاں ہو گیا۔ ”ڈینی کے سلسلے میں تم مجھ پر مہمان کیوں ہو رہے ہو۔“

میں نے ایک گھما سانس لیا اور جواب دیا۔ ”پہلے میں نے یہی کوشش کی تھی۔ جان الیش کوف سے سودا کرنے کی کوشش کی تھی مگر اس نے سنگین غلطی کی۔ مجھ سے ملنے کے لیے اپنے ساتھ مسلح آدمی لے آیا۔ گڑبڑی وجہ سے میں چھپا رہا، اپنے آدمی کو اس کے پاس بھیج دیا۔ بات بگڑتی چلی گئی اور ہمارے درمیان مفاہمت ہوتے ہوتے رہ گئی۔“

”وہ! تو تم وہی عبدالماجد الحسینی ہو۔ وہ پورا واقعہ میرے علم میں ہے۔ اس میں غلطی تمہاری بھی تھی۔ راستے میں تمہاری سرخ سوزوکی خراب ہو گئی اور جان اسے ڈھونڈتا رہا۔ اس کا بھڑکانا عین فطری تھا۔“

”وہ سی آئی اے کا بہت بڑا افسر ہے۔ اس سے ٹکراؤ ہو جانے کے بعد امریکی میرے دشمن ہو چکے ہیں۔ میں نے دوبارہ ان سے رابطہ کیا تو وہ مجھے انعام دینے کے بجائے کسی گندے جال میں پھانس لیں گے۔ اس مجبوری کی وجہ سے میں نے تم سے رابطہ کیا ہے۔“

”تو تمہارا خیال ہے کہ میں امریکی نہیں ہوں۔“ اس کی آواز جھپتی ہوئی تھی۔

”مجھ سے تم بھی امریکی معلوم ہو رہے ہو مگر تم ایک عام اور ذلّت دار شری ہو۔ وہاں کے سرکاری افسر میرے دشمن

بعد تم سے رجوع کیا ہے۔
 ”میں تمہارے دے ہوئے کسی پروگرام کے مطابق
 کہیں ملنے کا وعدہ نہیں کر سکتا۔“

”پھر مجھے وقت اور جگہ بتا دو۔ میں پہنچ جاؤں گا۔“ میں
 نے اس کی بات درمیان سے اچک کر کہا۔

”ایک ہی بات ہے۔“ وہ آسانی سے کسی پیکر میں آنے
 والوں میں سے نہیں تھا ”ایک مرتبہ پھر تمہاری گاڑی خراب
 ہو سکتی ہے۔ عین موقع پر کوئی غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔ میں
 نہیں چاہتا کہ میرے ساتھ جان جیسے کسی احمقانہ واقعے کا
 اعادہ ہو۔ اپنے ٹھکانے اور ملنے کے بارے میں بتاؤ اور سب
 کچھ مجھ پر چھوڑ دو۔ میں جب مناسب سمجھوں گا، خود
 تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا اور ہم سکون سے بیٹھ کر معاملات
 طے کر لیں گے۔“

”میں ہر وقت ایک جگہ نہیں بیٹھا رہتا۔“ میں نے کہنا
 چاہا لیکن اس نے میری بات اڑا دی۔

”میں بھی اپنے وسائل رکھتا ہوں۔ تمہاری موجودگی
 میں تمہارے ٹھکانے پر آؤں گا۔“

”میں تمہیں کیسے پہچانوں گا؟“ میں نے ہلکی سی جھلٹا ہٹ
 کے ساتھ پوچھا۔

”یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں ابھی تمہیں ایک پاس
 ورڈ بتاؤں گا۔ وہی ہماری باہمی پہچان ہوگا۔“

”تم مجھ پر بھروسہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہو تو میں تم پر
 کیسے اعتماد کر سکتا ہوں۔“ میں نے کہا ”تم مجھ سے ملنے سے
 پہلے اپنے آدمیوں سے میرے بارے میں پھان بین کراؤ
 گے۔ اگر تمہیں کوئی بھی بات مشتبہ نظر آئی تو تم مجھے ناقابل
 اتلائی نقصان پہنچا سکتے ہو۔ میں یہ خطرہ مول نہیں لوں گا۔“

”پھر یہ ڈیل نہیں ہو سکتی۔“ آئی مین نے اپنا فیصلہ سنا
 دیا۔

”اب تم کو مجھ سے شکوہ نہیں ہو سکتا۔ تمہارے انکار
 کے بعد اب میں ڈینی سے تمہارا سودا کروں گا۔ وہ شاید ملین
 ڈالر تو نہیں دے سکے گا مگر مجھے اس سے ایک بڑی رقم ضرور
 مل جائے گی۔ میری محنت رائیگاں نہیں جائے گی۔“ اس کا
 فیصلہ سننے ہی میں نے پائسا پھینکا۔

”اب تم کو مجھ سے شکوہ نہیں ہو سکتا۔ تمہارے انکار
 کے بعد اب میں ڈینی سے تمہارا سودا کروں گا۔ وہ شاید ملین
 ڈالر تو نہیں دے سکے گا مگر مجھے اس سے ایک بڑی رقم ضرور
 مل جائے گی۔ میری محنت رائیگاں نہیں جائے گی۔“ اس کا
 فیصلہ سننے ہی میں نے پائسا پھینکا۔

”تم اب تم کو مجھ سے شکوہ نہیں ہو سکتا۔ تمہارے انکار
 کے بعد اب میں ڈینی سے تمہارا سودا کروں گا۔ وہ شاید ملین
 ڈالر تو نہیں دے سکے گا مگر مجھے اس سے ایک بڑی رقم ضرور
 مل جائے گی۔ میری محنت رائیگاں نہیں جائے گی۔“ اس کا
 فیصلہ سننے ہی میں نے پائسا پھینکا۔

”تم اب تم کو مجھ سے شکوہ نہیں ہو سکتا۔ تمہارے انکار
 کے بعد اب میں ڈینی سے تمہارا سودا کروں گا۔ وہ شاید ملین
 ڈالر تو نہیں دے سکے گا مگر مجھے اس سے ایک بڑی رقم ضرور
 مل جائے گی۔ میری محنت رائیگاں نہیں جائے گی۔“ اس کا
 فیصلہ سننے ہی میں نے پائسا پھینکا۔

”تم اب تم کو مجھ سے شکوہ نہیں ہو سکتا۔ تمہارے انکار
 کے بعد اب میں ڈینی سے تمہارا سودا کروں گا۔ وہ شاید ملین
 ڈالر تو نہیں دے سکے گا مگر مجھے اس سے ایک بڑی رقم ضرور
 مل جائے گی۔ میری محنت رائیگاں نہیں جائے گی۔“ اس کا
 فیصلہ سننے ہی میں نے پائسا پھینکا۔

”تم اب تم کو مجھ سے شکوہ نہیں ہو سکتا۔ تمہارے انکار
 کے بعد اب میں ڈینی سے تمہارا سودا کروں گا۔ وہ شاید ملین
 ڈالر تو نہیں دے سکے گا مگر مجھے اس سے ایک بڑی رقم ضرور
 مل جائے گی۔ میری محنت رائیگاں نہیں جائے گی۔“ اس کا
 فیصلہ سننے ہی میں نے پائسا پھینکا۔

”تم اب تم کو مجھ سے شکوہ نہیں ہو سکتا۔ تمہارے انکار
 کے بعد اب میں ڈینی سے تمہارا سودا کروں گا۔ وہ شاید ملین
 ڈالر تو نہیں دے سکے گا مگر مجھے اس سے ایک بڑی رقم ضرور
 مل جائے گی۔ میری محنت رائیگاں نہیں جائے گی۔“ اس کا
 فیصلہ سننے ہی میں نے پائسا پھینکا۔

بڑے ہو۔ دوسری جنگ عظیم میں شکست کے برسوں بعد بھی برما
 کے جنگلوں میں بہت سے جاپانی فوجی چھپتے پھر رہے تھے۔ ان
 کی دانست میں جنگ ختم نہیں ہوئی تھی اور وہ اپنے دشمنوں
 کے خلاف برسرِ پیکار تھے۔ انہیں بہت مشکل سے یقین دلایا
 جاسکا کہ ان کے ملک نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ تم بھی شی
 کے برسوں میں سے کوئی ایسے کمانڈر ہو۔ نئی ایک مدت پہلے
 مرکب گئی۔ اس کے آدمیوں نے شی کے اٹاؤں پر قبضہ
 کر لیا۔ آئی مین مارے گئے یا گوشہ نشین ہو گئے اور اب
 اچانک تم نمودار ہوئے ہو۔ شاید تم کو معلوم ہو کہ شی اس
 علاقے میں برسوں پہلے ختم ہو چکی تھی۔ شی کی بربادی میں ڈینی
 اور ویراکا بہت تھکا تھا۔

”اصل بھرم ڈینی ہے۔“ آئی مین کی آواز نفرت آمیز
 ہو گئی ”اسی نے ویراکا کو ورغلا کر اسے اپنے باپ سے غداری پر
 مجبور کیا تھا مگر شی ختم ہونے کے لیے نہیں بنائی گئی تھی۔ کسی
 کی زندگی یا موت سے اس پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ وہ یہاں
 سے ناما زگار ماحول کی وجہ سے سمیٹ گئی تھی۔ اب میں آیا
 ہوں تو تم دیکھو گے کہ یہاں اس کا طوطی بولے گا۔ ڈینی اور
 ویراکا میں اپنے ہاتھوں سے جہنم داخل کروں گا۔“

بات کا رخ شی کی طرف مڑ گیا تھا۔ میں نے اس سے
 فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا ”تم یہاں شی کی تنظیم نو کے لیے آئے
 ہو!“

”اپنی حد سے تجاوز مت کرو۔ بات وہیں تک رکھو جہاں
 سے شروع کی تھی۔ میرے آنے کا مقصد بہت جلد تمہارے
 اور سب کے سامنے آجائے گا۔“

اپنے لہجے کی سختی اور تحکم سے وہ مظلوم یا مجبور نہیں
 معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے الفاظ میں ایک عزم پناں تھا۔
 صاف ظاہر تھا کہ اس نے اپنی بیٹی اور بیٹے کے بارے میں
 راجا کو جو کہانی سنائی تھی، وہ سن گھڑت تھی۔ وہ شی کے
 بارے میں کوئی نیا منصوبہ لے کر پاکستان میں وارد ہوا تھا۔

میں اس سے ماحد بن کر ایک مخصوص زاویے سے بات
 کر رہا تھا۔ میرے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ میں راجا کی بتائی
 ہوئی باتوں کا حوالہ دے کر اسے ذیل کرتا یا شی کے بارے
 میں اپنی معلومات کا اظہار کر کے اسے حیران کرتا۔ اس تک
 پہنچنے کے لیے اس کی ہر ذہنی سخی ضروری تھی۔

”ملین ڈالر کے عوض ڈینی!“ میں نے ایک گہرا سانس
 لے کر کہا ”وہ امریکی حکومت کے ساتھ شی کو بھی مطلوب
 ہے۔ تم نے اس حقیقت کا اعتراف کر لیا ہے۔ مجھے یہ سب
 پہلے سے معلوم تھا اسی لیے میں نے جان سے بات بگڑنے کے

ہوتے ہو۔“ بات بگڑتی دیکھ کر میں طنز و تشبیہ اتر آیا۔

”بزدلی اور احتیاط میں بہت فرق ہوتا ہے۔“ اس کی آواز میں برہمی نہیں تھی۔ شاید اس نے مجھے ڈیل نہ ہونے کی کھوکھلی دھمکی دی تھی ورنہ وہ خود اکرات جاری رکھنے کا خواہاں تھا۔ وہ پوچھ رہا تھا ”تم میرے علاوہ شی کے کسی آئی مین کو جانتے ہو؟“

”میں نام نہیں بتا سکتا لیکن وہ اپنے حریفوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ بہت دیر اور بے خوف آدمی تھا۔“ میں نے۔۔۔ فی البدیہہ ایک خیالی پیکر تراش لیا ”اسے معلوم تھا کہ اس کے دشمن کسی بھی وقت اسے مار دیں گے۔ اس کو ڈر تھا کہ اس کی سلور آئی دشمنوں کے ہاتھ لگ گئی تو شی کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔ اس نے فراری راہ اختیار کرنے کے بجائے اپنی سلور آئی میرے پاس رکھوا دی اور میدان میں ڈارہا۔“

”اوہ! اس کی سلور آئی کہاں ہے؟“ اسپیکر فون پر اس کی مضطربانہ آواز ابھری۔

”وہ امانت آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ میں چاہتا تو اس کی مدد سے خود آئی مین بن سکتا تھا مگر میں مردہ گھوڑے پر سواری کرنا پسند کرتا ہوں نہ کسی کی امانت میں خیانت کرنے کا تصور کر سکتا ہوں۔“

”تم ہر تھوڑی دیر بعد ایک نیا شو شاپ چھوڑ رہے ہو۔ میں تمہاری کسی بات پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔“ اس کی آواز سے بے اعتباری مرعہ خیز تھی۔

”تم چاہو تو میں گول طلائی سکے پر دونوں طرف ابھری ہوئی نفرتی آنکھ دکھا سکتا ہوں۔ شرط یہ ہے کہ مجھ سے ملو۔“

”وہ سلور آئی مجھے دے دو۔ میں انہیں بیس ہزار ڈالر دوں گا۔“ اس نے مضطربانہ آواز میں پیشکش کی۔

”میں کسی قیمت پر امانت میں خیانت نہیں کروں گا۔“ میں نے زور دے کر کہا۔ بقیہ لوگ خاموش تھے مگر دیر کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ تیر گئی تھی۔ وہ آئی مین کے اضطراب کا سبب سمجھ رہی تھی۔ نفرتی آنکھ والے دو طلائی سکوں کا مالک بن کر وہ ہر ایک کو یاد رکھا تھا کہ وہ سیر آئی مین ہے۔ ایسی صورت میں اسے دنیا کی کوئی طاقت شی کی سربراہی سے نہیں روک سکتی تھی۔

”امانت رکھوانے والے کی موت کے بعد تمہاری ڈسٹری باری ختم ہو گئی۔ اب تم اسے بیچ دو تو یہ خیانت نہیں ہوگی۔“

”آمنے سامنے بیٹھ کر بات کیے بغیر کوئی فیصلہ نہیں ہو سکتا۔“ میں نے دونوں کے لیے میں کہا۔

”مجھے اپنا فون نمبر دے دو۔ میں آج یا کل تمہیں دوبارہ فون کروں گا۔“

”میں نے کچی گولیاں نہیں کھیلیں۔“ میں نے زہریلے لہجے میں جواب دیا ”تم اس نمبر سے میرا کھون لگا لو گے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ تمہیں میرا پتا معلوم ہو چکا ہے۔“ اس کی آواز سے معلوم ہو رہا تھا کہ میرے جواب نے اسے بری طرح چونکا دیا تھا۔

”جو چاہو سمجھ لو۔“ میں نے بے نیازی سے کہا ”تم کو فون کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میں کل دو بجے خود فون کروں گا۔“

”اس وقت ہم بہتر طور پر بات کر سکیں گے۔ تم نے مجھے فکر اور تشویش میں مبتلا کر دیا ہے۔“

”یہ یاد رکھنا کہ میں سلور آئی سے دستبردار ہونے سے زیادہ ڈینی کے معاملے میں دلچسپی لوں گا۔“

”تم بہت کچھ جانتے ہو۔ میرا خیال ہے کہ تم کام کے آدمی ہو۔ کل ہم ڈیل لاک کا کوئی نہ کوئی حل نکال لیں گے۔“ اس کی بات پوری ہونے پر میں نے کوئی جواب دیے بغیر فون بند کر دیا۔

”خدا کی پناہ!“ سلطان شاہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام کر بولا ”تمہارے مغز میں بہت دم ہے۔ اس جیسے بیڑھے آدمی سے اتنی دیر تک باتیں کرنا تمہارا ہی کام تھا۔ ہم میں سے کوئی بھی گفتگو کو اتنا طویل نہیں دے سکتا تھا۔“

”تم اس طرح بات سے بات نکال رہے تھے جیسے تم نے سب کچھ پہلے سے سوچا ہو۔“ دیرانے ہنسنے لگا۔

”ایک بات ثابت ہو گئی کہ وہ آسانی سے ہار ماننے والوں میں سے نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کل دو بجے وہ کوئی نیا شو شاپز اکروے۔“ اول خان نے اپنی رائے زری۔

”میں نے سوچ سمجھ کر اسے کل تک کاؤت دیا ہے۔ وہ جان والے واقعات سے باخبر ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ امریکی عملے سے قریبی رابطے میں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اب وہ براہ راست جان ایٹش کوف کو فون کر کے اس سے ماہد کے بارے میں معلوم کرے۔“

”اب اسے چھوٹ نہیں دی جانی چاہیے۔“ غزالہ نے پُر خیال انداز میں زبان کھولی ”وہ موڑی ہے۔ سی آئی اے والوں کے ساتھ مل کر کوئی نیا گل کھلا سکتا ہے۔“

میں نے غزالہ کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بس مسکرا کر رہ گیا۔ اس وقت میری اور اس کی سوچ بڑی حد تک یکساں تھی۔

اول خان نے فوننگ کار پیور اٹھایا ”غزالہ کی تشویش بجا ہے۔ ہمیں اس کا بظاہر معلوم کرنا چاہیے۔“

شی کی تاریخ میرے لیے ابھی نہیں تھی۔ بظاہر وہ سوسائٹی ہیروئن کے انسداد کے لیے بنائی گئی تھی اور عالمی پیمانے پر کام کرتی تھی۔ یورپ اور امریکا میں شی والے اپنے مقاصد سے اس حد تک مخلص ضرور تھے کہ اپنی دوسری غیر قانونی سرگرمیوں کے ساتھ ہیروئن کے انسداد کے لیے بھی کام کرتے تھے لیکن جنوبی ایشیا اور خاص طور پر پاکستان اور افغانستان میں شی کا کردار بالکل مختلف تھا۔

پاکستان میں شی کے شرمناک دھندوں کا میں چشم دید گواہ تھا۔ وہ امریکی سرمایے کے بل بوتے پر پاکستان کے کئی کوچوں میں ہیروئن کے آزادانہ استعمال کی سرپرستی کر رہے تھے۔ منگے داموں آنے والی ہیروئن سے داموں پر ہیروئنچین کو فراہم کی جاتی تھی۔ فلسفہ یہ تھا کہ علاقے کی ساری پیداوار پاکستان کے راستے پوری دنیا میں اسمگل ہوتی تھی۔ اگر پاکستان میں اس موڈی کٹے کی مانگ بہت زیادہ بڑھ جاتی تو اسمگلنگ کی مقدار میں اسی قدر کمی ہو جاتی۔

پاکستان میں وہ لوگ صرف ہیروئن کو فروغ نہیں دیتے رہے تھے بلکہ حکومت سے برگشتہ گروپوں اور علیحدہ پسند عناصر کو رقوم اور ہتھیاروں کی صورت میں بھاری امداد فراہم کرتے رہتے تھے۔ ان کی ایسی کوششوں کو امریکی سفارت کاروں کی بھرپور پشت پناہی حاصل ہوتی تھی۔ مجموعی طور پر مجھے ایسا نظر آیا تھا جیسے شی والوں کو پاکستان کا وجود ایک آنکھ نہ بھاتا ہو اور وہ ہر طرح اسے تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہوں۔

اپنے ان اٹل مشاہدوں کی بنا پر میں نے شی سے بغاوت کا علم بلند کیا تھا۔ ان دنوں شی کا یہ تقوہ تھا کہ ان کے کسی باغی کے لیے روئے زمین پر کہیں کوئی جائے امان نہیں تھی۔ میں نے کامیابی کے ساتھ ان کی صفوں میں دراڑیں ڈال کر اس نعرے کو غلط ثابت کر دیا تھا۔ ان کے مفادات پر ایسی ایسی کاری ضربیں لگائیں کہ آخر کار وہ پاکستان کی سرزمین سے اپنی بساط لپیٹنے پر مجبور ہو گئے۔

اب ایک انجینی آئی مین شی کا پرانا نام لے کر میدان میں اتر اٹھا تو صاف نظر آ رہا تھا کہ اس کے عازم نیک نہیں تھے۔ امریکی انجینیئروں کی ریشہ دوانیاں ناکام ہونے کے بعد واشنگٹن کے حکمرانوں نے اپنے اہداف کے حصول کے لیے دوبارہ شی کے آزمودہ کردار کو استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اول خان کو چند منٹ میں معلوم ہو گیا کہ آئی مین کے

”وہ موڈی ہے اور میری رائے میں ڈینی سے صرف ایک غلطی سرزد ہوئی ہے جس سے وہ فائدہ اٹھا سکتا ہے۔“ ویرا بولی ”تم نے اس سے مایہ بن کر بات کی تھی تو تمہیں سلور آئی کا کوئی حوالہ نہیں دینا چاہیے تھا۔ ان دونوں کو یک جا کر کے وہ تمہاری طرف سے بدگستہ ہے۔“

”یہ بہت بڑی غلطی ہے جو میں نے جان بوجھ کر کی ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ”یہ بات شی میں مشہور ہو چکی تھی کہ میں ایک سلور آئی پر قابض ہو چکا ہوں۔ اسے واپس لینے کے لیے جی لائیڈ نے اپنی ایزی جونی کا زور لگا دیا تھا۔ وہ ہماری نقصان اٹھا کر بھی کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ اس کا ذہن میری اس غلطی کی طرف جانے کا تو وہ خود اسے اپنے ذہن سے جھٹک دے گا کہ اس سے گفتگو کرنے والا ڈینی ہو تا تو ایسی فاش غلطی نہ کرتا۔“

”سلور آئی کا حوالہ دینے سے تمہیں کیا فائدہ ہوا؟“ ویرا نے اسی لمحے میں دوسرا نکتہ نکال لیا۔

”وہ اسے حاصل کرنے کے لیے بے تاب ہو گیا۔ اس کی بے چینی سے ظاہر ہو رہا ہے کہ شی میں سربراہ کا منصب خالی ہے۔ دو سلور آئیز کا مالک بن کر وہ اس سربراہی کا حق دار بن سکتا ہے۔ شاید اسی ایک نکتے پر ہماری دوسری فون کال پر منہمکت ہوئی ہے۔“

”اگر تم نے ان خطوط پر سوچتے ہوئے سلور آئی کا ذکر چھیڑا تھا تو پھر ٹھیک ہی تھا۔“ ویرا اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی ”جی لائیڈ واٹ ہاؤس کے ڈرائیوے پر کسی گناہ قاتل کی گولی کا نشانہ بنا تھا۔ اس کے بعد آنے والے تمہارے ہاتھوں مارے گئے اور پھر شی کا شیرازہ بکھرتا چلا گیا۔ میرا کبھی کبھی پرانے لوگوں سے رابطہ ہوتا رہا مگر کہیں سے کسی سرگرمی کی خبر نہیں ملی۔ اب یہ نیا آئی مین آیا ہے تو میرا خیال ہے کہ اسی نے واشنگٹن میں شی کو زندہ کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ یہ کامیاب ہو جاتا ہے اور دو سلور آئیز حاصل کر کے اپنی صلاحیت منوالیتا ہے تو پھر یہ میرے مرہو باپ کی جگہ بھی لے سکتا ہے۔“

”بس مبہم سابی خا کہ میرے ذہن میں ابھرا تھا۔ زیادہ سوچ بچار کا وقت نہیں تھا۔ میں نے سلور آئی کی بات نکال لی۔“ میں نے کہا۔

”جو کچھ ہوا وہ ٹھیک تھا۔“ غزالہ نے چرسکون لہجے میں میرا ساتھ دیا ”ابھی صرف راجا ہمارے قبضے میں آیا ہے۔ پتا نہیں آئی مین نے اور کس کس کو خرید لیا ہو گا۔ اب اسے مہلت دینا ایک موڈی کو پالنے پونے کے مترادف ہو گا۔“

مگر موقع کی نزاکت کا تقاضا تھا کہ دونوں گاڑیاں ساتھ لی جائیں اور اول خان کی جیب سے کچھ درمیانی پتھیرا ہماری گاڑی میں منتقل کر دیے جائیں۔

خود کار رانہ نقلوں کی رازدارانہ منتقلی کے بعد ہم وہاں سے روانہ ہو گئے۔ دیر اور غزالہ اول خان کی جیب میں تھیں۔ میرے ساتھ سلطان شاہ سفر کر رہا تھا۔ دونوں گاڑیوں میں باہمی رابطے کے لیے اول خان نے ایک ٹرانسمیٹر میرے حوالے کر دیا تھا۔ میرے ایما پر اس مہم کی سربراہی اس کے سپرد کر دی گئی تھی۔

ہماری گاڑیاں شہر کے پُرجوم اور بارونق علاقوں سے گزر کر ڈیفنس کی حدود میں داخل ہوئیں تو سماں اچانک ہی بدل گیا۔ پر سکون رہائشی علاقوں میں ہلکا جھلکا ٹریفک رواں تھا۔ رہائشی علاقہ کسی بھی قسم کی دکانوں یا دفاتر سے پاک تھا۔ ڈیفنس میں اس قسم کی کاروباری سرگرمیوں کے لیے کمرشل علاقے مخصوص کر دیے گئے ہیں۔ جہاں چھوٹے چھوٹے پلاٹوں پر تین اور کہیں چار منزلہ عمارات کھڑی کر دی گئی ہیں۔ ان کی چلی منزل پر دکانیں اور شوروم قائم ہیں۔ اوپری منزلوں پر رہائش اور کاروبار کے ملے جلے مراکز پائے جاتے ہیں۔

کمرشل علاقوں میں مصروف اور لدی پھندی دکانوں کے قریب سے گزرتے ہوئے زندگی کی بھرپور پھل پھل کا احساس ہوتا ہے۔ اس سے آگے رہائشی علاقوں میں پھر سکون آور خاموشی کا راج ہو جاتا ہے۔

علاقہ پوری طرح آباد اور خوب صورت مکانات سے بھرا ہوا ہے لیکن فیڑیوں میں صورت حال واقعی مختلف تھی۔ سڑکوں، روشنیوں اور دیگر سہولتوں کا جال بچھا ہوا تھا لیکن بیشتر علاقہ ریتلے میدان کا منظر پیش کر رہا تھا۔ اس روشن ریتلے ویرانے میں کہیں کہیں اکاؤٹ مکانات آباد تھے۔ بہت سی جگہوں پر زیر تعمیر مکانات مزدوروں وغیرہ سے آباد نظر آ رہے تھے۔

آئی مین کی کیمین گاہ کا پہلے سے سروے نہیں کیا گیا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اول خان اپنے قیاس کی بنا پر مطلوبہ مکان کی تلاش میں بھٹک رہا تھا۔

”معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا جنر فیرفوب جواب دے گیا ہے۔ کیوں نہ کہیں رک کر کسی سے پتا معلوم کر لیا جائے۔“ میں نے اپنیس پر اسے چھیڑا۔

”جیتے سے مکان تلاش کرنے میں تھوڑی سی دقت ہوتی ہے۔ یہاں کوئی ہماری مدد نہیں کر سکے گا۔ ہمیں کمرشل ایریا

زیر استعمال فون ڈیفنس کے ساتویں فلیئر کے ایک مکان میں نصب تھا۔

آئی مین کے خلاف فوری کارروائی کی تجویز غزالہ کی تھی لیکن اس بارے میں اول خان زیادہ پر جوش تھا۔ اس کی دانت میں آئی مین پر ہاتھ ڈالنے کا وہ مناسب ترین موقع تھا۔ اسے ایک رات کی مہلت مل جاتی تو وہ اپنا ٹھکانا بدل کر ہماری دسترس سے دور نکل سکتا تھا۔

ہمارے لیے وہ محض ایک نام تھا۔ راجا سمیت کوئی بھی اس کی اصل شخصیت سے واقف نہیں تھا۔ کراچی کی بھیڑ میں ایسے بے نام و نشان شخص کو تلاش کرنا آسان کام نہیں تھا۔

اس بار ہمارا مقابلہ بد معاشوں کے کسی گروہ سے نہیں تھا۔ آثار بتا رہے تھے کہ آئی مین نے رازداری کی وجوہ بتا کر اپنے ساتھ زیادہ بھیڑ نہیں رکھی ہوگی۔ ڈیفنس کے مکان میں وہ اپنی کسی ہم وطن لڑکی کے ساتھ رہ رہا تھا۔ گھر کی خدمات اور دیکھ بھال کے لیے وہاں دو چار ملازمین ہو سکتے تھے جن سے ہم لوگ آسانی سے نمٹ سکتے تھے۔ ہر شخص کی رائے تھی کہ اس مہم کے لیے ہمیں کسی اور مدد کی ضرورت نہیں تھی لیکن اول خان مصر تھا کہ اس کے دو چار تجربے کار آدمیوں کو ساتھ لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

دیر اور سلطان شاہ کا تجربہ تھا کہ ہماری جن سمات میں ایس بی ایف کے لڑاکا شریک ہوتے تھے ان میں لڑائی بھڑائی کا بیشتر بوجھ وہی اٹھاتے تھے۔ ہم لوگوں کا عملی کردار محدود اور مخصوص ہو کر رہ جاتا تھا۔ وہ دونوں بہت زیادہ منصوبہ بندی اور ذہنی مشقت کے عادی نہیں تھے اس لیے عملی میدان میں اپنے جوہر دکھانے کے لیے مضطرب رہتے تھے۔ انہوں نے اول خان کی تجویز کی سختی سے مخالفت کی اور اسے خاموش ہو جانا پڑا۔

اول خان اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی کے سلسلے میں ڈیفنس کے علاقے سے بڑی حد تک واقف تھا۔ اس کی رائے تھی کہ ان دنوں فیڑیوں کا علاقہ زیادہ آباد نہیں ہوا تھا۔ وہاں کسی کارروائی کے آغاز کے لیے گہری رات کا انتظار بے سود تھا۔ شام کے ٹپکے اندھیرے میں بھی وہاں کسی مداخلت کے بغیر دھاوا بولا جاسکتا تھا۔

شام ہو چکی تھی۔ غزالہ نے سب کے لیے چائے تیار کی۔ چائے کا دور ختم ہوتے ہی ہم روانگی کے لیے تیار ہو گئے۔

ہم پانچوں آسانی کے ساتھ ایک گاڑی میں سلا سکتے تھے

ٹوٹ کا بورڈ بھی توڑا ہوا تھا۔

اس گھر کے سامنے دو گاڑیاں رکتی دیکھ کر قریبی زیر تعمیر مکان سے ایک مزدور باہر نکل آیا تھا۔ ”اول خان نے اسے ہاتھ کے اشارے سے اپنی طرف بلائے ہوئے کہا ”کہیں یہاں بھی سنی کمار اور چندن والا چکر نہ چل رہا ہو کہ خالی مکان کا لون کیس اور استعمال کیا جا رہا ہو۔“

”مجھے کی ملی بھگت کے بغیر یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔ یہ کوئی اور چکر معلوم ہوتا ہے۔“ میں نے کہا ہم پانچوں ٹٹلتے ہوئے اس تاریک مکان کے سامنے پہنچ گئے تھے۔

پٹھان مزدور ناخاندہ تھا۔ اس کی اردو کمزور تھی۔ اول خان نے چند لمحوں کے لیے اس سے پشتو میں بات کی اور ہمیں بتایا کہ اس مکان کے گیٹ پر وہ بورڈ چپٹلے کئی ہفتوں سے لگا ہوا تھا لیکن پھاٹک پر تالا نہیں تھا۔ مزدور نے کبھی اس بات پر دھیان نہیں دیا تھا کہ وہاں کسی کی آمد و رفت رہتی تھی یا مکان خالی پڑا رہتا تھا۔

مزدور اول خان کو سلام کر کے ہمیں حیران نظروں سے دیکھتا ہوا چلا گیا۔

”اندر چل کر دیکھتے ہیں۔ ذرا سی در میں سب کچھ سامنے آجائے گا۔“ سلطان شاہ یہ کہہ کر مقفل آہنی پھاٹک کی طرف بڑھا اور کسی بندر کی طرح کندھے پر پیر ٹکا کر تیزی سے اندر کود گیا۔ فرش پر اس کے کودنے کی دھمک خاصی تیز تھی۔ چند لمحوں کے لیے میرے دل کی دھڑکنیں بہت تیز ہو گئیں۔ سلطان شاہ مسلح اور بھرپور ضرور تھا لیکن اندھیرے میں گھٹ میں بیٹھا ہوا کوئی بھی دشمن بہت آسانی سے اسے اپنا نشانہ بنا سکتا تھا۔

اندر کودنے کے بعد شاید سلطان شاہ نے بھی کسی رد عمل کا انتظار کیا اور پھر اندر سے ذیلی راستے کی کنڈی کھول دی۔

میں دانستہ اونچی آواز میں بولتا ہوا اندر داخل ہوا تھا۔ بدعا یہ تھا کہ گھر کی تاریکی میں اگر کوئی چھپا ہوا ہو تو ہماری نفری سے باخبر ہو جائے اور ہم سے مقابلہ کرنے کا خیال اپنے دل سے نکال دے۔

مکان میں تاریکی کے ساتھ گھرے سنائے کا راج تھا۔ سلطان شاہ ریوالتور تھا۔ سوچ بورڈ کی طرف بڑھا اور اس نے پورچ کی روشنی کا سوچ آن کر دیا۔

داخلی دروازہ مقفل تھا۔ میں اول خان کے ساتھ پورچ میں رک رہا۔ وہ تینوں اندر داخلے کی کوئی راہ تلاش کرنے کے لیے داہنی طرف چل دیے۔

میں کسی اسٹیٹ ایجنسی سے رجوع کرنا پڑے گا۔ میرا خیال ہے کہ میں صحیح اسٹیٹ پر آگیا ہوں۔“ اس جواب کے ساتھ اول خان نے اپنی جیب سے ایک سڑک پر موڑی اور رفتار کم کر لی۔

”یہ عجیب علاقہ ہے۔“ سلطان شاہ بڑبڑایا ”ساری سڑکیں ایک جیسی نظر آ رہی ہیں۔ اگر سڑکوں پر شناختی بورڈ نہ لگے ہوئے ہوں تو سپاٹ زمین پر پھیلی ہوئی ان سیاہ لکیروں میں امتیاز کرنا مشکل ہے۔“

”اول خان کو اپنی یادداشت پر بھروسہ نہ ہوتا تو وہ یوں سیدھا نہ چلا آتا۔“

کچھ دور چل کر اول خان نے ایک مکان کے سامنے اپنی گاڑی روک لی۔ میں نے مصلحتاً اس سے فاصلہ رکھا ہوا تھا۔ میں نے قریب جانے کے بجائے اپنی گاڑی دور روک لی۔ منزل آجانے کے احساس سے سلطان شاہ اپنی نشست پر کچھ بے چین سا ہو گیا تھا۔

”میرا خیال ہے کہ ہمیں پہنچنے میں دیر ہو گئی۔“ اریٹس پر اول خان کی مایوسانہ آواز ابھری ”گیٹ پر تالا لگا ہوا ہے۔ ساتھ ہی کرایے پر خالی ہے کا بورڈ بھی لٹکا ہوا ہے۔“

”تمہیں یقین ہے کہ تم صحیح پتے پر پہنچے ہو۔“ میں نے بے یقینی سے پوچھا۔

”سو فیصد یہی مکان ہے۔ اس پر پتے کی تختی بھی لگی ہوئی ہے۔ میں حیران ہوں کہ یہ گھر خالی پڑا ہوا ہے۔“

وہ تینوں پتے کے بارے میں اتنے پڑتین تھے کہ خالی ہاتھوں جیب سے سڑک پر اتر آئے اور اپنے مطلوب مکان کی طرف بڑھنے لگے۔ میں نے اضطرابی طور پر اپنی گاڑی کا انجن اشارت کیا اور گاڑی جیب کے پیچھے لے جا کر روک دی۔

سلطان شاہ نے پڑتیش انداز میں میری اور اول خان کی گفتگو سننے کے بعد ریوالتور سنبھال لیا تھا۔

گاڑی روک کر ہم دونوں بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ میں نے گاڑی روکتے ہی دیکھ لیا تھا کہ اول خان درست کہہ رہا تھا۔ مقفل پھاٹک پر ٹوٹ کا لٹکا ہوا بورڈ ہمارا منہ چڑا رہا تھا۔ اس بورڈ کے نیچے رابطے کے لیے ایک فون نمبر دیا ہوا تھا۔

”یہاں کوئی گڑبڑ ہے۔“ گاڑی نے اترتے ہوئے میرے کانوں میں غزالہ کی آواز آئی ”یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ڈیڑھ دو گھنٹے پہلے یہ مکان آباد تھا اور اب اس قدر ویران پڑا ہوا ہے۔ اتنی سی دیر میں وہ گھر خالی کر گیا اور دروازے پر

دونوں خواتین کے مشاہدے کے مطابق کچن پوری طرح زیر استعمال اور خوشبوؤں میں رچا ہوا تھا۔ کہیں گردوغبار کا نشان تک نہیں تھا۔ ریفریجریٹر مختلف اشیائے خورونوش اور مشروبات سے بھرا ہوا تھا۔ جس میں بیئر کے ڈبے بھی شامل تھے۔ ایک خاص بات یہ تھی کہ فرج میں محفوظ کیا ہوا کھانا مقامی طرز کا نہیں ہرڈش مغربی طرز کی نظر آرہی تھی۔ یہ اس بات کا کھلا ثبوت تھا کہ وہاں غیر ملکی رہ رہے تھے۔

کچن کا جائزہ لینے کے بعد ہم واپس ماسٹر بیڈ روم میں لوٹ آئے۔ میں نے الماریوں اور درازوں کی تلاشی لینی شروع کر دی۔ اول خان نے اپنے موبائل فون سے آئی فون کا نمبر ملا تو خواب گاہ میں رکھے ہوئے فون کی کھنٹی بجنے لگی۔ سب کچھ درست تھا ہم اپنی تفتیش کے مطابق صبح بھکانے پر پہنچے تھے مگر ساری تیزی دھکانے کے باوجود آئی فون اور اس کی مدد گار لڑکی کو کھوجے گئے تھے۔

اس گھر کا فون نمبر چیک کرنے کے بعد اول خان بھی میرے ساتھ شامل ہو گیا۔ ان لوگوں نے جاتے ہوئے اپنی ایسی کوئی ذاتی چیز نہیں چھوڑی تھی جس سے ان کی شناخت میں مدد مل سکے۔ میک اپ اور شیوگ کے ہلکے پھلکے سامان کو چھوڑ کر وہ اپنا سب اسباب سمیٹ کر لے گئے تھے جو یقیناً مختصر رہا ہوگا۔

”ہم ادھر کا رخ کرتے یا نہ کرتے“ اسے فرار ہونا تھا اور وہ کامیاب ہو گیا۔ ”اول خان نے مجھے ہوئی آواز میں کہا ”اس نے فون کے لیے کل دو بجے کا وقت صرف مہلت لینے کے لیے مقرر کیا تھا۔“

”کیا اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس سے بات کرنے والا ماجد نہیں ہے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”وہ جرائم کی دنیا کا آدمی ہے۔ اس کو بھڑکانے کے لیے صرف یہ بات کافی تھی کہ ایک اجنبی اس کے ٹھکانے سے واقف ہو چکا ہے جو اپنا مطالبہ پورا نہ ہونے کی صورت میں اسے کوئی بڑا نقصان پہنچانے سے بھی گریز نہیں کرے گا۔ وہ غیر ضروری خطرات مول لینے والوں میں سے نہیں ہے۔ پہلی فرصت میں نکل بھاگا۔“

”وہ کہاں جائے گا۔ مالک مکان کو اس کے بارے میں بہت کچھ اگنان پڑے گا۔“ میں نے تلخی سے کہا ”اس نے ایسے مشتبہ غیر ملکی کو اپنا مکان کیوں دیا جو دروازے پر ٹوٹ کا بورڈ لٹکا کر کسی چور کی طرح اندر چھپا ہوا تھا۔“

”بورڈ پر لکھا ہوا نمبر ہمیں یاد ہے یا میں دیکھ کر آؤں۔“

”مکان میں ہفتوں کی ویرانی کے آثار نہیں ہیں۔“ اول خان نے گہرے سانس لیتے ہوئے کہا ”یہاں انسانی بو پائی جا رہی ہے۔“

وہ ساحل کا قریبی علاقہ تھا۔ اگر وہ مکان کئی ہفتوں سے بند اور غیر آباد ہوتا تو رچی ہوئی سیلن میں ناگوار سی بو ضرور پیدا ہو جاتی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ مکان پر ٹوٹ کا بورڈ دھوکا دینے کے لیے لٹکایا گیا تھا ورنہ آئی فون کچھ دیر پہلے وہاں موجود تھا۔

میں نے مقابلے کا خوف دور ہوجانے کے بعد سگریٹ سلگائی۔ ہم دونوں وہیں کھڑے تبادلہ خیال کر رہے تھے کہ چند کھٹکوں کی آوازیوں کے بعد مکان کا داخلی دروازہ کھل گیا اور وہاں سے وہ تینوں نمودار ہو گئے۔

”وہ فون سے خوف زدہ ہو کر بھاگا ہے ورنہ توڑی دیر پہلے یہیں موجود تھا۔“ ویرانے مکان سے برآمد ہوتے ہوئے پُرجوش لہجے میں اطلاع دی۔

”مکان پوری طرح فرشتہ اور صاف ستھرا ہے۔ کچن میں کھانا پکانے یا گرم کرنے کی تازہ بورچی ہوئی ہے۔“ غزالہ نے اس کی تائید کی۔

اس مرتبہ ہم پانچوں ہی ایک ساتھ آگے بڑھے تھے مگر میں ایک فوری خیال کے تحت ٹھک گیا۔ تم تینوں اندر ہو آئے ہو۔ اب یہاں رک کر گمراہی کرو۔ میں اول خان کے ساتھ اندر کا ایک چکر لگا کر آتا ہوں۔ تم کدھر سے اندر گئے تھے؟“

”ساری کھڑکیوں پر مضبوط آہنی گرل لگی ہوئی ہے۔ میں نے ایک بیڈ روم کے دندواڑ کنڈیشنر کو اندر گرا کر داخلے کا راستہ بنایا تھا۔“

میں اسے تو صیغی نظروں سے گھور کر مسکرا دیا۔ کسی خالی گھر میں داخل ہونے کے لیے اس سے بہتر اور آسان راستے کا انتخاب مشکل تھا۔

ان تینوں کو وہیں چھوڑ کر میں اول خان کے ساتھ مکان میں داخل ہو گیا۔

مکان بہت شوق اور نفاست سے سجایا گیا تھا۔ وہاں تین بیڈ روم تھے۔ دو کمروں کے بستریاں لکڑی کے داغ اور ہلکی سی گرد میں اٹے ہوئے تھے۔ ماسٹر بیڈ روم بے ترتیب تھا۔ آثار بتا رہے تھے کہ گھر میں بس وہی ایک خواب گاہ استعمال کی جا رہی تھی یا پھر کھانے کی میز پر اسرار کینوں کے استعمال میں رہی تھی۔ ڈرائنگ روم کے صوفوں اور قالین پر بھی گرد کی ہلکی سی تہ جمی ہوئی تھی۔

اول خان نے پوچھا۔
 ”وہ بھولنے والا نمبر نہیں تھا۔ میں نے دیکھتے ہی حفظ کر لیا تھا۔“ میں نے جواب دیا۔

ہم نے بیڈروم کا ایک ایک کونا چھان مارا لیکن ایسا کوئی پرزہ تک حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے جس سے آئی میں یا اس کی ساقھی کی شناخت میں مدد ملتی۔ وہ دونوں بہت قلیل وقت میں فرار ہوئے تھے لیکن انہوں نے ہر ممکن احتیاط سے کام لیا تھا۔

اس کام سے منٹ کر میں نے اسی گھر کے فون سے وہ نمبر ملانے کا فیصلہ کر لیا جس سے مکان کرائے پر لینے کے لیے رجوع کرتا تھا۔ ہم پانچوں ایک مرتبہ گھر سے نکل کھڑے ہوئے تھے تو ہمیں کچھ نہ کچھ نتائج حاصل کر کے کھروٹنا چاہیے تھا۔

اس نمبر پر رابطہ ہوا تو یہ انکشاف ہوا کہ پورڈر دیا ہوا نمبر کسی گھر کے بجائے اسٹیٹ ایجنسی کا تھا۔ مکان کے خالی ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں اس نے میرے سوال کو محول

مول جواب میں ٹال دیا اور دعوت دی کہ میں اس کے دفتر پہنچ کر اس سلسلے میں بات کروں۔ انشورنس اور جائیداد کا کام کرنے والوں کو چھیڑنا عام طور پر اپنی شامت کو دعوت دینے کے مترادف ہوتا ہے۔ یہ لوگ سراپا اخلاق و انکسار بن کر اس ہمدردی کے ساتھ متبادل مشورے پیش کرتے ہیں کہ ان کا گایک الفاظ کی بھول بھلیوں میں بھٹک کر اپنا مقصد فراموش کر بیٹھتا ہے اسے ہوش اس وقت آتا ہے جب وہ ایک معقول رقم دے کر کسی کم تر سودے کا پابند ہو چکا ہوتا ہے۔

شاید اس کا مدعا بھی یہی رہا ہوگا۔ اگر میں واقعی ضرورت مند ہوتا تو وہ مجھے کوئی اور مکان کرائے پر دلا کر اپنا کمیشن کھرا کر سکتا تھا۔

اس فون کال کے بعد ہمارا وہاں ٹھہرنا بے سود تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ ہماری واپسی میں تاخیر سے وہ تینوں بے آرام ہو رہے ہوں گے۔ ہم گھر کی پتیاں بھجاتے ہوئے صدر دروازے سے باہر نکلے تو وہ تینوں ہمہ تن ہمارے منتظر تھے۔

اسٹیٹ ایجنسی سے چھان بین کرنے کے لیے اتنے بڑے لشکر کی ضرورت نہیں تھی۔ پورج سے باہر نکلنے ہوئے میں نے انہیں تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کیا اور سلطان شاہ کے ساتھ گھر واپس لوٹ جانے کا مشورہ دیا جو بے چون و چرا قبول کر لیا گیا۔

سلطان شاہ نے پھانک کے ذیلی دروازے کو اندر سے

بولٹ کرنے کے بجائے باہر سے کنڈا لگانے پر اکتفا کیا۔ اگر اس مکان کا مالک حد سے زیادہ بے چارہ تھا تو ہمیں اس کے اسباب کے بارے میں بہت زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔

سلطان شاہ دونوں عورتوں کو لے کر میری گاڑی میں گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں اول خان کے ساتھ اسٹیٹ ایجنسی کی طرف چل دیا۔

فون پر مجھے توحید کریشل کا پتا دیا گیا تھا۔ وہ وہی علاقہ تھا جہاں ہم نے فریڈم انٹرنیشنل نامی این جی او کے کاروبار پود بکھیرنے کے لیے اپنا کافی وقت گزارا تھا۔

فیر فائیو کے اس کرشش ایریا میں ہمیں اپنی مطلوبہ اسٹیٹ ایجنسی تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ المونیم کے فریم میں جڑے ہوئے تاریک شیشوں کے فرنٹ والا وہ دفتر باہر سے دیکھنے میں زیادہ چوڑا نہیں تھا لیکن اندر پہنچنے پر اندازہ ہوا کہ اس کی غیر معمولی گہرائی نے رقبہ معقول حد تک بڑھا دیا تھا۔

بیرونی دفتر میں بڑی ہوئی کئی میزوں میں سے صرف ایک کے پیچھے خوش لباس نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی عمر چغلی کھا رہی تھی کہ وہ اس دفتر کا مالک نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے خوش اخلاق کے ساتھ ہم دونوں کو بیٹھنے کی پیش کش کرتے ہوئے ہماری ضرورت کے بارے میں سوال کیا۔

اس دوران میں، میں نے اندازہ لگالیا تھا کہ اندرونی کمرے میں، تاریک شیشے کی دیواروں کے پیچھے کچھ غیر معمولی نقل و حرکت ہو رہی تھی۔ میں نے بیٹھے ہوئے لڑکے کو بتایا کہ ہم ایک خاص مکان کے بارے میں ایجنسی کے مالک سے ملنے کے لیے آئے تھے۔

بے ساختہ اس کی نظرس اندرونی کمرے کی طرف اٹھ گئیں۔ اس نے دوبارہ ہماری طرف دیکھا تو اس کی نگاہوں میں بے بسی رچی ہوئی تھی۔ اس نے دھیمی آوازیں کہا ”سرا! میں آپ کی ہر خدمت کے لیے تیار ہوں۔ صاحب کے پاس مہمان آئے ہوئے ہیں۔ وہ مصروف ہیں۔“

”سنو لڑکے!“ اول خان نے بزرگانہ تحکم سے کہا ”ہم یہاں وقت برباد کرنے نہیں آئے۔ تمہارا صاحب شاید اس کمرے میں ہے۔ تم اسے نہیں بلا سکتے تو ہم وہیں چلے جاتے ہیں۔“

وہ نوجوان بوکھلا گیا ”نہیں نہیں۔ آپ آرام سے بیٹھیں۔ میں دیکھتا ہوں۔“

اس نے ہم سے ہمارے نام جاننا چاہے تو اول خان نے

چکر کرنا "بتا دو کہ ہم ایک تحقیقاتی ایجنسی سے آئے ہیں۔" ایجنسی کا لفظ سننے ہی نو جوان کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ اس نے تیز دھار چھڑی کے نیچے آئے ہوئے کمرے کی طرح بے بسی سے ہماری طرف دیکھا اور میز پر سے فون کا ریسیور اٹھالیا۔ اس نے ایک مٹن دبا کر چند لمحوں تک انتظار کیا پھر بہت دھیمی آواز میں کسی کو بتایا کہ کسی ایجنسی کے دو افسران اس سے ملنے کے لیے آئے ہوئے ہیں۔

اس دوران میں میری نظرس اندرونی کمرے کی دیوار پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ بات ختم ہوتے ہی تاریک شیشوں کی دیوار کے پیچھے تاریک تر انسانی ہیولوں کی اضطرابی پائل نظر آئی۔ شاید وہاں کچھ بھگدڑ کی سی صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔

چند لمحوں بعد اندرونی کمرے سے دو سسیمی لڑکیاں اپنے لباس سینیٹی ہوئی۔ برآمد ہوئیں اور ہم سے نظرس چراتی ہوئی تیزی سے باہر نکلی چلی گئیں۔ دفتر اڑکنڈیشنڈ تھا۔ وہ قریب سے گزریں تو میرے نتھنوں میں الکحل کی تیز بو آئی جو شاید ان کے سانسوں میں رچی ہوئی تھی۔

مجھے ان لڑکیوں کے بارے میں زیادہ دیر تک سوچنے کا موقع نہیں مل سکا۔ لڑکیوں کو رخصت کر کے ایجنسی کا متوسط قامت مالک اندرونی کمرے سے نکل آیا۔

اس کی محمور نگاہوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ خاصی پئے ہوئے تھا۔ اول خان نے توہن آمیز لہجے میں کہا "اپنے کمرے میں گھس کر لڑکیوں کو شراب پلا رہے تھے۔"

اس نے بے بسی سے دانت نکال دیے "میں خود پی رہا تھا۔ وہ بے چاریاں تو ملازمت کے لیے انٹرویو دینے کے لیے آئی تھیں۔"

اول خان قدرے مذہبی رجحان رکھنے والا جذباتی آدمی تھا۔ اس کے ہنسنے کا احساس ہوتے ہی میں نے ایجنسی کے مالک سے کام کی بات چھیڑ دی۔

ابتداء میں اس نے بتایا کہ بی باون کے نمبر سے معروف وہ مکان خالی ضرور تھا مگر حرمت کے کچھ کاموں کی وجہ سے فوری طور پر قبضہ دینے کے قابل نہیں تھا۔ جب اسے یہ دھمکی دی گئی کہ وہ مکان ہم دیکھ کر آئے تھے تو اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ ویسے بھی وہ مے نوشی کی وجہ سے کچھ اعصاب زدہ ہو رہا تھا۔ جھوٹ کے ترکش کا پہلا تیر ضائع ہوتے ہی سوچ بولنے پر آمادہ ہو گیا۔

وہ مکان کینڈا میں مقیم ایک پاکستانی کی ملکیت تھا۔ اس نے اپنا روزگار مستحکم کرتے ہی اپنی فیملی کو کینڈا بلا لیا تھا۔ اپنا رہائشی مکان دیکھ بھال اور کرائے پر دینے کے لیے اس شخص

کے حوالے کر دیا تھا۔ مکان زندگی کی تمام برقی ضروریات سے آراستہ تھا اس لیے معقول کرائے پر چلا گیا۔ چھپلے کمینوں کے پلے جانے کے بعد وہ گھر خالی پڑا ہوا تھا کہ ایک مقامی نے ڈیڑھ ماہ پہلے اس سے رجوع کیا۔ وہ صرف تین ماہ کے لیے چالیس ہزار ڈالر کرایہ ادا کرنے پر آمادہ ہو گیا تھا۔

وہ مدت اتنی کم تھی کہ اسٹیٹ ایجنٹ کو لالچ آ گیا۔ وہ مالک مکان کو اطلاع دیے بغیر پورے چالیس ہزار ڈالر ہضم کر سکتا تھا۔ اس نے ایک ماہ پہلے پوری رقم پیشگی لے کر مکان کی چابی نادر کے حوالے کر دی۔ خود اس کی نیت خراب تھی اس لیے کرایہ نامہ وغیرہ بھی نہیں لکھا گیا۔ اس نے نادر کو رقم کی چکی رسید دی اور اس سے مکان اور سامان کی فہرست پر دستخط لے لیے۔

بی باون کی طرف سے گزرتے ہوئے اس نے کئی بار دیکھا کہ مکان پر ٹوٹ کا بورڈ لٹکا ہوا ہے۔ وہ خاموش رہا۔ بورڈ کا لٹکا رہنا اس کے حق میں تھا۔ مالک مکان کا کوئی رشتہ دار ادھر سے گزرتا تو وہ بھی یہ سمجھتا کہ مکان خالی پڑا ہوا ہے۔

اسٹیٹ ایجنسی والے کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اس مکان میں نادر کے بجائے کوئی اور رہا تھا۔

اس کے پاس نادر کا پتا موجود تھا جو میں نے نوٹ کر لیا۔ وہ یقینی طور پر آئی مین کا کوئی قریبی ساتھی تھا جس کے لیے ہوئے مکان میں وہ پوری بے فکری سے رہ رہا تھا۔

اس سے سب کچھ معلوم کر لینے کے بعد جب اول خان نے اسے یہ بتایا کہ بی باون میں ایک خطرناک غیر ملکی مجرم رہ رہا تھا تو اس کے طوطے اڑ گئے۔ اس کا نشہ ہماری پوچھ بچھ کے باعث پہلے ہی ہرن ہو چکا تھا۔ وہ فوری طور پر چالیس ہزار ڈالر ہمارے حوالے کرنے پر آمادہ ہو گیا۔

وہ حرام کا مال تھا جو اس نے کھلی بے ایمانی سے لوٹا تھا۔ اس رقم کا اس کے پاس رہنا اس کی حوصلہ افزائی کرنے کے مترادف ہوتا۔ میں نے ایدھی سینئر کو حوالے کرنے کی نیت سے وہ چالیس ہزار ڈالر اس سے واپس لے لیے۔

ہم نے اسے یہ بتایا تھا کہ وہ اپنی بے خبری کے باعث ایک خطرناک چکر میں لوٹ ہو چکا تھا۔ اگر اس نے ہماری آمد اور بی باون کے کمینوں کے بارے میں باز پرس کے سلسلے میں کہیں بھی اپنی زبان کھولی تو وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ اس کے لیے وہ انکشاف لرزہ خیز ثابت ہوا اور وہ گھٹیا لگا۔

اس کا نو جوان ملازم اس وقت تک دفتر سے باہر تھا۔ وہ

ڈورا آگے بٹھی تو اس نے ڈرائیونگ سیٹ پر انتظار میں بیٹھے ہوئے شخص کو پہچان لیا۔ ”یہ آئی بی کا ڈرائیور ہے۔ ہو سکتا ہے کہ جلال آیا ہو۔“

”جلال!“ میں نے حیرت سے کہا ”صبح تو وہ اسلام آباد میں تھا!“

”اس کے لیے اسلام آباد اور کراچی ایک ہیں۔ ان لوگوں کے کام کی نوعیت ایسی ہے کہ اسے پورے پاکستان میں دوڑ لگانی پڑتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ شام کی پرواز سے کراچی پہنچا ہو اور تمہارے لیے کوئی اہم خبر لایا ہو۔“

اول خان کی گاڑی کا بارن سن کر سلطان شاہ نے دروازہ کھولا۔ ہم اس کے ساتھ اندر داخل ہوئے تو ڈرائیونگ روم میں جلال الطیمنان سے بیٹھا ہوا تھا۔

وہ ہم سے بہت تپاک سے ملا۔ اس سے پہلے کہ میں اس سے فون نہ کرنے کے بارے میں کوئی معذرت کرتا، وہ خود ہی بول پڑا ”اگر تم نے مجھے فون کیا ہو گا تو ایسی ہوئی ہوگی۔ میں کسی کو کچھ بتانے بغیر کراچی کا رخ کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔“

”یہی کیا مجبوری پیش آئی۔“ اول خان نے ہنس کر سوال کیا۔

”ہمیں ہر وقت مجبوریاں پیش آتی رہتی ہیں۔ کبھی کبھی تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم اپنی مرضی سے سوچھی نہیں سکتے۔“ جلال نے ایک گھبراہٹ سے جواب دیا۔

”یہ سراسر فرض شناسی کی باتیں ہیں اور فرض شناسی ایک مملکت بیماری ہے۔“ سلطان شاہ نے بڑے حوصلے کے ساتھ تبصرہ کیا ”میں نے تو ایسے سرکاری افسر بھی دیکھے ہیں جو اپنا وقت گزارنے اور تنخواہ لینے کے لیے دفتر آتے ہیں۔ کوئی کام کرنا ہی بڑبڑاتے تو اسے گناہ سمجھ کر انجام دیتے ہیں۔“

”ایسے حرام خوروں کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔“ اول خان نے وثوق سے کہا ”ان کی اولادیں بڑبڑاتی ہیں یا بیماریاں گھر دیکھ لیتی ہیں۔ انہیں گھریلو زندگی کا کچھ بھی نہیں ملتا۔“

”یہ باتیں بعد میں ہو سکتی ہیں۔ یہ بتاؤ کہ آئی مین کا کیا بنا۔“ جلال نے مجھ سے پوچھا۔

”اس بارے میں تمہیں کیسے پتا چلا؟“ میں نے حیرت سے سوال کیا۔

”حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں تم سے پہلے یہاں آ گیا تھا۔ ویرا اور سلطان شاہ نے آئی مین کے فرار تک کی آدھی کمائی سنا دی ہے۔“

”اسٹیٹ ایجنٹ ہماری کوئی مدد نہیں کر سکا۔ وہ مکان نادر نامی ایک شخص نے بھاری کرائے پر تین ماہ کے لیے لیا

ملازمت کے لیے انڈویو دینے والی سب سے چار یوں کے پیچھے سر جھکا کر باہر نکل گیا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ اس کا صاحب بہت غلط موقع پر رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔ وہ خود بے قصور تھا اس لیے شرمندہ تھا۔

اسٹیٹ ایجنسی سے اس سے زیادہ معلومات حاصل ہونے کی کوئی امید نہیں تھی۔ وہاں تسلی بخش طور پر اپنا کام پورا کر کے ہم واپس روانہ ہو گئے۔

”اس نے بہت مجبور ہو کر فرار کی راہ اختیار کی ہے۔“ ڈیفنس سے کورنگی روڈ پر آنے کے بعد اول خان نے کہا ”وہ پس پردہ رہ کر دوسروں پر فون کے ذریعے اپنا حکم چلانے کا عادی ہے۔ اب اس کے سارے رابطے ٹوٹ جائیں گے۔“

”شاید تمہارا خیال درست ہو۔ تم اس کی راجا سے ہونے والی گفتگو بھول رہے ہو۔ اس کے آدمی اسے ناگزیر ضرورت کے تحت فون کرتے ہیں ورنہ وہ خود فون کر کے انہیں ہدایات دیتا ہے۔“

”غزالہ نے ہمیں اس کا رخ کرنے کا مشورہ بہت بروقت دیا تھا مگر وہ پھر بھی بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا!“ اول خان نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔

”نکل جائے مگر بکری کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ میرا خیال ہے کہ نادر اسے پہچان لے گا۔“

”کیوں نہ میں اسی وقت اپنے آدمیوں کو نادر کی راہ پر لگا دوں؟“ اول خان نے چونک کر پوچھا۔

”اس نیک کام میں دیر نہ کرو۔ آئی مین نادر کی اہمیت سے غافل نہیں ہو گا۔“

اول خان نے اسی لمحے آپریشن بر اسٹیشن فور کے ریڈیو روم سے رابطہ کیا اور آپریشن کو نادر کے بارے میں ہدایات دینے میں مصروف ہو گیا۔

آئی مین کا نام سامنے آنے کے بعد ہم دو افراد پر ہاتھ ڈالنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ دونوں ہی اس کے صورت آشنا نہیں تھے۔ راجا اور اسٹیٹ ایجنٹ کے بعد صرف نادر ایسا آدمی تھا جو آئی مین کی شناخت پر روشنی ڈال سکتا تھا۔



گھر کے باہر ایک نامانوس گاڑی کھڑی دیکھ کر میں چونک پڑا۔

”ڈرائیور کے ساتھ ہمارے گھر کون آیا ہوا ہے؟“ میں نے پرتشوش آواز میں کہا۔

اول خان نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ گاڑی

تھا۔“ میں نے بتایا اور اختصار سے وہاں پیش آنے والے واقعات دہرا دیے۔
 ”اب تم نادر کے پیچھے جاؤ گے۔“ جلال نے تصدیق چاہی۔

”اول خان نے اپنے آدمیوں کو اس کی تلاش پر مامور کر دیا ہے تاکہ آئی مین کو اپنا کام دکھانے کا وقت نہ مل سکے۔“

”مجھے یہاں آکر پتا چلا ہے کہ شی دوبارہ سر اٹھا رہی ہے۔ میں بھی اپنے آدمیوں کو ہوشیار کر دوں گا۔“

”اس فتنے کو ہم سب کو مل کر پکڑنا ہوگا۔ ان لوگوں کو ایک مرتبہ بننے کا موقع مل گیا تو انہیں اکھاڑنا مشکل ہو جائے گا۔“ دیرانے کہا۔

”ان کے بارے میں تم سے زیادہ کون جان سکتا ہے۔“ جلال ہنس کر بولا۔

”اب تک تم نے یہ نہیں بتایا کہ تم کو اچانک کراچی کیوں آنا پڑا۔“ میں نے جیسے لہجے میں پوچھا۔

”کئی سبب تھے۔ ان میں سے ایک تم سے ملنا بھی تھا اور میں یہاں موجود ہوں۔“

”تم مجھ سے ملنے کی ضرورت محسوس کر رہے تھے تو یقیناً کوئی خاص بات ہوگی۔“

”میرا خیال تھا کہ لیری کی موت کے بعد مظہر کا قصہ دب جائے گا مگر ایسا نہیں ہوا۔ دونوں ملکوں کے درمیان سفارتی سرد مہری کی وجہ سے بھارتی کوئی عملی اقدام اٹھانے سے قاصر ہیں لیکن انہوں نے دل کھولی کراچیوں کے کان بھرے ہیں۔ انہوں نے اب ایک نیا لہرہ لگایا ہے کہ پاکستان خطرناک بین الاقوامی مجرموں کی جنت بنتا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے کھل کر تمہارا ’مظہر‘ دیر اور ماجد کا نام لیا ہے۔“ جلال نے بتایا۔

”سارا چکر دو آدمیوں کا ہے۔ وہ ایک عرصے سے امریکیوں کے سر پر سوار ہیں۔“ غزالہ نے کہا۔

”آدمی دو ہی ہیں لیکن ڈینی نے اپنے ہر بہروپ کو اتنی کامیابی سے نبھایا ہے کہ امریکی ابھی تک سب کو الگ الگ افراد سمجھ رہے ہیں۔“ سلطان شاہ بولا۔

”انہوں نے دھکے چھپے الفاظ میں دھکی دی ہے کہ جب تک یہ چاروں افراد پکڑ کر امریکی حکام کے حوالے نہیں کیے جاتے، ہر بین الاقوامی واردات کا ڈسے دار پاکستان کو قرار دیا جائے گا۔“ جلال نے اپنی بات جاری رکھی۔

”یہ کیا بات ہوئی۔ کیا ساری دنیا کی ڈسے داری پاکستان

تازہ ترین

نوجوان کی شادی قریب تھی۔ ایک روز اس نے اپنی منگیت سے کہا ”میں تم سے کوئی بات چھپانا نہیں چاہتا۔ میں چاہتا ہوں شادی سے پہلے تمہیں اپنے معاشقوں کے بارے میں بتا دوں۔“

”تم دو ہفتے پہلے مجھے اپنے تمام معاشقوں کے بارے میں بتا چکے ہو اور میں نے تمہیں معاف کر دیا تھا۔“ منگیت نے یاد دلایا۔

”وہ تو ٹھیک ہے۔۔۔ لیکن وہ دو ہفتے پہلے کی بات تھی۔۔۔“ نوجوان بولا۔



پروڈال دی جائے گی۔“ اول خان نے تضحی سے کہا۔
 ”شاید مجھ سے غلطی ہو گئی، بات ساری دنیا کی نہیں تھی۔ وہ پاکستان میں آئندہ رونما ہونے والے واقعات کے بارے میں پیش بندی کر رہے ہیں۔“ جلال نے اپنی تصحیح کی۔
 ”اس بارے میں ہم سب پہلے ہی محتاط ہیں۔ تم بتا چکے ہو کہ ہمیں امریکیوں سے دور رہنا چاہیے۔“ میں نے اسے یاد دلاتے ہوئے کہا ”مگر اب اچانک آئی مین سامنے آ گیا ہے۔ تم خود بتاؤ کہ اسے کیسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ اس کی موت پر وہ شور مچا دیں گے کہ کراچی میں ایک اور معزز امریکی مار دیا گیا۔ ان کی اس بد معاشی کا کیا علاج ہے۔“

”شہادتیں جمع کرتے رہو۔“ جلال نے تلقین کی ”راجا ہلا گواہ ہے۔ اسٹیٹ ایجنٹ اور لی باؤن کے آس پاس کام کرنے والے مزدور بھی کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔ کوئی کیس بنتا ہے تو ہم اس کے انجام سے پہلے ذرائع ابلاغ میں خبریں پھیلا دیں گے کہ ایک مشتبہ اور نامعلوم امریکی کراچی میں منشیات کے کاروبار پر قبضے کا پروگرام بنا رہا ہے۔“

”بس اس میں ایک خرابی ہے۔ ہم راجا کو اپنی تحویل میں نہیں رکھ سکیں گے۔“ اول خان نے کہا ”ریکارڈ درست رکھنے کے لیے اسے باضابطہ طور پر پولیس کی تحویل میں دینا پڑے گا۔“

کو ٹوکا۔ ”میں جانتا چاہ رہی ہوں کہ وہ کس کھپ کی بات کر رہا ہے۔“

”راوالے یہاں دل کھول کر پیسا خرچ کر رہے ہیں۔“ جلال نے اپنی بات جاری رکھی ”وہ رعایتی دامنوں پر راجا جیسی سے ہیروئن کے لے کر جوشی کے ذریعے غریب بستیوں میں مفت بانٹ رہے ہیں اس خسارے کی بڑی رقم وہ ہیروئن کی تیاری میں استعمال ہونے والے کیمیکل کی اسمگلنگ سے پوری کر رہے ہیں۔“

”چوڑا بھارت سے اسٹینک ہائیڈرامنڈ اسمگل کر رہا ہے!“ ویرانے بے یقینی سے پوچھا ”اور ہم اس کمروہ دھندے سے بے خبر ہیں۔“

”اس کا طریقہ کار بے داغ ہے۔“ جلال نے اعتراف کیا ”بھارت سے کراچی اور اسلام آباد میں متعین سفارتی عملے کے لیے ڈیوٹی فری شرٹیں آتی ہیں جو بانڈیڈ ویراؤسز میں ذخیرہ ہوتی ہیں۔ سفارت خانے اور قونصل خانے والے اپنی ضرورت کے مطابق وہاں سے کرٹ منگواتے رہتے ہیں۔ کراچی آنے والی ایک خاص برانڈ کی بوتلوں میں شراب کے بجائے بھارتی کیمیکل ہوتا ہے۔ چوڑا صرف داؤچر جاری کرتا

ہے۔ گودام والے بے خبری میں آلہ کار بنے ہوئے ہیں۔ وہ اس برانڈ کی بوتلیں جوشی کے آدمی کو دے دیتے ہیں۔ وہ پورے کرٹ راجا کے اڈے پر پہنچا دیتا ہے۔ وہاں سے بوتلیں ہیروئن بنانے والوں کو بیچ دی جاتی ہیں۔“

”اور اب تم ان بوتلوں کی کسی کھپ کو پکڑنے کے چکر میں ہو۔“ ویرانے حیرت سے پوچھا۔

”مجبوری ہے اس گھٹاؤ نے کام کو ختم ہونا چاہیے۔“ جلال نے کہا ”چوڑا تمہاری دسترس سے دور اپنے قونصل خانے میں چھپا بیٹھا ہے۔ وہ پاکستانی شہری ہے اس لیے ہم اسے پانپنیدہ سفارت کار قرار دے کر ملک بدر نہیں کر سکتے۔ اگر ہم کیمیکل سے بھری ہوئی شراب کی سرہند بوتلیں پکڑ لیتے ہیں تو نہ صرف گودام سیل ہو جائے گا بلکہ ہم چوڑا کو باضابطہ وارنٹ کے تحت گرفتار کر سکیں گے۔ میرے لیے یہ معاملہ اچانک بہت اہم ہو گیا ہے۔“

”ہونا چاہیے۔“ میں نے اقرار کیا ”اس طرح تم ایک تیرے کئی شکار مکیلو گے۔ سب سے بڑی کامیابی یہ ہوگی کہ قونصل خانے میں روپوش چوڑا گرفتار ہو جائے گا، اس کا ہیروئن اور کیمیکل کی تقسیم کا کام چوٹ ہو جائے گا۔ کیمیکل کی اسمگلنگ کی یہ خطرناک اور محفوظ ترین راہ ہمیشہ کے لیے مسدود ہو جائے گی اور کچھ عرصے کے لیے منڈی میں ہیروئن

”اس وقت میں یہی چاہ رہا ہوں۔“ میں نے مہموں کو قانون کی روایتی گرفت میں چاہا۔ ”آئی بین نامی آجائے تو اسے ذبح کر ڈالنا۔ پہلے سے کہیں تیار ہو گا تو یہ کہنے کی گنجائش رہے گی کہ آئی بین گروہ بندہ ادا کی گئی کا نشانہ بن کر مارا گیا۔“

اول خان کوئی جواب نہ دیا۔ ”جائے جا۔“ دیکھنے لگا۔ میں نے مسکراتے ہوئے ہالال کہا۔ ”تمہیں سہولت ہے تو ایسا کرنے میں ادا میں نہیں ہا، تو اسٹیٹ ایجنٹ کو بھی پکڑا دو۔ اس ادا کو، رقم یہی ماسٹر ہے۔“ میں نے چالیس ہزار ڈالر کے نوٹوں کی روایتی نامی ہوئی گڈی اس کے سامنے ڈال دی۔

جلال نے میری پیش کش کو رد عمل کا مظاہرہ کرنے کے بجائے اپنی بات جاری رکھی ”مجھے نئے ڈاٹا سامنے آئے ہیں اور ہم کسی تازہ کھپ کے متاثر ہیں۔“

”کھپ؟“ ”کس چیز کی کھپ؟“ ویرانے قیہ زدہ لہجے میں سوال کیا۔

”جوشی درمیان کا بہت اہم آدمی تھا۔“ ہالال نے ایک گہرا سانس لے کر کہا ”میں جہاں تھا کہ اس کی اتنی اہمیت تھی کہ چوڑا اور راجا اسے ہر قیمت پر تم لوگوں کی گرفت سے بچانے کی کوششیں کر رہے تھے اور جب ہر داؤ نامم ہوتا نظر آیا تو اسے مروا دیا گیا۔“

”تم سے چوڑا اور راجا کے بارے میں بات ہوتی رہی لیکن شاید میں نے بھی جوشی کا نام نہیں لیا۔“ میں نے اس کی بات کاٹ کر حیرت سے کہا۔

”شاید تم نے اس کا ذکر نہ کیا ہو مگر میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ ہر شر میں رونما ہونے والے اہم واقعات کی رپورٹیں مجھے باقاعدگی سے ملتی ہیں۔ بمبئی بازار میں نامعلوم حرفیوں کے درمیان دھواں دھار فائرنگ کے تبادلے اور پھر جوشی کے اغوا کی خبر معمولی نہیں تھی۔ آج صبح سویرے راجا کے اڈے سے اس کی لاش برآمد ہوتے ہی میرے آدمیوں نے مجھے اطلاع دی تو میں نے انہیں کام پر لگا دیا۔ انہوں نے جہاں کن تیزی دکھائی اور یہ بتا چلا کہ جوشی دراصل چوڑا اور راجا کے درمیان رابطے کا کام انجام دے رہا تھا۔“ ”اور ویرا غلطی سے اس کو چھینٹ کر مٹی!“ اول خان نے بے ساختہ لقمہ دیا۔

”کھیل یہی ہے کہ شی کے پرانے مہموں کو ایک جا کر کے ایک بڑی طاقت میں تبدیل کیا جائے۔“ میں نے کہا۔ ”جلال کو اپنی بات مکمل کرنے دو۔“ ویرانے ہم دونوں

برائے علاج

حامد صاحب کے پڑوسیوں نے ان کی بیگم سے شکایت کی ”آپ کے شوہر بہت شور مچاتے ہیں۔ وہ گھر میں اور گلی میں ہر وقت کڑک مرغی کی طرح رکت رکت کرتے پھرتے رہتے ہیں۔“

”میں تو خود ان کی اس عادت سے بہت تنگ ہوں۔“ مسز حامد افسردگی سے بولیں ”گلنا ہے ان کا ذہنی توازن درست نہیں۔ وہ خود بومرغی سمجھتے ہیں۔“

”کیا آپ ان کا کچھ علاج نہیں کر سکتیں؟“ ایک پڑوسی نے پوچھا۔

”علاج کے لیے ضروری ہے کہ انہیں انڈوں پر بٹھادیا جائے اور ہمارے گھر میں انڈے نہیں ہیں۔“ مسز حامد نے بے بسی سے جواب دیا۔

سازی پر برا وقت آجائے گا کیونکہ کیمیکل کی سپلائی کا ایک لگا بندھا ذریعہ ختم ہو چکا ہوگا۔“

”اب تم بتاؤ کہ میں کراچی کیسے نہ آتا؟“ اس نے مسکرا کر سوال کیا۔

”تمہارا یہاں موجود ہونا گمراہ تھا۔ اس بار تمہارے آدمیوں نے اپنی کارکردگی سے مجھے حیران کر دیا ہے۔ اتنے کم وقت میں یہ سب معلوم کرنا آسان نہیں تھا۔ اول خان بولا۔“

”اس کامیابی کی داغ بیل تم لوگوں کی ذالی ہوئی ہے۔ چوڑا کی روپوشی، راجا کے نام نہاد فرار اور جوشی کے نسل نے پورا منظر نامہ تیار کر لیا ہوا تھا۔ ہوتا یہ ہے کہ ابھی ہوئی تھی اسی وقت تک پریشان کرتی ہے جب تک سراہا تھ نہیں آتا۔ ایک بار سراہا تھ آجائے تو پوری گتھی تیزی سے سلجھتی چلی جاتی ہے۔“

”شاید جوشی کی ذات اس گتھی کا ایک سرا تھی۔“ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”شی کا وہ پرانا پاپی پوری کمائی میں کیس فٹ نہیں ہو رہا تھا۔ میرے آدمیوں نے اپنے کام کا آغاز اسی کی ذات سے کیا اور پتا چلا کہ مٹی کے مادھو کی طرح گوشہ نشینی کا سوا لگ

رچانے والا اپنی ہیرا پھیری سے باز نہیں آیا بلکہ پوری تن دی سے موت کی سوداگری میں مصروف ہے۔“

”اپنے اسی کلیدی کردار کی وجہ سے وہ مارا گیا ورنہ کسی کو اس کی پروا بھی نہ ہوتی۔“ ویرا بولی۔

”اور اس کی موت کی وجہ سے میری توجہ اس کی طرف مبذول ہوئی۔ اس وقت گودام میں کیمیکل والی بوتلیں نہیں ہیں جیسے ہی کوئی نئی کھپ آئے گی ہم چھاپا مار کر گودام کو سرہ مہر کر دیں گے اذریکارڈ اپنے قبضے میں لے لیں گے۔ سب سامنے آجائے گا کہ بھارت سے آنے والی وہ بوتلیں کہاں جاتی تھیں۔ میں نے اپنے آدمیوں کو چوبیس گھنٹے کی ڈیوٹی پر لگا دیا ہے۔“

”تم اس بار لمبا پلان لے کر آئے ہو۔ اسٹیٹ ایجنٹ پر ہاتھ ڈالو گے تو ان دو آوارہ لڑکیوں کو ضرور پکڑنا جو حقیقی ضرورت مند لڑکیوں کی پیشانی کا داغ بنی ہوئی ہیں۔“ اس کی بات پوری ہو جانے پر ویرا نے پر زور لہجے میں مطالبہ کیا۔

”یہ کن لڑکیوں کا ذکر ہے؟“ جلال نے حیرت زدہ ہو کر مجھ سے سوال کیا۔

میں نے جلال کو ان کے بارے میں بتایا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے بھی ان کے لیے اپنے دل میں نفرت کا زہر بھرتا ہوا محسوس کیا تھا۔

”وہ بھی اہم ہیں۔ وہ گواہی دیں گی کہ دو سرکاری افسروں کی آمد کی اطلاع پاکر اسٹیٹ ایجنسی کے مالک نے انہیں اپنے کمرے سے نکال دیا تھا۔ اب بات قانون کے دائرے میں رہنے کی ہے تو ہم کو ہر گز سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ اب ہم ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جائیں گے۔“ سلطان شاہ نے ناپوسی سے پوچھا۔

”اب ہم اتنے بے بس بھی نہیں ہیں۔ بس کشت و خون سے دامن بچا رہا ہے۔ کیس سجا کر پولیس کی خدمت میں پیش کر دیا جائے گا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہوگی۔ یہاں پہلے بھی ایسا ہوتا رہا ہے۔“ ویرا نے اسے یاد دلانے کی کوشش کی۔

جلال نے چوڑا کو اس کے بل سے نکالنے کی جو راہ سوچی تھی وہ بہت موثر نظر آرہی تھی۔ اس کے بعد ہمارے لیے راجا کی افادیت ختم ہو گئی تھی۔ جلال کی یاد دہانی پر اول خان نے اس سے وعدہ کر لیا کہ وہ اگلے روز راجا کو دوبارہ پولیس کی تحویل میں دے دے گا۔

”اسے تمہارے طفیل نئی زندگی مل رہی ہے ورنہ ہم نے اسے ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔“ میں نے بو بھل لہجے

ظہار کیوں نہیں کیا؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔
 ”وہ اپنی مرضی کا مالک نہیں ہے۔ میں اس کی مجبوریوں کو سمجھتا ہوں اس لیے خاموش رہا۔“ اول خان نے وضاحت کی ”وہ اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کہتا۔ ہمیں اوپر سے آنے والے فیصلوں کی اطلاع دیتا ہے۔ میں ایسی کوئی بات کرنا پسند نہیں کرتا جو اس کی دل آزاری کا سبب بنے۔“

”یہ تمہارا وہم ہے کہ بیویوں کا وزن بڑھ رہا ہے۔ اچھا ہے کہ اب یہ لوگ قانون کے ہاتھوں اپنے کفر کدو کو پھینچ گئے۔“ ویرا نے کہا۔

”قانون گواہ اور شہادتیں مانگتا ہے۔ وہ کہاں سے لاؤ گی؟ ان کمزوریوں کی وجہ سے بعض اوقات قاتل بری ہو جاتے ہیں۔ ابھی تک ہم اپنی صوابدید سے اپنے مجرموں کے مقدر کا فیصلہ کیا کرتے تھے۔ اب ہم آزادی سے فیصلے نہیں کر سکیں گے۔ ہمیں ہر قدم چھوک چھوک کر رکھنا ہوگا۔“

”ہم میں سے کوئی اس کا تابع نہیں ہے۔“ غزالہ بولی۔
 ”یہ بات اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ ایس ٹی ایف کا اپنا ڈسپن اور طریقہ کار ہے، تم کسی صورت میں اس سے انحراف نہیں کر سکتے۔ اس نے اپنی ایک مجبوری ہمارے سامنے پیش کی ہے۔ ہم نے مناسب سمجھا تو اس پر عمل کریں گے ورنہ اپنے فیصلے نافذ کریں گے۔“

چند لمحوں کے لیے عجیب صورت حال پیدا ہو گئی۔ غزالہ کی اس وضاحت پر سب نے بیک وقت بولنا شروع کر دیا۔ پھر سب ہی ایک دوسرے کا خیال کر کے ایک ساتھ چپ ہو گئے۔ اس مضحکہ خیز چوبیٹن پر ویرا کھلکھلا کر ہنس پڑی اور اول خان نے بولنا شروع کر دیا۔

”ہم کافی عرصے سے اس طرح ایک جان دو قالب ہو کر کام کر رہے ہیں کہ اس کی ہر بات میرے دماغ میں ٹیٹھی چلی گئی۔ ابھی حال ہی کی بات ہے کہ اس نے ہمیں جان سے دور رہنے کا مشورہ دیا تھا مگر ڈینی نے ماجد بن کر اس کی درگت بنا دی۔ بعد میں وہ بھی اس کا ردوائی پر خوش ہوا تھا۔“

”اس کی دو شخصیتیں ہیں۔ ایک ذاتی اور دوسری سرکاری۔ ذاتی حیثیت میں وہ بھی بہت سے سرکاری فیصلوں کو پسند نہیں کرتا ہوگا۔“ ویرا بولی۔

”جہاں تک ممکن ہوگا ہم اس کے مشورے کا خیال رکھیں گے ورنہ آزادی سے کام کریں گے۔“ میں نے انہیں پالیسی کا انچوڑ سنایا۔

میں کہا۔
 ”تمہیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ منشیات فروشی تقریرات پاکستان میں ایک سنگین جرم ہے۔ عدالت میں سب کچھ اسی طرح ثابت ہوتا چلا گیا تو اسے سزائے موت بھی مل سکتی ہے ورنہ عر قید تو بالکل پکی ہے۔“

اس کی پندلی تین جگہ سے ٹوٹی ہوئی ہے۔ ان ہڈیوں کے جوڑ صحیح نہیں بیٹھ سکے۔ یہ خیال رکھنا کہ اس کی سرجری نہ ہونے پائے۔“ میں نے اس پر اپنی دلی خواہش کا اظہار کیا۔
 ”ہڈیاں جس حال میں ہیں اسی طرح جڑ جائیں تاکہ وہ جب تک زندہ رہے، اکثر کراچی صبح چال نہ چل سکے۔“

”تمہاری اس خواہش میں انتقام سے زیادہ یہ جذبہ کارفرما ہے کہ وہ جب تک زندہ رہے، دوسروں کے لیے عبرت کا نمونہ بنا رہے۔“ جلال نے گویا میرا ذہن پڑھ کر کہا۔
 ”بعض اوقات تم اصل بات سمجھنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگاتے۔“ میں نے ہنس کر جواب دیا ”ویرا اس کی موت کی خواہاں تھی مگر میں چاہتا تھا کہ وہ آسان موت کے بجائے عبرت زدہ زندگی گزارے تاکہ اسے دیکھ کر دوسرے سبق حاصل کر سکیں۔“

”یہ تمہارا فلسفہ ہے ورنہ وہ بدترین موت کا حق دار ہے۔“ ویرا اپنی بات پر اڑی رہی۔

اس رات جلال دیر تک ہمارے ساتھ بیٹھا ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ راجا اور آئی مین کے بارے میں کیرید کیرید کر وہ باتیں دریافت کرتا رہا جو اس کے علم میں نہیں تھیں۔ وہ بہت پر امید تھا کہ شی کی نئی کوئٹل کو وہ جلد ہی جڑ سے اکھڑتا ہوا دیکھے گا۔

اسے رہ کر عبد اللہ یاد آتا رہا جو دہلی میں راوا لوں کے تشدد کے سامنے اپنی زندگی کی بازی ہار گیا تھا۔ اسے قلق تھا کہ عبد اللہ کے قاتل کو پاکستان آئے ہوئے کئی دن گزر چکے تھے لیکن وہ اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکا تھا۔ میرے لیے یہ بہت بڑی بات تھی کہ کافی دن گزر جانے کے باوجود وہ اپنے ایک مخلص کارکن کی موت کا صدمہ فراموش نہیں کر سکا تھا۔

کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر جلال بارہ بجے واپس چلا گیا۔

”مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہمارے پیروں میں پڑی ہوئی بیویوں کا وزن دن بہ دن بڑھتا جا رہا ہے۔“ اس کے چلنے جانے کے بعد اول خان نے مایوسی سے کہا۔

”اس کے سامنے تم نازل تھے۔ تم نے اپنے رتہ عمل کا

بہ قدر ادائیگی

بعض لوگوں میں خواہ مخواہ یہ تاثر عام ہے کہ دہائی بہت سیدھے سادے ہوتے ہیں۔ آج کل کے زمانے میں شہریوں میں اور دیہاتیوں میں کوئی خاص فرق نہیں رہا۔ شہر کے ایک پراپرٹی ڈیلر نے دیکھا ایک کسان کی زمین کے مستقبل قریب میں بڑی اہمیت اختیار کرنے کے آثار نظر آرہے تھے اس نے اندازہ لگایا کہ گول مول سی پیشکش کر کے اور رقم کا لالچ دے کر وہ کسان سے کافی زمین بٹھایا سکتا ہے۔ اس نے کسان کے پاس پہنچ کر کہا ”میں آپ سے کم از کم پانچ لاکھ کی زمین خریدنا چاہتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔ مجھے پانچ لاکھ کی زمین تمہارے ہاتھ بیچنے پر کوئی اعتراض نہیں۔“ کسان نے اطمینان سے کہا ”ایسا کرو کل تم ایک بائلی لے کر آجاؤ۔ میں پانچ لاکھ کی زمین تمہیں اس میں ڈال کر دے دوں گا۔“

”ویری گڈ!“ یہ کہتا ہوا سلطان شاہ اچانک دروازے پر نمودار ہو گیا ”تم کو ستانے سے پہلے یہ میرے پاس آئی تھی اور مجھے شطرنج کھیلنے کا جھانسا دے رہی تھی۔“

”تم تو تھکن سے مر رہے تھے اب کیوں میرے پیچھے پیچھے آئے ہو؟“ ویرا نے پلٹ کر تنقیدی سے پوچھا۔

”میں تمہارے پیچھے نہیں آیا۔ دو شریف آدمیوں کو ہوشیار کرنے آیا ہوں تاکہ ان کے ساتھ دھوکے کی کوئی واردات نہ ہو سکے۔“

میں نے محسوس کیا کہ اس وقت ہر ایک کا دماغ چل رہا تھا۔ نیند کا کسی کی آنکھوں میں پتا نہیں تھا۔ بس ہر ایک ویرا کو زچ کرنے پر تیار ہوا تھا۔ غزالہ اسے کمرے میں بلاتے ہی بستر سے اتر گئی تھی۔ میں نے بھی بستر چھوڑا اور ننگے پاؤں ڈرائنگ روم کی طرف ہولیا۔

”کیا تم نے ویرا کی نامعقول باتوں سے ہار مان لی؟“ سلطان شاہ نے حیرت سے پوچھا۔

ساڑھے بارہ بجے اول خان ہم سے رخصت ہو گیا اور اپنے اپنے کمروں کی طرف ہو لیے۔

غزالہ نے خواب گاہ کا دروازہ بند کر لیا لیکن اندر سے بولٹ نہیں کیا۔ ہم دونوں لباس تبدیل کر کے بستر پر دراز ہوئے تھے کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی پھر ویرا کی آواز سنائی دی۔ وہ غزالہ کو بیکار رہی تھی۔

یہ ویرا کی خوبی تھی کہ ہمارے کمرے کا دروازہ بند ہوتا اور ہم دونوں اندر ہوتے تو وہ کبھی اجازت لیے بغیر اندر نہیں آتی تھی۔

غزالہ نے اٹھ کر دروازہ کھولنے کے بجائے بستر سے ہی کم ان کی بانگ لگائی اور ویرا دروازہ کھیل کر اندر آ گئی۔

”کیا تم دونوں کو نیند آ رہی ہے؟“ اس نے اندر آتے ہی معصومیت سے سوال کیا۔

”خدا کا خوف کرو ویرا۔ یہ سونے کا وقت ہے۔ بہت سے گھروں میں اس وقت آدھی نیند لی جا چکی ہوگی۔“ غزالہ نے اسے جواب دیا۔

”معلوم ہوتا ہے کہ آج شام کو تمہیں بوتل سے شغل کرنے کا موقع نہیں ملا اس لیے نیند اچاٹ ہے۔“ میں نے طنز سے کہا۔

وہ ڈھٹائی سے ہنس دی ”یہی چکر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ میں شراب کی عادی ہوئی جا رہی ہوں۔“

اس بارے میں تمہیں کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیے۔ تم عادی ہو چکی ہو۔“ میں نے زور دے کر کہا۔

”میں اس بحث میں نہیں پڑتی۔ میرا مسئلہ بے خوابی کا ہے۔“

”یہ تمہارا مسئلہ ہے۔ ہمیں تنگ نہ کرو اور جا کر اپنے کمرے میں لیٹو۔“ میں نے بے رخی سے جواب دیا۔

”تم ڈبئی کی فرماں بردار ہو۔ میرے ساتھ نہیں بیٹھو گی۔“ ویرا نے غزالہ سے مخاطب ہو کر کہا۔

”تم عادی ہو گئی ہو تو انہیں کیوں تنگ کر رہی ہو۔“ غزالہ مسکراتے ہوئے بولی ”جا کر اپنی بوتل سے دو چار بیسک لے لو۔ خود بخود نیند آ جائے گی۔“

”تم نے کبھی پی پی نہیں اس لیے ایسا مشورہ دے رہی ہو۔ شکم پری کے بعد وہ کسی پی پی لی جائے تو آدمی الٹا ہو جاتا ہے۔“

”یہ بار بیکاروں تمہارے سمجھنے کی ہیں۔ یہ دن بھر کے تھکے بارے ہیں۔ میں انہیں اکیلا چھوڑ کر تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی۔“ غزالہ نے اسے کورا جواب دے دیا۔

چھوڑ دیا۔ ”ویرا نے زہریلے لہجے میں کہا۔
 ”دراصل تم کو عقل کا بیضہ ہے اس لیے تم ہر بات
 وقت سے پہلے سمجھ لیتی ہو۔“ سلطان شاہ غریبا۔
 ”مجھے بھی پتا چلے کہ سلطان شاہ نے اس وقت بستر کیوں
 چھوڑ دیا۔“ میں نے تنبیہ کی تو ویرا کو اکسایا۔

”یہ تمہارے سامنے بغلول بنا رہتا ہے اس لیے تم اسے
 معصوم سمجھتے ہو لیکن میں اس کے دماغی فتور سے اچھی طرح
 واقف ہوں۔ اسے اچانک یاد آیا ہو گا کہ میں سلیپنگ
 سوٹ میں گھومتی پھر رہی ہوں اور اس نے مجھے گھورنے کا
 موقع نکوا دیا۔ یہ بستر سے اپرنگ کی طرح اچھل کر باہر
 آ گیا۔“

”یہ سراسر اوہیات الزام تراشی ہے۔“ سلطان شاہ نے
 اپنے دونوں کان چھو کر گالوں پر ہلکے پھینک لگاتے ہوئے کہا
 ”زیادہ گرمی پڑتی ہے تو تم اس سے بھی کم لباس میں بے حیائی
 سے پورے گھر میں دندناتی پھرتی ہو، میں نے کبھی آنکھ اٹھا کر
 تمہاری طرف نہیں دیکھا۔“

”نہیں دیکھا تو پھر تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں کب کتنا
 لباس پہنتی ہوں۔“ ویرا نے اس پر آنکھیں نکالیں۔
 ”تم خاموشی سے سن رہے ہو اور یہ گھٹیا باتیں کیے
 جا رہی ہے۔“ سلطان شاہ نے تیز آواز میں مجھ سے شکایت
 کی۔

”تم احمق ہو۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”میں
 شادی شدہ ہوں۔ ویرا یہ سارے جتن تمہیں بھانے کے
 لیے کرتی ہوگی اور تم۔“

ویرا نے غصے سے میری بات کاٹ دی ”اسے بھائے
 میری جوتی۔ مجھے الجھن نہ ہو تو میں اس کے سامنے برقع
 اوڑھنا شروع کر دوں۔“
 بے ساختہ غزالہ کی ہنسی پھوٹ گئی اور وہ دونوں آپس کا
 جھگڑا بھول کر اسے گھورنے لگے۔

”تم کم بات پر ہنس رہی ہو؟“ سلطان شاہ نے اشتباہ
 آمیز لہجے میں اس سے پوچھا۔
 ”اپنی بد قسمتی پر ہنس رہی تھی کہ میں اس وقت تم دونوں
 کے درمیان پھنسی ہوئی ہوں۔“ غزالہ نے ہنسی روکنے کی
 کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔

غزالہ کی بے موقع ہنسی سے ان دونوں کے تیور ڈھیلے
 پڑ گئے۔ وہ جانتے تھے کہ زبانی جنگ میں وہ ایک دوسرے کو زیر
 نہیں کر سکتے اس لیے دو طرفہ پسائی ہی سب سے بہتر تھی۔
 میں نے اس مختصر سے سکوت کو غنیمت جانا اور اپنی بات

”سب میرے کمرے میں جمع ہو گئے ہیں تو مجھ کو بتائیے یہ ہے
 کہ میں باہر نکل آؤں تاکہ کوئی تصفیہ ہو سکے۔“ میں نے بے
 بسی سے کہا۔

”آج کے دن کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔“
 ڈرائنگ روم میں ایک صوفے پر ٹنگ جانے کے بعد ویرا نے
 مجھ سے پوچھا۔

”اچھا بلکہ بہت اچھا دن تھا۔ تمہیں اپنی بوتل کے
 بجائے دن کا خیال کیسے آ گیا۔“ میں نے تیوریاں چڑھا کر
 سوال کیا۔

”میری دانست میں آج ناکامیوں کا دن تھا۔ یہ انتہا ہے
 کہ میرے کمرے میں اسکاچ کے سوا کوئی اور شراب نہیں
 ہے۔ براندی ہوتی تو میں غم پر کی بعد بھی کچھ نہ کچھ لے
 سکتی تھی۔“

”خدا کے لیے ہمیں سونے دو۔“ سلطان شاہ دونوں
 ہاتھوں سے اپنا سر تھام کر کہا ”اس وقت تمہاری دنیا صرف
 اور صرف بوتل کے گرد گھوم رہی ہے۔ تم اپنے ساتھ ہمیں
 کیوں پیکر بنا رہی ہو۔“

”تم از کم میں تمہیں کچھ نہیں بنا رہی۔ ذرا قد آدم آئینہ
 دیکھ لو۔ سلیپنگ سوٹ میں تم قدرت کی صنای کا
 شاہکار نظر آ رہے ہو۔ میں نے تمہیں معاف کر دیا تھا۔“

ہی بستر سے اٹھ کر میرے پیچھے ان کے کمرے میں پہنچے تھے۔
 دونوں میں نوک جھوک شروع ہو چکی تھی۔ دن بھر کی
 سنجیدہ مصروفیات کے بعد شاید سب کو ایسی آزاد کوئی کمی شدید
 ضرورت تھی۔

”میں تمہارے پیچھے نہیں آیا تھا۔“ سلطان شاہ بھنا کر
 بولا ”میں ڈینی کو ہوشیار کرنے کے لیے آیا تھا۔“

”ڈینی غفلت کے عالم میں بھی تم سے زیادہ ہوشیار ہوتا
 ہے۔ تم اسے کیا عقل دو گے۔“ ویرا نے ترکی بہ ترکی جواب
 دیا۔

”تم آج کی ناکامیوں کی بات کر رہی تھیں۔“ بات بڑھتے
 دیکھ کر غزالہ نے ان کی گفتگو میں دخل اندازی کی۔
 ”سارا دن مجھے دوڑتے گزر گیا لیکن کوئی نتیجہ نہیں
 نکل سکا۔“ ویرا ایسی سے بولی۔

”نتیجہ تمہارا نتیجہ نہیں ہے کہ اتنی آسانی سے ہاتھ
 آجائے اس کے لیے بھاگ دوڑ کی ضرورت ہوتی ہے۔“
 سلطان شاہ پھر بولے بغیر نہ رہ سکا۔

”تم تو بھاگ دوڑ کر کے بھی کچھ حاصل نہیں کرتے۔ میں
 خوب سمجھتی ہوں کہ تم نے انکار کے بعد اچانک بستر کیوں

شروع کردی ”تم آج کی کارگزاری سے مایوس کیوں ہو؟“
 ”ہم پہلے سے زیادہ اچھے ہوئے ہیں۔ مسائل میں
 اضافے پر خوش نہیں ہوا جاتا۔“ ویرا صوفے پر پہلو بدل کر
 بولی۔

ڈیوٹی

ٹرین میں ٹکٹ چیکر نے ایک صاحب کے ساتھ
 سفر کرتے ہوئے بچے کا ادھا ٹکٹ دیکھ کر کہا ”اس کا
 پورا ٹکٹ لگے گا۔ اس کی عمر بارہ سال سے زیادہ
 ہے۔“

”اس کی عمر بارہ سال سے زیادہ کیسے ہو سکتی ہے۔
 بارہ سال تو میری شادی کو ہوئے ہیں“ وہ صاحب غصے
 سے بولے۔

”میرا کام ٹکٹ چیک کرنا ہے۔۔۔ گناہوں کے
 اعترافات سننا نہیں“ ٹکٹ چیکر نے جواب دیا۔

ہوتی ہے۔ انہیں لڑنے کے لیے بھی میرا کمر ملتا ہے۔ تم یہ
 بتاؤ کہ اس وقت کیوں فون کیا ہے۔“

”نادر کو مار دیا گیا۔“ اول خان کے وہ الفاظ میرے
 اعصاب پر ہم کی طرح گرے۔ اس وقت آئی مین کے خلاف
 وہی ہمارا سب سے مضبوط ستون تھا۔ اس کے ہاتھ آجانے کی
 صورت میں ہم آسانی سے آئی مین کا چچھا کر سکتے تھے۔ میرے
 لیے وہ بری خبر کسی صدمے سے کم نہیں تھی۔
 ”کیا ہوا۔ یہ کیسے ہو گیا؟“ میں نے قدرے سکوت کے
 بعد مضطرب آواز میں پوچھا۔

”میرے دو آدمی شام سے اس کی تلاش میں لگے ہوئے
 تھے اور وہ گھر سے غائب تھا۔ کافی وقت گزر جانے کے بعد
 انہوں نے نادر کے گھر والوں سے بات کی تو پتا چلا کہ سات
 بجے کے قریب کسی گورے کا فون آیا تھا اور وہ بجٹ میں گھر
 سے چلا گیا۔ میرے آدمیوں نے شہر کے تھانوں میں چھان بین
 شروع کردی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے انہیں کلشن تھانے سے
 پتا چلا کہ ویرا ساحلی علاقے سے ایک لاش ملی ہے جس کے
 کاغذوں سے پتا چلتا ہے کہ اس کا نام نادر خان تھا۔ میرے
 آدمیوں نے اس کے گھر پر گناہ فون کر کے اطلاع دے دی۔
 ان لوگوں نے کلشن تھانے پہنچ کر لاش شناخت کی تو میرے
 آدمیوں نے مجھے اطلاع دے دی۔“

اول خان کو ملنے والی وہ خبر مستند تھی۔ اس پر شک و شبہ
 کرنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ میں نے حیرت اور بے یقینی
 سے پوچھا ”اسے کیسے مار دیا گیا!“

”راجا ہماری قید میں ہے اور آئی مین اپنے ممکن سے
 نکل کر فرار ہونے پر مجبور ہو گیا ہے۔ یہ مسائل میں اضافہ
 نہیں ہے۔“ میں نے زور دے کر کہا۔

”آئی مین کو ہمارے ہاتھ آنا چاہیے تھا۔“ ویرا نے
 اصرار کیا ”ہم نے غزالہ کے مشورے پر کسی تاخیر کے بغیر
 ادھر دوڑ لگائی تھی مگر وہ نکل بھاگا۔ یہ اتفاق نہیں، مقدر کی
 خرابی تھی۔ جب ستارے گردش میں آئے ہوں تو کامیابی
 اسی طرح ہاتھ آتے آتے نکل جاتی ہے۔“

”معلوم ہوتا ہے کہ ساری کامیابیوں کا ٹھیکا ہم نے لیا
 ہوا ہے۔ دشمن کا ہمیشہ منہ کالا ہونا چاہیے۔“ سلطان شاہ نے
 برا سامنہ بنا کر مجھ سے کہا۔

”تم پھر میری بات میں بولے۔“ ویرا نے آنکھیں نکال
 کے کہا۔

”میں تم سے نہیں ڈبئی سے بات کر رہا تھا۔“ سلطان شاہ
 نے سکون سے جواب دیا ”تم اپنی بولی بولتی رہو۔“
 ”بعض لوگ اس قدر ڈھیٹ ہوتے ہیں کہ بار بار منہ کی
 کھانے کے باوجود پچین سے نہیں بیٹھ سکتے۔“ ویرا نے الفاظ
 چبایا کر کہا۔

”غزالہ!“ سلطان شاہ نے خاص طور پر اسے مخاطب کیا
 ”تم خود ایمانداری سے بتاؤ کہ صوفے پر کون اپنے پینڈے
 کے بل بار بار پہلو بدل رہا ہے۔“

اس سے پہلے کہ ویرا کوئی جواب دیتی، فون کی گھنٹی بجنے
 لگی۔ سب نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ میرا
 دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ جلال اور اول خان تھوڑی دیر
 پہلے ہمارے پاس سے اٹھ کر گئے تھے۔ وہ فون کس کا ہو سکتا
 تھا؟

میں نے ریسیور اٹھایا تو اول خان کی بو جھل آواز میرے
 کان میں گونجی ”تم ابھی تک جاگ رہے ہو۔“
 ”مجبوری ہے۔ ویرا اور سلطان شاہ کا جھگڑا منسا رہا
 ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”تم بہت خوش نصیب ہو کہ تمہیں اتنے اچھے دوست
 اور ساتھی ملے ہوئے ہیں جو زندگی کو کبھی بے رونق نہیں
 ہونے دیتے۔“

”تم کو بستر سے اٹھایا جائے تو پتا چلے کہ خوشگوا ری کیا

”وہ بیم گن کا نشانہ بنا ہے۔“ اول خان نے دوسرا دھکا کیا ”میرا خیال ہے کہ تم سے بات ختم کرتے ہی آئی مین نے پورا نقشہ سمجھ لیا تھا۔ تم نوٹ نمبر سے گھر کا پتا چلا کر وہاں پہنچتے اور پھر اسٹیٹ ایجنٹ تک پہنچتے۔ وہ نادر کی نشان دہی کرتا اور آئی مین مشکل میں پڑ جاتا۔ اس نے لی باؤن چھوڑنے سے پہلے نادر کو ساحلی علاقے پر آنے کے لیے فون کیا ہوگا۔ گھر سے فرار ہو کر وہ مقررہ مقام پر پہنچا اور شاید اس کا انتظار کرتا رہا۔ نادر آیا تو آئی مین نے بے رحمی سے اسے اپنی بیم گن کا نشانہ بنا دیا۔ بیم گن کی مملکت شعاعوں نے نادر کی پیشانی سے کھوپڑی کی پشت تک آر پار سوراخ کر دیا ہے۔ وہ اتنی سرعت سے مرا ہے کہ حیرت کے آثار اس کے چہرے پر نقش ہو کر رہ گئے ہیں۔“

”یہ بہت بری خبر ہے۔“ میں نے پر تشویش لہجے میں کہا ”اس خطے میں بیم گن کے استعمال کو میرے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اب نادر کا خون میرے نام لکھ دیا جائے گا۔“ ”یہ نہیں ہوگا۔“ فون پر اول خان کی سخت آواز آئی ”وہ تمہارے نام کا فائدہ نہیں اٹھا سکے گا۔ اب تم اس کی آڑ میں بے خوبی سے اپنی بیم گن استعمال کر سکو گے۔“

”کیا تمہارے ذہن میں اس بارے میں کوئی تجویز ہے؟“ میں نے بے چینی سے پوچھا۔ ”ابھی ایک خیال آیا ہے لیکن اب وقت گزر گیا۔ میں کل یہ کام کروں گا اور برسوں کے اخبارات میں تصویروں کے ساتھ آئی مین کی کمائی موجود ہوگی۔“ ”شٹی امریکا کی این جی او ہے۔ اخبارات والے ثبوت کے بغیر اس کے خلاف کوئی خبر نہیں چھاپیں گے۔“

”وہ امریکا اور یورپ میں این جی او ہوگی۔ یہاں زیر زمین کام کرتی رہی ہے اس لیے کسی رعایت کی حق دار نہیں ہے۔ اچھا ہوا کہ تم نے اس نکتے کی نشان دہی کر دی۔ میں خیال رکھوں گا کہ پوری کمائی میں شٹی کا نام نہ آنے پائے۔ پورا فیچر ایک خفیہ تنظیم کے آئی مین کے خلاف ہوگا جو نادر کا قاتل ہے اور بیم گن کا مالک ہے۔“ ”یہ فیچر اخبارات میں آگیا تو مجھ پر ذاتی احسان ہوگا۔ اس خبیث نے سامنا ہونے سے پہلے مجھے دفاعی پوزیشن دھکیل دیا ہے۔“

”کیسی باتیں کر رہے ہو!“ اول خان کی آواز میں خفگی عود کر آئی ”یہ ہم سب کا مسئلہ ہے۔ میں جلال سے بھی بات کرتا ہوں۔ یہ فیچر پولیس کے بجائے آئی بی کی طرف سے جاری ہوا تو اسے زیادہ پذیرائی ملے گی۔ اس سلسلے میں ایس ٹی

ایف سرے سے سامنے نہیں آسکتی۔“ ”مرکی افسران اس آئی مین کی آمد سے ضرور باخبر ہوں گے۔ فیچر کی اشاعت سے ان کے ارمانوں پر اوس پڑ جائے گی۔“ ”وہ باخبر ہیں۔ تم بھول گئے کہ آئی مین نے تم سے بات کرتے ہوئے جان والے واقعے کا حوالہ دیا تھا۔ معلومات کا یہ تبادلہ باہمی تعاون کے بغیر ممکن نہیں تھا۔“ ”شاید دیرا درست کہہ رہی تھی۔ آج ہمارا دن نہیں ہے۔ ہر طرف سے اعصاب شکن خبریں چلی آرہی ہیں۔“ میں نے نیم دلی سے کہا۔

”یہ خبریں اعصاب شکن نہیں، حوصلہ افزا ہیں۔ تمہاری ایک فون کال نے اسے حواس باختہ کر دیا ہے۔ اس کے ذہن میں یہ خوف جاگزیں ہو چکا ہے کہ ماجد مینٹی جیسا خطرناک اور فیئرٹھا آدمی اس کے پیچھے لگ گیا ہے۔ اس خوف میں وہ مدافعتی پھرٹی دکھا رہا ہے۔ یہ تیزی سے لے ڈوبے گی۔ وہ کہیں نہ کہیں ٹھوکر کھائے گا اور ہم سب اس کی گردن دو بچ لیں گے۔“

”میری آنکھیں نادر پر لگی ہوئی تھیں۔ اس کی موت کے بعد ہمارا کام مشکل ہو گیا ہے۔“

”مشکل ضرور ہوا ہے، ناممکن نہیں ہے۔ ہمیں صبر و تحمل کے ساتھ اس کی کسی غلطی کا انتظار کرنا ہوگا۔ فیچر کی اشاعت کے بعد وہ بے یار و مددگار رہ جائے گا۔ امریکی افسران اس سے دوری اختیار کر لیں گے تاکہ ان پر کوئی الزام نہ آئے۔ پچھلے دنوں وہ ایسے معاملات میں کافی بدنامی اٹھا چکے ہیں۔“

”بہت اچھا کیا کہ تم نے اسی وقت مجھے یہ بری خبر سنا دی۔ میں بھی سوچتا ہوں کہ کیا کیا جائے۔“

”میں پہلے ہی کہہ رہی تھی کہ آج کا دن خراب ہے۔“

میری گفتگو کے اختتام پر دیرا بول پڑی۔ میرے جواب سے ان سب کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اول خان نے مجھے کیا بتایا ہوگا۔

”ایک آئی مین کے اختیار کی دو علامتیں ہوتی ہیں۔“

سلور آئی اور بیم گن۔ وہ دونوں کو استعمال کر رہا ہے۔“ میں نے افسردگی سے کہا ”فوری طور پر یہی کہا جائے گا کہ نادر کو میں نے مارا ہے۔“

”آپ اول خان سے کسی فیچر کے بارے میں کیا بات کر رہے تھے؟“ غزالہ نے پوچھا۔

میں نے انہیں اپنی اور اول خان کی پوری گفتگو کا خلاصہ سنا دیا۔

گا۔

”آپ اول خان سے بات کر کے اس کے گھر پر ایس ٹی ایف کے گارڈز لگوا دیں۔“ غزالہ نے فکر مندی سے مشورہ دیا۔

”اسے بچانے کے لیے بہت کچھ کیا جاسکتا ہے۔“ میں نے سوچتے ہوئے جواب دیا ”شاید وہ اب تک اس لیے بچا ہوا ہے کہ اس نے اپنے تمام پرانے رابطے ختم کر دیے ہیں۔ اپنی گولڈن فارمیسی چلاتا ہے یا اپنے گھر پر شراب سے مشغول کرتا رہتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ انکی مین اس تک پہنچنے کی جستجو میں لگا ہوا ہوگا۔“

”ہم ہوش مندی سے کام لیں تو جہاں گیر کا گھر آئی مین کے لیے چوہے دان بن سکتا ہے۔“ سلطان شاہ نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

”کاش میں اس سے اسی وقت مل سکتا۔“ میں نے متسافانہ اضطراب کے ساتھ کہا ”پتا نہیں میں اسے کیوں بھول گیا تھا۔“

”ایسے آپ کو ملامت کرنے کی ضرورت نہیں۔“ غزالہ نے مجھے تسلی دی ”آج دوپہر کو آپ کو آئی مین کے وجود کا علم ہوا ہے۔ بمشکل چند گھنٹے گزرے ہیں اور اس دوران میں آپ مسلسل مصروف رہے ہیں۔ اس سے اسی وقت ملنا چاہتے ہیں تو میں آپ کے ساتھ چلتے کو تیار ہوں۔“

”مشکل یہ ہے کہ اس وقت وہ آدمیت کے جامے میں نہیں ہوگا۔ نشے میں دھت ہو کر سو رہا ہوگا یا سلی کو ستا رہا ہوگا۔ صبح سے پہلے وہ بات کرنے کے قابل نہیں ہوگا۔“

”اپنے دوست کے یہ ذاتی مسئلے تم زیادہ بہتر جانتے ہو۔“ ویرا بے اعتنائی سے بولی ”تم چلتے ہو تو ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ جہاں گیر کی زندگی اور سلامتی ہم کو بہت زیادہ عزیز ہے۔“

”اس وقت ہمارا مل بیٹنسا کار آمد رہا۔“ سلطان شاہ بولا ”اول خان کا فون آگیا اور جہاں گیر کے بارے میں بھی اہم باتیں ہو گئیں۔“

”حرکت میں برکت ہے۔ میں بلانے آئی تھی تو تم سب چیخ رہے تھے۔“ ویرا کو ہم تینوں پر وار کرنے کا موقع مل گیا۔

”تمہارا مقصد کچھ اور تھا۔ یہ اٹھ کر ڈرائنگ روم میں نہ آتے تو تم اپنے کمرے میں جا کر کوئی اوٹ پٹانگ مشغل شروع کر دیتیں۔“ غزالہ نے جواب دیا۔

وہ باتیں ساری رات جاری نہیں رہ سکتی تھیں۔ پہلے سلطان شاہ اپنے کمرے کی طرف کھسکا پھر ہم دونوں بھی دیر

”آئی مین بہت خطرناک اور پھرتیلا آدمی ہے۔“ ویرا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا ”میرا خیال ہے کہ یہاں سے شی کا بستریا کوئل ہونے کے بعد لاپرواہی اور بے ضمییر پاکستانیوں نے شی کے کام کو آگے بڑھایا ہے۔ یہاں ہیروئن کی کھپت شی کے ہدف سے زیادہ بڑھ چکی ہے۔ جب تمہارے اپنے لوگ یہ کام کر رہے ہیں تو واشنگٹن سے کسی بظرا کو نیا آئی مین بھیجنے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہاں آنے والے نے شی کا چکر صرف آزمودہ افرادی قوت کو یک جا کرنے کے لیے چلایا ہے ورنہ اس کا اصل مقصد کچھ اور ہے۔“

”وہ کیا ہو سکتا ہے؟“ میں نے براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”میرا اور تمہارا خاتمہ!“ ویرا نے سنجیدگی سے کہا ”وہ لوگ اس علاقے کے سیاسی اور جغرافیائی منظر نامے میں جو رنگ بھرتا چاہتے ہیں اس کے لیے انہیں صاف میدان کی ضرورت ہے۔ ہم نے ایس ٹی ایف کے ساتھ مل کر ان کے کسی اہم آدمی کا یہاں رکنا اور زندہ رہنا محال کر دیا ہے۔ وہ فتنے کی ان جڑوں کو کاٹنے کے لیے شی کو میدان میں لائے ہیں۔“

”ہو سکتا ہے کہ تمہارا یہ خیال درست ہو۔“ میں نے پوری نیک نیتی سے جواب دیا۔

”اس کا مطلب ہے کہ تم مجھ سے پوری طرح متفق نہیں ہو مگر یہ میرا یقین ہے۔ میں خود امریکی ہوں۔ امریکی سوچ، حیلوں اور سفاکی سے پوری طرح واقف ہوں۔ وہ اپنے طور پر ہم دونوں تک پہنچنے کی کوشش کرے گا۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ خطرہ جہاں گیر کی ذات کو ہے۔“

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ویرا نے میرے سر پر لٹھ مارا ہو۔ اس کا وہ اندیشہ سو فیصد درست تھا۔ شی کے چار مقامی بڑوں میں سے دو مار دیے گئے تھے، میں باقی ہو گیا تھا، جہاں گیر گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ اگر آئی مین نے جوشی جیسے آدمی کو اپنے ہیڈ ورک میں شامل کر لیا تھا تو وہ پرانے مہموں کی طرف سے غافل نہیں تھا۔ اسے یہ معلوم رہا ہوگا کہ جہاں گیر میرا جگری دوست تھا۔ میرا سراغ لگانے کے لیے وہ کسی بھی وقت اچانک اسے گھیر سکتا تھا اور میں اسے یکسر بھولا ہوا تھا۔

”تم نے بہت دور کی بات سوچی ہے۔“ میں نے مضطربانہ لہجے میں اعتراف کیا ”وہ گدھا شراب میں غرق ہو کر اپنی ساری ذہانت اور مکاری کو زنگ آلود کر چکا ہے۔ کسی وقت آئی مین اس کے سر پر سوار ہو گیا تو وہ بے موت مارا جائے

”من ہے۔“
 ”دن میں یہ سب ہو سکتا ہے کیونکہ رہائشی عمارتوں میں ہر قسم کے لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ کسی کا کچھ پتا نہیں چلتا لیکن اتنی رات گئے کوئی ہوش مند آدمی ایسا خطرہ مول نہیں لے گی۔“

”آپ کا خیال ہے کہ وہ دن میں ادھر کا رخ کرے گا۔“
 ”غزالہ نے پوچھا۔
 ”اگر اسے جمائیکر کا سراغ مل جاتا ہے تو میرا اندازہ ہے کہ وہ اس کے گھر کا رخ نہیں کرے گا۔ اسے کھلی دکان پر گھیرے گا۔“

میرے اس سوچے سمجھے جواب میں بہت سے پہلو پنہاں تھے جو غزالہ میری کسی وضاحت کے بغیر سمجھ گئی اور بولی ”کل صبح جمائیکر کو فارمیسی نہیں جانا چاہیے۔“
 ”میں صبح فون کر کے اسے روک دوں گا۔“ میں نے وثوق سے کہا۔

”پتا نہیں وہ کب گھر سے نکل کھڑا ہو۔ آپ کو یہ نیک کام اسی وقت کر لینا چاہیے۔ آپ اس کے بجائے سلیٹی سے بات کر سکتے ہیں۔ وہ آپ کی ہر بات دھیان سے سنتی ہے۔“
 ”غزالہ کے آخری فقرے پر میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا مگر اس کے چہرے پر دور دور تک طنز استہزا کا شائبہ نہیں تھا۔

وہ وقت نامناسب تھا مگر بات جب جان کی سلامتی کی ہو تو کوئی وقت نامناسب نہیں ہوتا۔ غزالہ کی یہ تجویز نہایت معقول تھی کہ میں سلیٹی سے بات کر کے اسے سمجھا دوں کہ وہ صبح جمائیکر کو دکان جانے سے روک دے۔
 میں نے سر ہانے رکھی ہوئی ٹائم پیس پر نظر ڈالی تو وہ دو بج چکی تھی۔ میں نے چند ثانیوں کے لیے اپنے فیصلے پر غور کیا پھر ریپور اٹھا کر جمائیکر کے گھر کا نمبر ملایا۔

دو گھنٹیاں بجنے کے بعد بھی دوسری طرف سے جواب نہیں ملا تو مجھے خدشہ ہوا کہ وہ دونوں میاں بیوی سو چکے تھے مگر تیسری گھنٹی بجتے ہی میرے کانوں میں سلیٹی کی سسمی ہوئی آواز آئی تو میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ میری کوشش ضائع نہیں ہوئی تھی۔

”سلیٹی! میں ڈینی بول رہا ہوں۔“ میں نے اس کی تشفی کے لیے فوری طور پر اپنا نام بتا ڈالا۔

”ہائے اللہ! فون کی گھنٹی سن کر اس وقت میری جان نکل گئی تھی کہ پتا نہیں کس کا فون ہو۔ اس وقت کیوں فون کیا ہے؟“

کو رخصت کر کے اپنے کمرے میں آگئے۔ بھڑاس نکل جانے کے بعد ویرا کے دل کا ہتھ مارا ہو گیا تھا اور اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے وہ مطمئن نظر آرہی تھی۔

”مجھے خوشی ہے کہ ہم چاروں کی کچھ نہ کچھ افادیت ہے۔“ میں نے کمرے میں پہنچ کر غزالہ سے کہا ”ایک بات کسی کے ذہن سے محو ہو جاتی ہے تو دوسرا اسے یاد دلانے میں ذرا نہیں چوکتا۔ اس طرح ہر بات کے سارے پہلو نگاہ میں رہتے ہیں۔“

”ویرا نے اچانک جمائیکر کا ذکر نکال لیا ورنہ میرا ذہن بھی اس طرف نہیں گیا تھا۔“ غزالہ نے خفت سے کہا۔
 ”مجھے ابھی تک رہ رہ کر قلق ہو رہا ہے کہ میں نے اس بے چارے کے بارے میں کیوں نہیں سوچا۔“

”آپ نے دانستہ اسے نظر انداز نہیں کیا تھا۔ اگر اسے کوئی نقصان پہنچ جاتا تو آپ کا مالامال اپنی جگہ بجا ہوتا۔ دوپہر سے اب تک وقت ہی کتنا گزرا ہے۔“
 ”وہ برا بھلا جیسا بھی ہے، میرے دوستوں میں اکلوتا رہ گیا ہے اور مجھے بہت عزیز ہے۔“

”میں نے کچھ سوچ کر اس وقت چلنے کی تجویز پیش کی تھی جو آپ نے سرد مہری سے مسترد کر دی۔“
 ”اس وقت وہاں جا کر کوفت ہوگی۔ پتا نہیں وہ مردود کون سی بولی بولنا شروع کر دے۔“ میں نے بد مزگی سے جواب دیا۔

”آپ سوچ لیں۔“ غزالہ نے رسائیت سے کہا ”آئی مین اس وقت بدکا ہوا ہے۔ پچھلے لوگوں کے عبرت ناک انجام کا خوف بھی اس کے ذہن کے کسی نہ کسی گوشے میں چپکا ہوا ہو گا۔ وہ تیزی دکھا رہا ہے تاکہ اپنا کام جلد از جلد ختم کر لے۔ اسے سراغ مل گیا تو وہ اسی وقت جمائیکر کے فلیٹ پر پہنچ جائے گا۔“

میں نے لمحے بھر کے لیے اس خطرے پر غور کیا پھر فیصلہ کن انداز میں کہا ”وہ اس وقت ادھر کا رخ کرنے کی حماقت نہیں کرے گا۔ فلیٹ ایک پنجرے کی طرح ہوتے ہیں۔ اول تو اتنی رات گئے وہاں کسی سفید فام کی آمد کو شبہ کی نظر سے دیکھا جائے گا۔ وہ اندر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا اور کوئی گڑبڑ ہوگئی تو وہاں سے بچ کر نہیں نکل سکے گا۔“

غزالہ ہنس دی ”پتا نہیں آپ کس دنیا میں رہ رہے ہیں۔ کراچی کے فلیٹوں میں دن دہائے ڈاکے پڑتے ہیں۔ ڈاکو سب مال و اسباب سمیٹ کر صاف نکل جاتے ہیں اور پڑوسیوں کو کانوں کان پتا نہیں چلتا۔ وہ عام ڈاکو نہیں، آئی

ہدایت سن لی ہے نا۔“ میں نے سلمیٰ سے تصدیق چاہی۔
 ”میں نے کچھ نہیں سنا۔ میں اپنی پریشانیوں میں الجھی ہوئی ہوں۔ تم اپنی بات پھر دہراؤ۔“

”صبح جہانگیر کو دکان نہ جانے دینا۔ وہاں خطرہ ہے۔“
 میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر اپنی بات دہرائی ”صبح میں اسے فون کروں گا یا خود تمہارے گھر آؤں گا۔“
 ”کیا فارمیسی پر پھر کوئی گزربو ہوگی۔“ میرا پیغام سمجھ کر اس بے چاری کی پریشانی اور بڑھ گئی۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ میں نے اسے جھوٹی تسلی دی ”بس یہ احتیاط ضروری ہے۔“
 ”دیکھو! وہ پھر ہنسنا رہے ہیں۔“ سلمیٰ کی آواز رو دینے والی تھی ”اب تم خود ان سے بات کر لو۔“

قدرے توقف کے بعد فون پر جہانگیر کی بھاری اور لڑکھاتی ہوئی آواز ابھری۔ ”یار رڈنی جانی! تم کہاں مرے ہوئے ہو۔ میرے کان تمہاری آواز سننے کو ترس گئے ہیں۔ تم کو میرے اوپر ذرا بھی رحم نہیں آتا کہ کبھی آکر مجھ سے مل لو۔“ وہ الفاظ سنیے سنیے گھٹکتے گھٹکتے کراد کر رہا تھا لیکن اس کی باتیں بے ربط نہیں تھیں۔ نشے میں ہونے کے باوجود اس کے حواس زائل نہیں ہوئے تھے۔

”تم بلاوجہ سلمیٰ کو کیوں پریشان کرتے ہو۔ اتنی پی لیتے ہو کہ تمہیں سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔“
 ”سالی جھوٹ بولتی ہے۔۔۔“ اس اُلوکی پٹمی نے میری زندگی اجیرن کی ہوئی ہے۔ میں اتنی دیر سے سمجھا رہا ہوں کہ میں گھوڑا ہوں مگر یہ مان کر ہی نہیں دے رہی۔ تم نے تو گھوڑا دیکھا ہوگا۔ اسے سمجھاؤ کہ میں گھوڑا ہوں۔“

وہ ذرا سی دیر میں پٹری سے اتر گیا تھا۔ مجھے اس کے بارے میں اپنی رائے بدلنی پڑ گئی۔ میں نے غصیلی آواز میں کہا ”تم گدھے ہو۔۔۔“

وہ بھی شاید تاؤ میں آگیا اور میری بات کاٹ کر اسی انداز میں غرایا ”گدھا نہیں، میں گھوڑا ہوں گھوڑا!“
 ”آدمی کے بچے بنو اور اپنی کھال میں رہ کر بات کر سکتے ہو تو کرورنے فون بند کرو۔“ میں نے اسے ڈانٹا۔

نشے میں دھت ہونے کے باوجود اس کی خودی آسمانوں میں پرواز کر رہی تھی۔ اس نے یکایک فون بند کر دیا۔
 ”کیا ہوا۔“ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھ کر غزالہ نے تجسس سے پوچھا۔

”وہ نشے میں دھت ہے اور اس وقت گھوڑا بننے کے خط میں مبتلا ہے۔“

”میں کراچی میں ہوں۔ میں نے اس وقت بہت ضروری کام سے فون کیا ہے۔ صبح جہانگیر کو دکان نہ جانے دینا۔ وہاں خطرہ ہے۔“

وہ نہ جانے اپنے خیالات کی کس رو میں ڈوبی ہوئی تھی کہ میرے پیغام کو نہ سمجھ سکی اور پھنسی پھنسی آواز میں بولی ”صبح کسی نے دیکھی ہے۔ اس وقت تمہارے دوست نے میری زندگی اجیرن کی ہوئی ہے۔ پتا نہیں آج رات کو سونا بھی نصیب ہو گا یا پوری رات عذاب میں گزر جائے گی۔“
 میں نے اپنے پیغام پر اصرار کرنے کے بجائے اس کی دل جوئی ضروری سمجھی اور پوچھا ”وہ اس وقت کیا کر رہا ہے؟“

”کیا بتاؤں کیا کر رہے ہیں۔ ایسی ایسی حرکتیں کر رہے ہیں کہ بتاتے ہوئے شرم آ رہی ہے۔“ فرط جذبات سے اس کی آواز روہنسا ہو گئی۔
 ”معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت وہ نشے میں دھت ہے۔“

”روز بھی ہوتا ہے۔ میں اس زندگی سے تنگ آ گئی ہوں۔ جب تک نشے میں بے ہوش نہیں ہو جائیں گے، پیتے رہیں گے اور صبح سویرے مجھے بستر سے کھڑا کر دیں گے۔ رات کی نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے اب ہر وقت میرا دماغ بو بھل رہنے لگا ہے۔ میں اپنے کسی یار سے نہیں تمہارے یار ڈینی سے بات کر رہی ہوں۔“ آخری فقرہ اس نے ماوتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر شاید جہانگیر سے کہا تھا لیکن پھر بھی اس کی دہلی دہلی اور جلی جلی آواز میری کانوں تک پہنچ گئی۔
 ”تم لاہور سے کب آئی ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”میں اس واقعے کے بعد وہاں نہیں رہی۔ تم نے میری کوئی مدد نہیں کی۔ پورے گھر میں میری ناک پٹی ہو گئی۔ سب خاموش رہ کر سوئی ہوئی آنکھوں سے مجھے گھورتے تھے جیسے ماموں عظمت کو میں نے پکڑ لیا ہو۔ ان کی گرفتاری سے پورے لاہور میں ہمارے خاندان کی عزت خاک میں مل گئی۔“ لاہور کا ذکر سننے ہی سلمیٰ کے زخم ہرے ہو گئے۔
 ”وہ فیڈرل ایجنسیوں کا چکر تھا۔ تمہارے ماموں گردن تک اس دلدل میں غرق تھے۔ میں اس معاملے میں بالکل بے بس تھا۔“

”دیکھو! وہ بنگار رہے ہیں کہ میں فون انہیں دے دوں۔“ جہانگیر نے مجھے مزید معذرتوں سے بچایا۔ سلمیٰ اس وقت واقعی مشکل میں پھنسی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔

”فون اسے دینے سے پہلے یہ بتادو کہ تم نے میری

”لا حول ولا قوۃ۔۔۔ آپ بھی شراب پیتے تھے لیکن کبھی نشے میں آپے سے باہر نہیں ہوئے۔ بعض لوگ اتنی زیادہ چڑھا لیتے ہیں کہ انسانوں سے جانور بن جاتے ہیں۔ ایسے مردوں کے ساتھ زندگی کا سفر طے کرنا ایک عذاب سے کم نہیں ہوتا ہوگا۔“

”تم کبھی ایسے تجربے سے نہیں گزریں پھر تمہیں یہ سب باتیں کیسے معلوم ہیں۔“

”آپ بھول رہے ہیں کہ میں لندن کے ایک سب میں نوکری کر چکی ہوں۔ وہاں دیک ایڈ پر میں نے انسانوں کو جانوروں سے بدتر حالت میں دیکھا تھا۔“

”تم نے سند دے دی۔ میں تمہارے مشاہدے کو چیلنج نہیں کر سکتا۔“

”آپ نے سلی کو اپنا پیغام تو دے دیا ہوگا۔“ غزالہ نے پوچھا۔

”میں نے اپنا پیغام دوبار دہرایا ہے۔ اچھا ہوا کہ جمائیکر نے مشتعل ہو کر خود فون بند کر دیا ورنہ میں ڈر رہا تھا کہ وہ اپنی دھن میں گھنٹوں باتیں کرتا رہے گا۔“

”میرے سرے ایک بڑا بوجھ اتر گیا۔ اب اجازت ہو تو روشنی گل کر دوں؟“ غزالہ نے مسکرا کر پوچھا۔

میں نے ہاتھ پکڑ کر اسے بستر پر اٹھایا اور دوسرے ہاتھ سے بیڈ سوچ آف کر دیا۔

○☆☆○

اگلی صبح میں نے پہلی فرصت میں جمائیکر کے گھر فون کیا تو مجھے ریسپور پر سلی کی آواز سن کر خوش ہوئی۔ اس نے بتایا کہ میرا دیا ہوا پیغام سن کر جمائیکر نے گولڈن فارمیسی جانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا اور اس وقت سکون سے ہاتھ روم میں نما رہا تھا۔

میں نے سلی سے کہا کہ وہ جمائیکر کو میرے فون کے بارے میں نہ بتائے۔ میں اپنے چند ضروری کاموں سے نمٹنے کے بعد دوپہر تک اس کے گھر پہنچوں گا۔

”تمہیں معلوم ہے کہ وہ بہت وہمی ہیں۔ ہاتھ روم میں فون کی گھنٹی سن لی ہوگی۔ اب باہر آتے ہی پوچھیں گے کہ کس کا فون آیا تھا۔“

”کہہ دینا کہ رائگ نمبر تھا۔ اس بدھو کو کیا پتا چلے گا۔“ میں نے بے پروائی سے کہا۔

وہ کھکھلا کر مترنم آواز میں ہنس پڑی ”تم میرے منہ پر ان کو بدھو کہہ رہے ہو۔“

”وہ رات کو اپنے آپ کو گھوڑا کہہ رہا تھا۔ اس بارے میں نے بے پروائی سے کہا۔“

وہ کھکھلا کر مترنم آواز میں ہنس پڑی ”تم میرے منہ پر ان کو بدھو کہہ رہے ہو۔“

”وہ رات کو اپنے آپ کو گھوڑا کہہ رہا تھا۔ اس بارے میں نے بے پروائی سے کہا۔“

وہ کھکھلا کر مترنم آواز میں ہنس پڑی ”تم میرے منہ پر ان کو بدھو کہہ رہے ہو۔“

سلطان شاہ والا سلوک نہیں کر سکتی۔“
”اس کا مطلب ہے کہ تم سلطان شاہ کو دوسروں سے کم تر سمجھتی ہو۔“

”سلطان شاہ اور ویرا میرے نزدیک ایک سطح پر ہیں کیونکہ دونوں غیر شادی شدہ ہیں۔ کسی تیسرے کے جذبات کو مجروح کیے بغیر پوری بے رحمی سے ایک دوسرے سے بدلے لیتے ہیں۔ ویرا کی آپ سے دوستی اپنی جگہ اسے میرے جذبات کا لحاظ ضرور رکھنا چاہیے۔“

سلطان شاہ اپنے کمرے سے نکلتا ہوا نظر آیا اور ہماری آپس کی باتیں وہیں ختم ہو گئیں۔
گیارہ بجے جلال کا فون آگیا۔ وہ کراچی میں موجود تھا اور کہہ رہا تھا ”ناکامیوں کے اندھیرے میں کامیابی کی پہلی مبارک باد ہو۔“

”کیا مال پکڑا گیا؟“ میں نے بے ساختہ سوال کیا۔
”میں تمہارے گھر میں بیٹھا ہوا تھا اور بھارتی فضائی کمپنی کا ایک جہاز کراچی انٹرویورٹ پر اس مخصوص شراب کے پیاس کارٹن اتار رہا تھا۔ صبح وہ مال گودام میں پہنچنے ہی سب کچھ سیل کر دیا گیا۔ یہ لمبی کہانی ہے۔ میں آؤں گا تو سناؤں گا۔“

میں نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا ”چوڑا کا کیا ہوا؟“
مجھے شبہ ہوا تھا کہ وہ اپنی بات وہیں ختم کرنے والا تھا۔

”میں وہی بتا رہا تھا۔ بدھ لال چوڑا کے وارنٹ دیکھ کر قونصل خانے والے سخت تذبذب میں پڑ گئے۔ وہ پاکستان کا شری ہے اور بیس ملازم رکھا گیا ہے۔ کافی مزاحمت کے بعد ابھی ابھی انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ چوڑا کو بارہ بجے تک قانون کے محافظوں کے حوالے کر دیا جائے گا۔“

”ان کی پسپائی سے ظاہر ہو رہا ہے کہ کیس بہت مضبوط بنا ہے۔“ میں نے اس کی جائز تعریف کی ”اس وقت تقریباً گیارہ بجے ہیں اور کارروائی کافی آگے بڑھ چکی ہے۔ تم لوگوں نے بہت تیز رفتاری سے کام آگے بڑھایا ہے۔“

”کام رات سے ہی شروع ہو گیا تھا۔ صبح ابتدا کی جاتی تو آج کا پورا دن برباد ہو جاتا۔“ جلال اپنی کامیابی پر بہت مسرور تھا۔ ”میں چوڑا کی گرفتاری کے لیے مال گودام میں پہنچنے کا انتظار تھا تاکہ ثبوت ہاتھ آسکے۔ گودام کو سیل کرتے ہی پولیس فورس بھارتی قونصل خانے پہنچ گئی تھی۔ ایس پی سینڈ سیکریٹری سے مذاکرات کے بعد اپنی ٹیم لے کر واپس آچکا ہے۔ بھارتی قونصل خانے کا کوئی افسر خود چوڑا کو پولیس ہیڈ کوارٹرز پہنچائے گا۔“

تھا۔ اسے یہ علم نہیں تھا کہ میں نے اپنے کمرے میں جانے کے بعد غزالہ سے کیا تبادلہ خیال کیا تھا۔ اس طرح اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ میں نے رات کو فون پر سہیلی اور جہانگیر سے بات کر لی تھی۔

جب میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا اور کسل مندانہ انداز میں بہت دھیرے دھیرے ناشتا کرنے میں مصروف رہا تو اس نے زنج ہو کر دانت پیستے ہوئے بتایا کہ اخبار میں کلفٹن کے ویرا ساعل سے ایک نامعلوم شخص کی لاش کی بازیابی کے سوا کوئی خاص خبر نہیں تھی۔

”مجھے ٹانے کی کوشش مت کرو۔ غور سے دیکھو۔ اخبار میں ہمارے کام کی اور خبریں بھی ہوں گی۔“ میں نے چائے کا گھونٹ لے کر کہا۔

”میرے صبر کا امتحان مت لو ورنہ میں تمہارا سر پھاڑ دوں گی۔“ وہ غصے سے بولی ”تم جان بوجھ کر ناشتا ختم کرنے میں دیر لگا رہے ہو۔“

غزالہ شاید ویرا کے وہ بے تکلفانہ فقرے برداشت نہیں کر سکی اور اس نے مسکراتے ہوئے قلعی کھول دی ”یہ بلا وجہ تمہیں زنج کر رہے ہیں۔ تم اپنا خون نہ کھولاؤ۔ انہوں نے رات کو ہی ان دونوں کو فون پر ہوشیار کر دیا تھا۔ آج جہانگیر اپنی دکان کا رخ نہیں کرے گا۔ گھر پر رک کر ان کا انتظار کرے گا۔“

ویرا غصے میں اخبار میز پر پھینک کر اپنے کمرے کی طرف چل دی۔ غزالہ کے ہونٹوں پر آسودہ سی مسکراہٹ تیر گئی۔
اسے ویرا سے کوئی پر خاش نہیں تھی۔ وہ اس کی بعض حرکتوں سے چشم پوشی بھی کر لیتی تھی لیکن اندر سے وہ زری عورت تھی اور اپنے مرد پر ایک حد سے آگے کسی عورت کا حق برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ ویرا اس کے رویہ وینہ کر میرا سر پھاڑنے کی دھمکی دے رہی تھی۔ غزالہ نے اپنی کسی ناراضی کا اظہار کیے بغیر نہایت خوب صورتی بلکہ معصومیت سے ویرا کا یہ غور توڑ دیا تھا کہ وہ غزالہ کی موجودگی کی پروا کیے بغیر میرے ساتھ من مانا سلوک کر سکتی ہے۔

”میں اس سے تفریح لے رہا تھا۔ تم نے بھاندا پھوڑ کر اس کا موڈ خراب کر دیا۔“ میں نے غزالہ کو ٹٹولنے کی نیت سے کہا۔

”میں نے دانستہ اسے یہ بتا دیا کہ آپ مجھے اس سے زیادہ اہم اور قابل اعتماد سمجھتے ہیں کیونکہ میں آپ کی بیوی ہوں اور وہ محض ایک دوست ہے۔ تفریح اور بد تمیزی میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔ وہ میرے سامنے آپ کے ساتھ

ساتھ یہ عملی حقائق اپنی جگہ پر ہیں مگر چوڑا ہر تشدد سے محفوظ رہے گا۔

”اس کے بارے میں میری حسرتیں دل میں رہ جائیں گی۔ مجھ سے بہتر ہے کہ اب وہ اپنے آقاؤں کے بجائے ہماری پولیس کی تحویل میں ہوگا۔ میری آرزو ہے کہ اسے اتنی لمبی سزا ہو کہ اس کے سارے کس بل نکل جائیں۔“

”تو فصل خانے والے اس کے لیے سفارتی پناہ کا اعلان کر کے اسے بچا سکتے تھے۔“ قدرے سکوت کے بعد جلال کی آواز ابھری ”پتا نہیں انہوں نے یہ سدا بہار حربہ کیوں استعمال نہیں کیا۔“

”وہ ہندو ہے، پاکستانی ہے اور ایک سنگین جرم میں ملوث ہے۔ شاید اس کی وجہ سے ان کی ساکھ تباہ ہو جاتی۔ وہ جانتے ہیں کہ ہر سفارتی اسکینڈل کو دنیا بھر کے اخبارات خوب اچھالتے ہیں۔ بظاہر ان کے گریز کا یہی ایک سبب نظر آتا ہے۔“

”یہ ہاتھ آنے والا ہے۔ اب آئی مین رہ گیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ایسے گناہ آدمی کے بارے میں کہاں سے کام کی ابتدا کی جائے۔“ جلال یکایک دوسرے اہم ترین موضوع پر گھبرا گیا ”مجھے رپورٹ ملی ہے کہ اس کے لیے کرائے پر مکان حاصل کرنے والا کلشن سے مردہ حالت میں ملا ہے۔“

”تم چوڑا کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ ہم اس پر اپنا سر رکھا رہے تھے۔“ میں نے اسے بتایا ”ہم فوری طور پر کچھ تو نہیں کر سکتے لیکن ایک راہ نظر آئی ہے۔ اگر میرا اندازہ درست ہے تو اب وہ میرے ایک دوست پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرے گا۔“

”اور تم اسے چارہ بنا کر آئی مین کو پکڑنا چاہو گے۔“ جلال کا سوال بے ساختہ تھا۔

”میں ایسی حرکت کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔“ میں نے قدرے ترشی سے جواب دیا ”میں اسے بچانے کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دوں گا۔ اگر وہ مجھ تک پہنچنے کا ارادہ رکھتا ہے اور شی کے پرانے لوگوں کے بارے میں وسیع معلومات رکھتا ہے تو اسے ادھر کا رخ کرنا چاہیے۔“

”تمہارا حساب درست معلوم ہوتا ہے۔ یہ بتاؤ کہ اس سلسلے میں میرے کراچی آفس کو کیا کرنا ہے۔“ اس نے کھلے دل سے اپنی خدمات پیش کیں۔

”جما تیر کے گرد زیادہ بھیڑ بھاڑ ہے وہ چونکا ہوا جائے گا اور ہمارے جال میں پھنسنے کے بجائے کسی مناسب موقع کی

”جب وہ اصولی طور پر اسے قانون کے حوالے کرنے پر آمادہ ہو گئے ہیں تو پھر ٹال مٹول کیوں کر رہے ہیں۔“

”وہ ان کے گندے کھیل کا ایک اہم مہم ہے۔ گرفتاری سے پہلے وہ اس کی برادری کو رہے ہوں گے۔“ جلال کی آواز سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اسے چوٹین کے بارے میں سوچ کر محفوظ ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”ان پر یہ آفت اچانک نازل ہوئی ہے۔ اب وہ اسے سمجھا رہے ہوں گے کہ پولیس کے سامنے اسے کیا کچھ کہنا ہے اور کن موضوعات پر اپنی زبان بند رکھنی ہے۔ اس کی کوئی بھی لغزش ایک نئے اسکینڈل کو جنم دے سکتی ہے۔“

”وہ لاکھ مقامی سہی مگر سفارتی ملازم ہے کیا اس کی گرفتاری میں دیا نا کونشن حائل نہیں ہوا۔“

”غیر ملکی سفارت عملے کو اس کونشن کے تحت سونفمنڈ تحفظ حاصل ہے۔ ان کے خلاف مقامی حکومت کوئی کارروائی نہیں کر سکتی۔“ تحریری شکایت پر ان کا اپنا ملک تفتیش کر کے فیصلہ کرتا ہے۔ مقامیوں کے بارے میں کہیں کہیں ابہام ہے۔ بین الاقوامی خبر گاہی کے لیے مقامی قوانین کو یکسر مسترد نہیں کیا جاسکتا۔ بھارتی تو فصل خانے والے اسے ہمیشہ کے لیے پناہ نہیں دے سکتے اور نہ ہی خاموشی سے اسے پاکستان سے نکال سکتے ہیں۔ اس کا جرم اتنا واضح اور سنگین ہے کہ وہ ہماری بات ماننے پر مجبور ہو گئے۔“

”شاید یہ پہلی بار ہوا ہے کہ روایتی طریقے پر کوئی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اب چوڑا کو عقل آئے گی کہ جس شاخ پر انسان کا آشیانہ بنا ہوا ہو، اس کو کانٹے کے نتائج کتنے سنگین ہوتے ہیں۔“

”وہ گرفتار ضرور ہو جائے گا مگر اس کی سیوا نہیں ہو سکے گی۔ تو فصل خانے کا ایک افسر روزانہ اس سے ملے گا۔ ویسے بھی ہمارا قانون زیر تفتیش قیدیوں پر تشدد کی اجازت نہیں دیتا۔“

جلال کے اس جواب پر میں بے ساختہ ہنس پڑا ”تم بہت عجیب بات کر رہے ہو۔ یہاں آئے دن زیر تفتیش قیدی زخمی اور معذور ہوتے رہتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ مہربی جاتے ہیں اور ان کی موت کو کوئی دوسرا رنگ دے دیا جاتا ہے۔ ان پر تشدد کے لیے کون قانون کی پروا کرتا ہے یا اس سے اجازت لیتا ہے۔“

”قیدیوں پر تشدد ایک عالمی مسئلہ ہے۔ تفتیش میں سے یہ عنصر نکال دیا جائے تو دنیا بھر میں سزا پانے والے مجرموں کی تعداد شاید دس حصے کم ہو جائے۔ قانون کے مندرجات کے

تھا۔ وہ سب چندن کے چڑائے ہوئے فون اور اس کے اپنے فیکس نمبروں پر اپنی رپورٹیں ارسال کرتے تھے جو چوڑا سفارتی ڈاک کے ساتھ پوری حفاظت سے دہلی روانہ کر دیتا تھا۔ ان مجبوروں کو وہ غالباً اسی طرح ہدایات بھی دیتا ہوگا۔ مجھے ایک فیکس بھیجنے کے بعد اس کے ساتھ کام کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا اس لیے میں ہدایات کے اجرا کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا مگر فیکس رپورٹنگ ایک مسئلہ حقیقت تھی۔ وہ اس طریقے سے نہ جانے کتنے راز اپنے آقاؤں کو فراہم کر چکا تھا۔

اس کا دوسرا جرم بھی کم یقین نہیں تھا۔ ہیروئن بنانے والوں کو ممنوع کیمیکل کی فراہمی اور ہیروئن کی مفت تقسیم کا جرم اس کے گلے کا طوق بن چکا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ عدالتی کارروائی میں اس کی غداری کے بارے میں کوئی نکتہ نہیں اٹھایا جائے گا۔ وہ الزام کتنا ہی ٹھوس ہوتا، بھارتی اسے انتقام قرار دیتے۔ اس کی سزا پالی کے لیے اس کا دوسرا جرم کافی تھا۔

چوڑا کے بارے میں پوچھتے ہوئے مجھے وندو کا خیال آیا۔ اس قابل کا نام جو تک بن کر جلال کے ذہن سے چکا ہوا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس نے اسے ایک لمحے کے لیے بھی فراموش نہیں کیا ہوگا مگر میں اس سے وندو کے بارے میں پوچھنا بھول گیا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ چوڑا کا معاملہ طے ہو جانے کے بعد اس وقت میدان میں صرف دو دشمن رہ گئے تھے۔ ان میں سے ایک جلال کے نشانے پر آیا ہوا تھا۔ دوسرے کے بارے میں میں نے ذمہ داری لی ہوئی تھی۔

”تمہاری باتیں سن کر کسی وقت مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آتا۔ سلطان شاہ دیر سے کہہ رہا تھا۔ ”جب تک تم بلیک کو سنبھالو گے تو پاکستان اور پاکستانیوں کے سائے تک سے بھلتی تھیں۔ کیا پلٹ ہونے کے بعد تم ہماری سب سے بڑی ہمدرد بن گئی ہو۔“

”ذہنی کے دم کو دعائیں دو۔ اس کی وجہ سے میں نے پاکستان اور پاکستانیوں کو قریب سے دیکھا ہے اور ان کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ مجھے تم لوگ بہت مظلوم نظر آئے ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں تمہارا کوئی دوست نہیں ہے۔ سب کو تم سے کوئی نہ کوئی پر خاش یا شکایت ہے۔“

”تم یہ نہیں کہہ سکتیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے دشمنوں کی تعداد بہت زیادہ ہے پھر بھی ہمارے دوست موجود ہیں اور ہم ان ہی کے سارے زندہ ہیں۔“

تلاش میں لگا رہے گا۔ میں یہ خطرہ مول نہیں لوں گا۔ میں تمہاری پیش کش کی دل سے قدر کرتا ہوں مگر اپنے دوست کو میں خود بخود نہیں گا۔“

”گڈ لک!“ اس نے اپنی نیک خواہش کا اظہار کیا ”وقت ملا تو میں شام تک دوبارہ فون کر کے تمہیں تازہ ترین حالات سے آگاہ کر دوں گا۔“

”ہو سکتا ہے کہ میں تمہاری دہر میں گھر سے نکل جاؤں۔“ میں نے اسے بتایا ”گھر کے نمبر کے بجائے مجھے موبائل پر فون کر لینا۔“

میں اس سے فون پر گفتگو کر کے فارغ ہوا تو دیر اپنی کمر پر دونوں ہاتھ رکھے میرے پیچھے کھڑی ہوئی تھی۔

”تمہیں اچانک دینا نا کونشن کیوں یاد آ گیا تھا؟“ اس نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

”چھپ کر کسی کی باتیں سننا اخلاقی عیوب میں شمار ہوتا ہے۔ میرے سر پر کھڑے رہنے کے بجائے تم سائے کر سی پر بھی بیٹھ سکتی تھیں۔“

”چھپ کر سننے اور چوری کر کے کھانے کا مزہ کچھ اور ہی ہوتا ہے۔“ اپنی کمر کو ہلکا سا مل دے کر وہ کرسی پر آ بیٹھی ”تمہاری باتوں سے اندازہ ہوا ہے کہ جلال چوڑا کو پکڑنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ آج کے دن کا آغاز ایک اچھی خبر سے ہوا ہے۔“

”میرے لیے حیران کن بات یہ ہے کہ بھارتی قونصل خانے والے اسے اپنی پناہ سے نکال کر قانون کے حوالے کرنے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ ان کا کوئی افسر بارہ بجے تک چوڑا کو پولیس ہیڈ آفس پہنچا دے گا۔“

”تمہاری طرح میری حسرتیں بھی دل میں رہ جائیں گی۔ اس غدار پاکستانی کے سر پر پھٹے ہوئے جوتے برسائے بغیر مجھے چین نہیں آئے گا۔“

”تم بھول گئیں کہ وہ غدار پاکستانی ہونے کے ساتھ ہندو بھی ہے۔“ سلطان شاہ نے اسے لقمہ دیا۔

”تم ہمیشہ کفن پھاڑ کر بات کرتے ہو۔“ دیر نے خوش دلی سے کہا ”ہندو ہونا جرم نہیں ہے۔ پاکستان میں لاکھوں ہندو رہتے ہیں۔ تم نے کس کو پکڑا؟ چوڑا کا یقین جرم یہ ہے کہ وہ پاکستانی ہوتے ہوئے پاکستان سے غداری کا مرتکب ہو رہا تھا۔“

اس کے بارے میں دیر کی رائے بالکل درست تھی۔ وہ دہرے جرم کا مرتکب ہوتا رہا تھا۔ ایک طرف وہ پاکستان میں چھپے ہوئے راکے مقامی اور غیر ملکی ایجنٹوں کا رابطہ افسر

”یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔“ ویرا نے اپنا سر جھٹک کر بے پروائی سے کہا ”تم صرف اس لیے زندہ ہو کہ سخت بات بلکہ ذہین تو م ہو۔ ذرا مجھے بتاؤ کہ تم کن قوموں کو اپنا دوست تصور کرتے ہو۔“ چوڑا سے ان دونوں کی باتوں کا سرخ یکایک عالمی فضا کی طرف ہو گیا۔

”عرب ہمارے دوست ہیں۔ پوری اسلامی دنیا ہماری ہم نوا ہے۔ ہم۔۔۔“

”بس یہ سہارا رہنے دو۔“ ویرا نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کر دیا ”تم فلسطینیوں سے زیادہ فلسطین کے وفادار ہو۔ کشمیر کا معاملہ اٹھتا ہے تو عرب بغلیں جھانکنے لگتے ہیں۔ کبھی تمہارے حکمران ان کی زیادہ خوشامد کریں تو ایک آدھ نیم دلانہ بیان جاری کر دیتے ہیں۔ وہ بھارت کے خلاف جابی نہیں سکتے کیونکہ ان کی بیشتر سستی درآمدات کا انحصار بھارت پر ہے۔ وہ تمہاری خاطر اس توازن کو کبھی خراب نہیں کریں گے۔“

میں خاموشی سے وہ گفتگو سنتا رہا۔ ویرا کی باتیں تلخ ضرور تھیں لیکن زمینی حقائق کی عکاسی کر رہی تھیں۔ یہ بھی ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اپنے گرد و پیش سے غافل نہیں رہتی تھی۔ اسے تازہ ترین عالمی حالات کا پورا احساس اور ادراک تھا۔

”تم افسانے تراش رہی ہو۔ عربوں نے ہر آڑے وقت میں ہماری مدد کی ہے۔“ سلطان شاہ نے احتجاج کیا۔

”یہ مدد ساہو کار والی ہوتی ہے۔ جانتے ہو وڈیرے اور ساہو کار کیا کرتے ہیں۔“

”آج تم اتوٹھی باتیں کر رہی ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ گلشن اقبال کے کسی بازار میں کسی عرب نے تمہاری دم پر پاؤں رکھ دیا ہے۔“

”وڈیرے اور ساہو کار کسی غریب کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے لیے دل کھول کر پیسا نہیں دیتے۔ انہیں ڈر ہوتا ہے کہ غریب خود کفیل ہو گیا تو ان کے چنگل سے نکل جائے گا۔ غریب کے گھر شادی ہو یا میت ہو جائے تو وہ اسے دل کھول کر قرضہ دیتے ہیں تاکہ غلامی کی زنجیریں مضبوط ہو جائیں۔ انہیں یقین ہوتا ہے کہ ایسے موقعوں پر دیا ہوا قرضہ غریب کے کسی کام نہیں آئے گا۔ رسموں میں برباد ہو جائے گا اور اس کی پینتیس بھی وہ قرض نہیں اتار سکیں گی۔ غریب کے بچے ان کے پیدا انٹی غلام ہوتے ہیں۔“

”ہائیں۔۔۔ اس وقت تو تم کسی کار میڈ جیسی باتیں کر رہی ہو۔“ سلطان شاہ نے آنکھیں پھاڑ کر حیرت سے کہا۔

”روس ٹوٹ گیا۔ اب ایسی باتیں بے اثر ہیں۔ چند برس تک پہلے یہ فیشن تھا کہ جو حق بات کرے اسے کامیاب قرار دے کر اچھوت بنادو۔ عرب تمہارے دوست نہیں، وڈیرے اور ساہو کار ہیں۔ آڑے وقت میں مدد دیتے ہیں جو فوراً کام آجاتی ہے۔ مستقل بنیادوں پر تم سے تعاون نہیں کرتے کہ کہیں تم اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل نہ ہو جاؤ۔ ذرا بھی غیر جذباتی ہو کر حالات کا تجزیہ کرو گے تو مجھ سے اختلاف نہیں کر سکو گے۔“

”مستقل بنیادوں پر وہ کیا تعاون کریں گے۔ تم چاہتی ہو کہ پاکستان ان کی زکوٰۃ اور خیرات پر چلتا رہے!“

”یہ گھنیا باتیں ہیں۔ مدد کرنے کے باعزت طریقے بھی ہیں۔ وہ تم سے ساری فاضل کیسا گندم اور چاول خرید سکتے ہیں۔ ضرورت کی ہزاروں چیزیں درآمد کر سکتے ہیں۔ اپنے ملکوں میں کام کرنے والے غیر ملکوں میں پاکستانیوں کی تعداد بڑھا سکتے ہیں۔ اپنے اربوں کے ڈالر کے اثاثے یہودی بینکوں سے نکال کر ماہر پاکستانی بینکاروں کے سپرد کر سکتے ہیں۔ چند ہفتوں میں پاکستان کی قیمت بدل جائے گی۔ وہ تمہارے دوست ہوں تو بہت کچھ کر سکتے ہیں مگر ان کو بھارت زیادہ عزیز ہے کیونکہ وہاں شراب کھلی ملتی ہے اور وہ عیاشی کے لیے مہمبی کارخ کرتے ہیں جہاں کسی قسم کے اسلامی قوانین ان کی راہ نہیں روکتے۔“

”اس وقت تمہاری باتیں چوکھی ہیں۔ بس عربوں کے خلاف بولے جا رہی ہو۔ وہ ایک ایسے ملک کے لیے اپنا سب کچھ داؤ پر نہیں لگا سکتے جہاں استحکام نہ ہو۔ تمہاری باتیں جذباتی اور کھوکھلی ہیں۔ تم ہمارے ذہنوں میں زہر بھرنے کی کوشش کر رہی ہو۔“

ویرا تلخی سے ہنس پڑی ”بس تمہاری ایک بات درست ہے کہ پاکستان میں استحکام نہیں ہے۔ یہ تصور تمہارے لیڈروں اور حکمرانوں کا ہے۔“

”اب تم سیاست پر لیکچر شروع کرنے کا ارادہ رکھتی ہو۔“ میں نے دخل انداز ہوتے ہوئے پوچھا۔

”میں نے ابھی تک اپنی طرف سے کچھ نہیں کہا۔ سلطان شاہ کی باتوں کا کھرا اور گڑوا جواب دیا ہے۔“

”کڑس بیچارے کا قصور صرف اتنا ہے کہ اس نے چوڑا کے ہندو ہونے کا ذکر کیا تھا اور تم اس پر چڑھ دو ڈریں۔“

”میری باتیں تم کو بری لگ رہی ہیں تو میں اپنی زبان بند کیے لیتی ہوں۔ تمہاری ہاں میں ہاں ملاتی رہوں گی مگر میری ایک بات کہیں لکھ لو کہ کسی نہ کسی وقت تمہارا قومی شعور

وقت تمہیں دکھ کر میرا دل باغ باغ ہو گیا۔ اس بار تمہاری غیر حاضری بہت لمبی تھی۔“

”تمہیں معلوم ہے کہ میں کراچی میں نہیں تھا۔ لاہور اور اسلام آباد دور گئے گئے تھا۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ وہ اپنے شانے اچکا کے بے پروائی سے بولا ”جب سسلی کے ماموں پکڑے گئے تو تم لاہور میں تھے۔“

”آپ نے پھر ماموں کا ذکر نکال لیا۔“ سسلی برا مان کر بولی ”اس وقت ان کا ذکر کراچی میں لانے کی کیا ضرورت تھی؟“

”اب میں دن تاریں تو یاد نہیں رکھتا۔ یہ معلوم ہے کہ ماموں عظمت کی گرفتاری والے دن ڈینی لاہور میں تھا۔“ جہانگیر نے مصوٰنہ باندھ پیش کر دیا مگر میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ دانستہ وہ ذکر نکال کر جہانگیر میرے سامنے سسلی کو ذلیل کرنا چاہ رہا تھا۔

”لاہور میں لوگ چوہدری عظمت کی عزت اور شرافت کی قسمیں کھاتے تھے۔“ سسلی نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں منکا کے تلخی سے کہا ”پتا نہیں کس نے ان سے دشمنی نکالی ہے۔ اب بھی لوگ کہتے ہیں کہ ان کے کسی دشمن نے گھر میں ہیروئن رکھوا کر پولیس میں خبری کی تھی۔ تم دیکھ لینا کہ بڑے ماموں عدالت سے انشاء اللہ باعزت بری ہوں گے۔“

”ہاں ہاں۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہارے بڑے ماموں بہت عزت دار ہیں۔“ جہانگیر نے ذرا تنک روم کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے تحقیر سے کہا ”ہر مجرم پکڑے جانے پر ایسے ہی ہمانے پیش کرتا ہے۔ میں خود سوچ سوچ کر حیران ہوتا تھا کہ وہ اپنی گھر سے مال خرچ کر کے فلاحی کام کرتے رہتے ہیں تو ان کے پاس دولت کہاں سے بہہ کر آ رہی ہے۔ منگائی کے اس زمانے میں حلال کی کمائی سے آدمی اپنے گھر کا خرچ چلا لے تو یہی بہت ہوتا ہے۔“

”بس آپ کو تو موقع چاہیے۔ ہر وقت زہر ملی باتوں کے نشتر چلا کر میرا سینہ چھلنی کر دیا ہے۔ مجھے پتا ہوتا کہ آپ یوں میرا جینا دھم کر دیں گے تو میں آپ کو بڑے ماموں والے قصبے کی ہوا بھی نہ لگنے دیتی۔“

”چاند چڑھتا ہے تو دنیا دیکھتی ہے۔ چور پکڑا جاتا ہے تو سب کو خبر ہو جاتی ہے۔“ جہانگیر نے بے سروپا سی مثالیں دہرائیں ”تم لہ باتیں تو کیا کرتیں۔ سارے اخباروں میں تمہارے ماموں کی ہتھکڑیوں والی بڑی بڑی تصویریں چھپی تھیں۔ پہلے وہ صرف لاہور میں مشہور تھے اب پورے پاکستان میں مشہور ہو گئے ہیں۔“

جاگے گا اور ہر پاکستانی کی زبان پر وہی باتیں ہوں گی جو میں ابھی کہہ رہی ہوں۔“

”فکر مت کرو۔ مطلع صاف ہو جائے تو میں جلال سے سفارش کروں گا کہ تمہیں دفتر خارجہ میں نوکری دلوا دے۔ تم اچھی تقریر کر لیتی ہو۔“ میں نے مزاحیہ انداز میں کہا۔

”تقریر نہیں، یہ دل دکھانے والی باتیں ہیں جو میں اکثر سوچتی رہتی ہوں اور پھر اندر ہی اندر کڑھتی ہوں۔“

اس پر کمری سنجیدگی طاری تھی۔ میں نے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے خاموشی اختیار کر لی۔

ویرا نے سگریٹ سلگائی اور کرسی کی پشت گاہ سے ٹیک لگا کر فضا میں دوھوس کے کثیف مرغولے بھیرنے لگی۔

”تم کب تک یہاں بیٹھے رہو گے۔ ایسا نہ ہو کہ جہانگیر تمہارے انتظار سے آگے کر گھر سے نکل کھڑا ہو۔“ کچھ دیر بعد ویرا نے چونک کر مجھے یاد دلایا۔

میں نے ویرا کو پوری بات نہیں بتائی تھی، میں اسے اپنے تمام خدشات سے آگاہ کر دیتا تو سنسنی اور مہم جوئی کے شوق میں وہ میرے ساتھ رہنے پر مصر ہو جاتی۔ میں اپنے اور جہانگیر کے درمیان اس کی موجودگی زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتا تھا کیونکہ جہانگیر دل و جان سے اپنی سابقہ بلیک کومین کو پسند کرتا تھا۔ وہ اس پر لٹو ہو کر جاوے جا اس کی ناز برداریوں میں مصروف ہو کر مجھے نظر انداز کرنا شروع کر دیتا جو مجھے گوارا نہیں ہو سکتا تھا۔

میں نے تھکے ہوئے انداز میں اپنی جگہ چھوڑی اور رواجی کے لیے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔



جہانگیر مجھ سے ایسے تپاک سے بغل گیر ہوا جیسے برسوں کا بچھڑا ہوا ملا ہو۔ گھنٹی کے جواب میں دروازہ اسی نے کھولا تھا۔ اس وقت سسلی شاید کہیں مصروف تھی۔ جہانگیر کی برجوش خیر مقدمی آوازیں سن کر وہ بھی لپک کر دروازے تک آئی۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک کووندنے لگی تھی۔

”یار مجھے اندر آکر بیٹھنے تو دوا میں دروازے پر دبا دبا کر ڈھیر کر دو گے۔“ میں نے جہانگیر کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے احتجاج کیا۔

”اندر آنے دیں۔ آپ تو دروازے پر ہی پلٹ گئے۔“ سسلی نے میری حمایت میں جہانگیر سے کہا۔

جہانگیر نے اپنی بیوی کے ایما پر مجھے آزاد کر دیا اور بولا ”کافی دنوں سے میری طبیعت بوجھل چل رہی تھی۔ اس۔“

”آپ نے کڑی کسلی باتوں میں عورتوں کو بھی مات دے دی ہے!“ سملی نے اس کو ملا مکتی۔

”میں لاہور گیا تو نیل میں تمہارے ماموں سے مل کر ضرور مشورہ کروں گا۔“ جنانگیر نے اس کی بات سنی ان سنی کر کے کہا ”گوئلڈن فارمیسی میں کچھ نہیں رکھا۔ دس بیس کلو ہیروئن ادھر ادھر کر دوں گا تو عمر بھر کے لیے دارے کے نیارے ہو جائیں گے۔“

”مجھے معلوم ہے کہ اپنے جیتے دوست کو دیکھ کر آپ زیادہ بول رہے ہیں۔“ سملی خشک کر بولی ”آپ کی زبان یوں بند نہیں ہوگی۔ میں بچن میں جا رہی ہوں۔“ وہ جانے کے لیے مڑی تو جنانگیر مجھے آنکھ مار کر شیطانی انداز میں مسکراتے لگا۔

”سالی! عزت دار کی بھانجی۔ چلی گئی نا آخر۔“ اس نے میرا ہاتھ تھام کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے دھیرے سے کہا۔ ”اس وقت میرے سامنے عظمت کا ذکر نکالنے کی کیا ضرورت تھی۔“ میں نے خشک لہجے میں پوچھا۔

”میں تم کو دکھانا چاہتا تھا کہ اب میں سملی سے نہیں دیتا۔ اس کا اونٹ براڑے لٹے آچکا ہے۔“ اس کی آواز سے دلی خوشی جھلک رہی تھی ”میں ہم سرگوشیوں میں باتیں کر رہی گے اور وہ ہماری کنسویاں لیتی رہے گی۔“ آؤ، بیڈ روم میں چلتے ہیں۔ دروازہ بند کر کے ان کنڈیشنر چلا لیں گے۔ وہاں کھل کر باتیں ہوں گی۔“

اس کی تجویز معقول تھی۔ وہ سملی اور اس کے خاندان کی برائیاں کرنے پر تلا ہوا تھا جب کہ مجھے اپنی باتوں کے لیے رازداری کی ضرورت تھی۔

”چائے وائے نہ بنانا۔“ جنانگیر نے کچن کے قریب سے گزرتے ہوئے سملی کو چھیڑا ”ہم بیڈ روم میں جا رہے ہیں۔ ٹھنڈی بیر کے دو چار ڈبے پیئیں گے۔“

”ہائیں!“ سملی چرت سے میری طرف پلٹ پڑی ”تم نے تو شراب چھوڑ دی تھی۔ کیا پھر شروع کر دی؟“

”جنانگیر کا دماغ خراب ہے۔ میں چائے پیوں گا۔“ ”چھوڑو!“ جنانگیر نے اصرار کیا ”بیر شراب کہاں ہوتی ہے۔ پورے ڈبے میں انٹک لمبل کے برابر اکھل ہوتی ہے۔“

”صرف چائے!“ میں نے سملی کو تاکید کی اور ہم دونوں بیڈ روم میں داخل ہو گئے۔

جنانگیر نے خواب گاہ کا دروازہ بند کر کے ان کنڈیشنر چلایا اور روم فرج سے بیر کا ایک نہایت ڈیا نکال کر کسی چوہدری کی

طرح بستر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

ڈبے کا کپ اٹھاڑتے ہوئے اس نے مجھے ایک مرتبہ پھر ترغیب دی لیکن میں نے مسکرا کر انکار میں سر ہلایا۔

”تم آدمی نہیں، جن ہو۔“ اس نے ڈبے سے منہ لگا کر پہلا گھونٹ اپنے معدے میں اتارنے کے بعد کہا ”مجھے یقین نہیں آتا کہ برسوں کی بلا نوشی کے بعد تم نے اچانک شراب چھوڑ دی۔ میرا خیال ہے کہ غزالہ کو اکھل کی تیز بو ناگوار لگتی ہوگی۔“

”تمہاری ذہنت بہت گندی ہے۔ میاں پیوی ہر وقت منہ سے منہ نہیں جوڑے رہتے۔ شراب میں نے اپنی مرضی سے چھوڑ دی ہے۔“

وہ ڈھٹائی سے ہنسنے لگا ”اپنی والی بدبو سے چنٹی ہے مگر میں اپنی مرضی سے پیتا ہوں۔“

”تم کون سی باتیں کرنے کے لیے مجھے اس کمرے میں لائے تھے۔“ میں نے سوال کیا۔

”یار میری زندگی برباد ہو گئی۔“ اس نے افسردگی سے سر ہلا کر کہا ”میں نے عزت دار گھر انا دیکھ کر سملی سے شادی کی تھی اور ہمیشہ اپنی مشتبہ سرگرمیوں کو اس سے چھپاتا رہا۔ اپنے ماضی کی وجہ سے میں اس کے سامنے ہمیشہ خود کو کم تر سمجھتا رہا اور یہ مجھ پر حاوی ہوتی چلی گئی۔ ذرا ذرا سی بات پر یکے جانے کی دھمکی دے کر یہ مجھے جھٹنے پر مجبور کر دیتی تھی۔“ ”سب کمائیاں میری دیکھی ہوئی ہیں۔ تم دونوں کے درمیان کبھی اعتماد کا رشتہ قائم نہیں ہو سکا۔ آگے بڑھو کہ تم کیا کسنا چاہ رہے ہو۔“

”اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ یہ ہیروئن کے اسمگلر کی بھانجی ہے تو مجھے اس سے ڈرنے یا دبے کی ضرورت نہیں تھی۔ آؤ کی پچی سے برابر کا سلوک کرنا۔ زیادہ بکواس کرنی تو چٹیا کو تین بل دے کر گھر سے نکال دیتا اور پھر دیکھتا کہ یہ کہاں جاتی ہے۔“ اس نے پرجوش لہجے میں کسنا شروع کیا لیکن میں نے دوبارہ اس کی بات کاٹ دی۔

”اپنی محرومیوں کا ذکر مت کرو۔ مجھے معلوم ہے کہ اپنے اس غم کو تم شراب میں گھول کر پی رہے ہو۔ ان خیالی شکوک کے بجائے یہ بتاؤ کہ اب کیا حالات ہیں؟“

”بڑے ماموں کے اندر ہوتے ہی یہ اپنی اوقات پر اچھی ہے۔“ وہ خوش ہو کر کہنے لگا ”میں بھی چٹکیاں لینے کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتا۔ اس کی برین داؤشک کر رہا ہوں۔ اس کے دماغ سے اپنی خاندانی بوائی کا بھوت اتر جائے گا تو شاید میری زندگی میں بھی ہمارا آجائے گی۔“

تو وہ فوراً معافی ضرور چاہتی۔ میں نے اس کی طرف نظر نہیں اٹھایا تو اس کی بڑی بڑی اور گہری آنکھوں میں کوئی نامعلوم سی التجا بھی۔ شاید مجھ سے تجلیے میں ملاقات کی آرزو اس کی نظروں میں ستاروں کی طرح جھللا رہی تھی۔ میں نے مضطربانہ انداز میں پہلو بدل کر جگہ کی طرف نگاہ ڈالی تو یہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا کہ اس نے سہلی کی نظر بازی نہیں دیکھی تھی۔ وہ سہلی کو جلانے کے لیے بیڑ کا ڈبا اپنے منہ سے لگائے ہوئے تھا۔

”فرج میں کئی ڈبے ہیں۔“ سہلی نے مڑتے ہوئے جگہ گھیرے کہا ”اسے خالی کر کے چاہئے جائیے گا۔“
”تم مرچیں چباتی رہو۔“ جگہ گھیرنے ڈبا منہ سے ہٹا کر بے پروائی سے کہا ”جب تک اپنا پیاریاں بیٹھا ہوا ہے مجھے تمہاری بکواس کی پروا نہیں ہے۔“
سہلی نے اسے نظر انداز کر کے مجھ سے پوچھا ”میں تمہارے لیے استیصال ڈش بنا رہی ہوں۔ آج تم کھانا کھا کر جاؤ گے۔“

”تم دونوں ایک دوسرے سے زبان درازی کرتے رہے تو میرا رکنا مشکل ہو گا۔“
”یہ کھٹ پٹ چلتی رہتی ہے۔ تم ایک کان سے سنو“ دوسرے سے اڑا دو۔ ہم عادی ہو گئے ہیں۔ ایک دوسرے کی گالیوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ تم بھی ہمیں برداشت کرلو۔ میں کھانا کھائے بغیر تم کو جانے نہیں دوں گی۔“
”ذہنی ابھی کہیں نہیں جا رہا۔“ جگہ گھیرنے سہلی کو ڈانٹا ”بلادجہ اس کی جیتنی بننے کی کوشش نہ کرو اور جا کر پراٹھوں کے ساتھ کوئی ڈھنگ کا کھانا تیار کرلو۔“

سہلی زبان سے کچھ نہیں بولی۔ تیز نظروں سے اسے گھور کر زیر لب کچھ بڑبڑاتی ہوئی باہر چلی گئی۔
”تم نے دیکھ لیا۔ میں گھر میں رہتا ہوں تو دن بھر کی ہوتا رہتا ہے۔ وہ مجھے سگاتی ہے میں اسے جلاتا رہتا ہوں۔ کبھی کبھی تو رات کو بستر میں بھی زنج کر دیتی ہے۔“

رات کا ذکر آتے ہی میرا ذہن پچھلی رات فون پر ہونے والی گفتگو کی طرف مڑنے لگا اور میں نے تیزی سے پوچھا ”رات کو تم نٹشے میں بالکل آؤٹ تھے۔“
”ہرگز ناں!“ اس نے سختی سے تردید کی ”مجھے معلوم ہے کہ میں نے تم سے بات کر کے فون بند کر دیا تھا۔“
”پھر تم خود کو گھوڑا کیوں کہہ رہے تھے؟“ میں نے حیران ہو کر سوال کیا۔
”یہ ذکر چھوڑو۔ کوئی اور بات کرو۔“ وہ جھپٹنے ہوئے

”سہلی تمہاری بیوی اور تمہارے بیٹے کی ماں ہے۔ اس کے لیے تمہیں ایسا نہیں سوچنا چاہیے۔“
”وہ میری کچھ بھی نہ ہوئی تو مجھے اس کے بارے میں سوچنے کی ضرورت نہیں تھی۔“ اس نے اپنے ڈبے سے ایک لمبا گھونٹ لے کر کہا ”سارا چکر یہی ہے کہ اب وہ میرے گلے پڑی ہوئی ہے اور میرے مالک نے مجھے اس کو سیدھا کرنے کا ایک سنہرا موقع دیا ہے تو میں اس سے فائدہ کیوں نہ اٹھاؤں۔“

اس وقت تک وہ اپنے اور سہلی کے بارے میں بولے جا رہا تھا لیکن اس سے آزادانہ انداز میں باتیں کرتے ہوئے مجھے اپنے ذہن سے تکان اور سستی دور ہوتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ تھوڑا سا کند ذہن ضرور تھا مگر میرے ساتھ بہت مخلص اور مہربان تھا۔ میرا ہم سن ہونے کے باوجود یوں میرا لحاظ کرتا تھا جیسے میں اس کا بزرگ ہوں۔
”اگر تم نے اسے ضرورت سے زیادہ تنگ کیا اور وہ زنج آکر لاہور چل دی تو کیا ہو گا۔“ میں نے پوچھا۔

”اب لاہور کی کمائی ہوا ہو گی۔“ اس نے چٹکی بجا کر فخر سے جواب دیا ”جب سے سالے ماموں کو رگڑا لگا ہے پورے خاندان کی کمر ٹوٹ گئی ہے۔ لاہور میں ایک کرام چچا ہوا ہے۔ یہ اپنی سہلی بیگم تم سے مدد کی آس لگائے بیٹھی تھیں۔ تم نے لاہور میں کورا جواب دے کر اسے کسی قابل نہیں چھوڑا۔ سیکے جائے گی تو طعنہ سن کر مر جائے گی۔“
”مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم سہلی کے لیے اتنے سفاک اور سنگ دل ہو۔“

”ٹریفک دونوں طرف سے چلتا ہے۔ وہ مجھے خوش رکھے گی تو میں اسے خوش رکھوں گا۔ ابھی اس کے دماغ کے کیڑے پوری طرح نہیں جھڑے ہیں۔ ابھی تم نے سن لیا کہ وہ اپنے بڑے ماموں کو معصوم سمجھ رہی ہے۔ ان لوگوں کو ہوش اس وقت آنے کا جب اس حرامی کو عدالت سے لمبی سزا ملے گی۔“

اس بار میں جگہ گھیرنے سے اختلاف نہیں کر سکا۔ وہ اپنی بیوی کی نفیات کو خوب سمجھتا تھا۔

دروازے پر دستک ہوئی اور سہلی میرے لیے چائے لیے ہوئے اندر آئی۔ اس نے ٹرے میز پر رکھتے ہوئے اپنی جوتی سے میرا پیر دیا تو میں ہچک پڑا۔ کمر کا کئی کشادہ تھا۔ یہ امکان نہیں تھا کہ سہلی کا پیر غلطی سے میرے پیر پر پڑا ہو۔ لمحہ بھر میں اس نے اپنا پیر ہٹا لیا۔ میں اس کی معذرت کا منتظر تھا مگر وہ خاموش رہی۔ اس کا پیر میرے پیر پر غلطی سے پڑا ہوتا

انداز میں بیٹنے لگا۔

”تم ہوش میں تھے تو مکاری کیوں کر رہے تھے۔ میں پریشان تھا کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ تم اتنے بھگنے والے نہیں ہو۔“

”یہ نئی ترکیب ہے۔“ وہ اپنی بانیں آگے دبا کر بولا ”جب سالی میری بات نہیں مانتی تو میں مزید ایک دو پیسے چڑھا کر مدد ہوشی کی اداکاری شروع کر دیتا ہوں اور یہ ڈر جاتی ہے کہ نا فرمانی پر میں اسے مارنا شروع نہ کر دوں۔ یہ اپنا تازہ سلیمانی نسخہ ہے۔“

”میں نے مان لیا کہ تم بد معاش ہو گئے ہو اور اپنی بیوی سے مکاری کرتے ہو مگر گھوڑا بیٹنے کی کیا تک تھی۔“

”آدمی سرور میں ہو اور مستی سوار ہو تو دماغ میں بڑے انوکھے خیال آتے ہیں۔“ چند ثانیوں تک جھجکنے کے بعد وہ بولنے لگا ”عورت اپنے مرد کو دیکھ دیکھ کر نہیں تھکتی لیکن مرد ہر روز پرانی عورت کو دیکھ کر تیزار ہو جاتا ہے۔ شاید اسی لیے ہم لوگوں کو چار شادیوں کی اجازت ہے کہ روز مظر بدلتا رہے۔“

”تم ایک بیوی کو خوش نہیں رکھ سکتے تو چار سے کیا انصاف کرو گے۔ یہ اجازت تم جیسے مردوں کے لیے نہیں ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

”میں بھی ڈرتا ہوں۔ ایک نے یہ حال کیا ہوا ہے۔ دوسری بھی اس جیسی ملی تو مجھے کسی کنوین میں کودنا پڑے گا۔“

”تمہارے ساتھ یہی ہو گا۔ تم نے اپنی رات والی حرکت کے بارے میں بات گول کر دی۔“

اس کا منہ لٹک گیا ”میں سمجھا تھا کہ تم بھول گئے۔ بس وہ میری ذہنی کج روی تھی کہ میں گھوڑا ہوں۔ میں جب تک آؤٹ نہیں ہوا اس نے میری بات نہیں مانی۔“

اس کی بات میری سمجھ میں نہیں آسکی۔ وہ اس کی خلوت کی بات تھی۔ وہ کھل کر بتانے سے بچتا رہا تھا۔ میں نے اپنا سوال تشنہ چھوڑ کر پوچھا ”تم ہوش میں تھے تو تم نے میرے ساتھ بد تمیزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فون کیوں بند کر دیا تھا۔“

”اس کے سامنے میں اداکاری کر رہا تھا، تمہارے ساتھ مکاری نہیں کر سکتا تھا۔“ اس نے ایمان داری سے جواب دیا ”تم نے مجھے گدھا کہا تو مجھے ناراضی کا اظہار کر کے فون بند کرنے کا موقع مل گیا۔“

”جہانگیر! تمہارے لہجے میں نہیں ہیں۔“ میں نے

لامت آمیز لہجے میں کہا ”اپنی بد سلوکیوں کی وجہ سے تم دھیرے دھیرے ازدواجی خودکشی کی طرف بڑھ رہے ہو۔“

”ازدواجی خودکشی!“ اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر دہرایا ”یہ کیا ہوتی ہے۔“

”تنگ آکر وہ تمہیں چھوڑ دے گی یا چوری چھپے کسی اور سے دوستی کر لے گی۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے وہ تلخ حقیقت کھل کر بیان کر دی۔

وہ بھڑبھڑائی لے کر رہ گیا اور سرگوشیاں آواز میں بولا ”نہیں یار! مجھے اتنی بے رحمی سے نہ ڈراؤ۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔“

اس بارے میں میری مزید لب کشائی خطرناک ہو سکتی تھی۔ میں نے اس سے جو کچھ کہا وہ میرے کئی تجربات اور مشاہدوں کا نچوڑ تھا۔ اگر اس کے پاس ذرا بھی عقل تھی تو اس کو میری بات پہلے سے باندھ لینی چاہیے تھی۔

کچھ دیر تک ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ جہانگیر فرج سے نیا کین نکالنے کے لیے بستر سے اترتا تو میں نے سگریٹ سلگائی۔

بیزر کے دوسرے کین سے ایک گھونٹ لینے کے بعد وہ دوبارہ مسہری پر چڑھ گیا اور چند ثانیوں کے سکوت کے بعد بھرائی ہوئی آواز میں بولا ”ذہنی! تم میرے عظیم دوست ہو۔ تم نے اپنے ایک جیلے سے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ پیر کے بچے آئی ہوئی چونی بھی بے بس ہو کر کاٹ لیتی ہے پھر سلی تو جوان اور خوش شکل عورت ہے۔ آج کے بعد میں پٹری بدل دوں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ مجھے بہت زیادہ چاہتی ہے مگر میری کمزوریوں سے بلیتی ہے۔ میں اس پر قابو پانے کی کوشش کروں گا۔“

اسے اندازہ نہیں تھا مگر میں جانتا تھا کہ جذبات کی رو میں بہ جانے کی کمزوری بھی اس پر غالب تھی۔ اگر وہ اپنے فیصلے پر قائم رہتا تو اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی تھی۔

”تم ایک بے جگر انسان ہو۔ تمہارا ماضی اس بات کا گواہ ہے۔ تم چاہو تو اپنی ہر کمزوری سے لڑ سکتے ہو۔“ میں نے اسے حوصلہ دیا۔

”بس! اب کوئی اور بات کرو!“ اس نے اپنا سر جھٹک کر کہا پھر قدرے توقف کے بعد بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”یہ بتاؤ کہ آج تم نے مجھے دکان جانے سے کیوں روکا ہے۔“

میں بے ساختہ مسکرا دیا ”یہ اہم ترین بات تمہیں اب یاد آئی ہے۔ میں شروع سے تمہارے اس سوال کا انتظار

”کیا تم نے اپنی بیوی کو اجازت دے رکھی

ہے کہ وہ جیسے چاہے کرے؟“

”نہیں... وہ میری اجازت کے بغیر ہی جیسے چاہے کرتی ہے۔“

”تم وہاں کیا کرو گے؟“ اس نے اپنی مجلس نگاہیں میرے چہرے پر مرکوز کر کے پوچھا۔

”دور سے نگرانی کروں گا۔ کوئی مشتبہ شخص میری نظروں میں آیا تو اس پر بلا تلفظ ہاتھ ڈال دوں گا۔“

”کیوں بلا وجہ کی خوراری مولیٰ لیتے ہو۔ چاہو تو میں دکان پر تمہارے بیٹھے کا بندوبست کر سکتا ہوں۔ میرے دونوں ملازم پرانے ہیں اور تم کو پہچانتے ہیں۔ تم ان کی نگرانی بھی کرتے رہو گے۔“

میں سوچ میں پڑ گیا۔ اس نئی تجویز کا فوری جواب دینا ممکن نہیں تھا۔

”اگر میری تجویز تم کو پسند نہیں آئی تو میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔ تم جس طرح چاہو کام کر سکتے ہو۔“ اس نے مجھے خاموشی کا رویہ دکھایا۔

”ذرا کچھ دیر خاموش رہو۔ میں تمہاری تجویز پر غور کر رہا ہوں۔ اس کے جملہ مضمرات کا اندازہ لگائے بغیر میں اقرار یا انکار نہیں کر سکتا۔“ میں نے نرمی سے کہا۔

”ضرور غور کرو۔“ وہ جلدی سے بولا ”میرا تجربہ ہے کہ تم جب کسی بات پر غور کرنے لگتے ہو تو تمہاری کھوپڑی بہت تیزی سے کام کرتی ہے اور پھر کوئی نہ کوئی گل کھلا کر رہتی ہے۔ اب میں خاموش ہو کر اپنے دھندے میں لگا رہوں گا۔“

وہ دو تکیوں کو اوپر تلے رکھ کر اپنی مسمری پر نیم دراز ہوا اور بیڑے سے لطف اندوز ہونے میں مصروف ہو گیا۔

گولڈن فارمیسی سے دور رہ کر دکان کی نگرانی کے مقابلے میں جمانگیر کی تجویز بہت بہتر تھی۔ دکان میں مالک کے نمائندے کی حیثیت سے بیٹھ کر میں ہر آنے جانے والے پر بہت قریب سے نظر رکھ کر ضرورت کے وقت بہترین فیصلے کر سکتا تھا۔

اگر میری دہان موجودگی کے دوران میں آئی میں اس کا کوئی آدمی جمانگیر کی تلاش میں دکان کی طرف آنکلتا تو میرے ہاتھوں سے اس کا بچنا محال تھا لیکن اس تجویز پر عمل کرنے میں سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ میں اپنے محفوظ ٹھکانے

کر رہا تھا۔

”بس ذہنی رو بہک ہوئی تھی۔“ اس نے خفت آمیز لہجے میں کہا ”میں نے پہلے سے سوچا ہوا تھا کہ تم آؤ گے تو تمہارے ساتھ مل کر سہیلی کا خون سلگاتا رہوں گا۔ یہ چکر کچھ ایسا چلا کہ اصل بات داغ سے نکل گئی۔ میری دکان پر اب تم کس قسم کے خطرے کی بو سونگھ رہے ہو؟“

”مطلع یکایک اب آلود ہو گیا ہے۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا ”طویل خاموشی کے بعد شکی کا ایک آئی ٹین میدان میں اتر آیا ہے۔“

”کہاں؟“ اچھی میں؟“ اس نے بے ساختہ حیرت سے پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلادیا ”تم کو معلوم ہے کہ وہ لوگ میرے خون کے پیاسے ہیں۔ وہ اپنے دوسرے کاموں کے ساتھ میری تلاش میں بھی ہے۔“

”میری اور تمہاری دوستی ان لوگوں کے علم میں ہے۔ تم تک پہنچنے میں ناکامی کی صورت میں وہ مجھے نشانہ بنا سکتے ہیں۔“

”میں نے اسی خطرے کی وجہ سے تمہیں دکان جانے سے روکا ہے۔ صورت حال واضح ہونے سے پہلے تم اپنی فارمیسی کا رخ نہیں کرو گے۔ وہاں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوگی۔“

”جب سے میں نے دکان کا پورا اشاک کمپیوٹر ڈالا ہے، چوری کا خطرہ ختم ہو گیا ہے۔ اسپرین کی ایک گولی بکتی ہے تو وہ بھی اشاک کیچر میں ڈالی جاتی ہے۔ دونوں ملازموں کو معلوم ہے کہ میں کسی بھی وقت دس بیس دواؤں کی مقدار کا کمپیوٹر سسٹم سے موازنہ کرنا رہتا ہوں۔ وہ چوری کرتے ہی پکڑے جائیں گے۔“

”پھر تم میری اگلی ہدایت تک گھر پر ہی رہو گے۔“ میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

”آئی ٹین کوئی معمولی آدمی نہیں ہوا کرتا تھا۔ وہ میرے پیچھے لگ گیا تو پھر گھر تک بھی آ سکتا ہے۔“ وہ ذرا بھی خائف نہیں تھا۔

”وہ نیا نیا آیا ہے اس کے رابطے محدود ہیں۔ میں نے اس پر وار کرنے میں پیل کر دی ہے۔ تمہارے گھر کا رخ کرنے سے پہلے وہ دس بار سوچے گا۔“

”میں نے صرف ایک امکان ظاہر کیا تھا۔ میں تمہارے ہر مشورے پر عمل کرنے کے لیے تیار ہوں۔“

”تمہارے پیش کیے ہوئے امکان کا علاج یہ ہے کہ تم گھر پر بھی محتاط رہو۔ دکان کا معاملہ میں خود کھوں گا۔“

سے نکل کر کھلے بازار میں جا بیٹھتا جہاں کوئی شناسا مجھے دور سے پہچان سکتا تھا۔

میرے حق میں سب سے مضبوط نکتہ یہ تھا کہ کسی کے ریکارڈ میں میری کوئی مصدقہ تصویر نہیں تھی۔ حد یہ تھی کہ سی آئی اے والوں نے بھی میری تلاش کی انعامی قسم میں میری ایک پرانی اور دھندلی تصویر کا سہارا لیا تھا جسے پہچانا اپنی جگہ ایک مسئلہ تھا۔

اگر ان کے پاس میری کوئی پرانی تصویر ہوتی تب بھی وقت کے ساتھ ساتھ میرے چہرے کے خدو خال میں ایسی تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں کہ مجھے آسانی سے شناخت کرنا ممکن نہیں تھا۔ میں بہت سکون اور احتیاط سے ایک ایک کر کے ان امکانات کا جائزہ لے رہا تھا۔ میری یادداشت کے مطابق ماضی قریب میں، میں پاکستان میں اپنے ایسے کسی حریف سے نہیں ملا تھا جو ڈینی کی حیثیت میں مجھے شناخت کر سکے۔ ہر وہ دشمن جس سے میرا ٹکراؤ ہوا تھا، جنم و اصل ہو چکا تھا۔

اس وقت مجھے پہچاننے والے لوگ رامیں بھارت کے لیے کام کر رہے تھے۔ وہ مجھے صورت سے اچھی طرح پہچانتے تھے۔ ان لوگوں میں رہتا اجیت رائے اور بیلا سنگھ کے نام سرفہرست تھے۔ ایک میری غلط آشنا ہو چکی تھی دوسری کے ترش کے سارے تیرنا کام ہوئے تھے۔

ان دونوں خوب صورت اور رنگین مزاج بھارتی لڑکیوں سمیت دہلی پولیس اور را کے جن لوگوں سے میرا واسطہ پڑا تھا، ان میں سے کسی کو یہ گمان نہیں ہو سکا تھا۔ میں اپنا نام بدل کر جعلی دستاویزات پر دہلی پہنچا تھا۔ وہ سب مجھے مظہر خان نامی دل پھینک پاکستانی کی حیثیت سے جانتے تھے۔ یہ اور بات تھی کہ اعلیٰ اور نریش کے قتل اور میرے دہلی سے فرار کے بعد مظہر خان کا نام تمام بھارتی ایجنسیوں کے مطلوب ملزموں کی لسٹ میں سرفہرست آچکا تھا۔

آئی مین چند ہفتے قبل پاکستان پہنچا تھا اور دھیرے دھیرے محتاط انداز میں اپنے رابطے استوار کر رہا تھا۔ اسے پاکستان میں مضبوطی سے قدم بنانے کے لیے خاصا وقت درکار تھا۔ ان حالات میں یہ امکان نہ ہونے کے برابر تھا کہ وہ مظہر کی تلاش کے لیے دہلی سے مدد طلب کر لیتا۔

دہلی کے حکام مظہر کی بو پر لگے ہوئے تھے۔ آئی مین کے لیے وہ نام غیر اہم تھا۔ اس نے میری ذات کو اصل ہدف بنایا ہوا تھا۔ جب تک اس راز سے پردہ نہیں اٹھتا تھا کہ مظہر اور ڈینی اصل میں ایک ہی شخصیت کے دو روپ ہیں، آئی مین

اور راولوں میں قریبی تعاون کا دور دور تک کوئی امکان نہیں تھا۔

جہانگیر نے سادہ لوحی سے ایک آسان تجویز پیش کر کے مجھے یکایک ایک خطرناک دوراے پر لاکھڑا کیا تھا جہاں سے ایک راستہ بھیانک انجام کی طرف جاتا تھا۔

”تم نے سوچنے میں کچھ زیادہ وقت لے لیا۔“ جہانگیر نے کھنکار کر میرا انہماک ختم کرتے ہوئے کہا ”بس میرا یہ کین خالی ہونے تک کوئی فیصلہ کرلو۔“

”یہ مشکل فیصلہ ہے۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”تمہیں معلوم ہے کہ میں ایک مدت سے ان سے چھپتا پھر رہا ہوں اور تم مجھے برسرِ عام جا بیٹھنے کا مشورہ دے رہے ہو۔“

”میں پھر کہہ رہا ہوں کہ میری تجویز میں کوئی سنگین خطرہ پنہاں ہے تو اسے بھول جاؤ۔ وہ کام کرو جو تمہارے دل کو لگتا ہو۔“

پتا نہیں اس مردود کے لیے میں کیا بات تھی کہ میں نے اسی لمحے ایک فیصلہ کر لیا اور کہا ”تم اپنے آدمیوں کو فون کر دو۔ میں اگلے دو چار دنوں تک تمہاری جگہ فارمیسی چلاؤں گا۔“

”زندہ باد!“ اس کے لیے میرا وہ اعلان اس قدر غیر متوقع تھا کہ وہ مکان فضا میں لہرا کر بستر سے اچھل پڑا ”اب کیا ہے تا تم نے مردوں والا فیصلہ۔ تم کو اتنی دیر سے تذبذب میں مبتلا دیکھ کر میرا دل مرجھا گیا تھا۔“

جہانگیر کے غرے کی آواز اتنی بلند تھی کہ سلمیٰ گھبرا کر بیڈروم میں ٹھس آئی اور بوکھلائی ہوئی آواز میں بولی ”کیا ہوا۔ ابھی کوئی چیخا تھا!“ اس کی ہراساں نظریں جہانگیر سے پھلتے ہوئے میرے چہرے پر مرکوز ہو گئیں تھیں۔

”کچھ نہیں۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ رات کو گھوڑا بننے کے خط میں مبتلا تھا۔ اس وقت لنگور بننے کی مشق کر رہا تھا۔“

رات کا ذکر آتے ہی سلمیٰ کا چہرہ تھمتا اٹھا اور گنگار ہو گیا۔ وہ تیزی سے مڑی اور کچھ کے بغیر بیڈروم سے نکل گئی۔

جہانگیر نے ہنستے ہوئے فون کا ریسیور اٹھایا اور گولڈن فارمیسی کا نمبر ملانے میں مصروف ہو گیا۔



مزید واقعات آئندہ شمارے میں پڑھیے

پھر بولا ”تم نے صحیح لفظ استعمال کیا ہے۔ دور سے فارسی کا کام صاف ستھرا نظر آتا تھا مگر اس میں کھنسنے کے بعد اندازہ ہوا ہے کہ اس کام میں بڑی زبردست جعل سازی ہو رہی ہے۔ مشہور برانڈز کی چٹنے والی دوائیں دو نمبریں رہی ہیں اور دھڑا دھڑا دکوانوں پر بک رہی ہیں۔“

”جعلی دوا میں بک رہی ہیں!“ میں اس کے انکشاف پر بھونچکا رہ گیا ”کیا کہہ رہے ہو تم؟“

”اس طرح انجان مت بنو۔ تم بھی اس ملک اور اسی شہر میں رہتے ہو۔ تم کو اتنا بے خبر نہیں ہونا چاہیے۔“

”مجھے معلوم ہے کہ مال دار بننے کے چکر میں ہر طرف ملاوٹ اور جعل سازی ہو رہی ہے۔“ میں نے اعتراف کیا

”لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ زندہ درگور مر بیٹھوں کو شفا کا پیغام دینے والی دوائیں بھی اس دیا کی زد میں آچکی ہوں گی۔“

”جب روز مرہ کھانے پینے کی چیزوں میں ملاوٹ ہو رہی ہے تو دوائیں کون سی آسمان سے اترتی ہیں۔“ جہا نگہ کرنے بے نیازی سے جواب دیا ”آٹے میں باسی ذیل روٹیاں اور بھوسی ٹکڑوں کی بوریاں ملائی جا رہی ہیں، چائے کی پتی میں پنے کے رنگے ہوئے چھلکے مل رہے ہیں۔ دھنیے میں لکڑی کا رنگین براہ ملا یا جا رہا ہے۔ کالی مرچوں میں پیٹے کے بیج ملا دیے جاتے ہیں۔ گھی اور تیل میں ایسی ایسی سستی اور لرزہ خیز چیزیں ملائی جا رہی ہیں کہ تیزی سے لوگوں کی بینائی خراب ہو رہی ہے، دل کے مرض پھیل رہے ہیں۔ ہر طرف یہ حال ہے تو دوا میں کیسے بچی رہ سکتی ہیں۔ ایک مشہور دوا کا اصلی پتا ہمیں دو سو سترہ روپے کا ملتا ہے۔ اسی کا دو نمبر صرف بیالیس روپے میں مل جاتا ہے۔ دونوں ایک دوا پر جلتے ہیں۔ گاہک کے فرشتوں کو بھی شبہ نہیں ہوتا کہ وہ اصل دوا کے بجائے نقلی گولیاں خرید رہا ہے۔ کم و بیش ہر دکان دار اپنی روزی کمانے کے لیے اس دھندے میں لگا ہوا ہے۔“

”دکان دار اللہ کا نام لے کر اپنے گھر سے نکلتا ہے اور اسی کا نام لے کر گردی اور گلہ سنبھالتا ہے۔“ میں نے اسے ملامت کی ”اسے ایسی بے ایمانی بلکہ غدار کی کرتے ہوئے شرم نہیں آتی۔“

”میں دوسروں کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کم از کم مجھے بہت شرم آتی ہے۔ میں گاہک سے صرف پیسے لیتا ہوں۔ جعلی دوا میں میرے ملازم بیٹھے ہیں۔“ اس نے حقیقت کا اعتراف کر کے اپنی گردن کا بوجھ ہلکا کر لیا۔

”تمہارے ملازموں کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ گاہکوں کو

”میں بار بار تم سے کہہ رہا ہوں کہ میرے مشورے میں کوئی غلین خطرہ نہیں ہے تو اس کو مسترد کر دو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ میرے لیے تمہاری سلامتی سب سے زیادہ اہم ہے۔“

”مجھے بھی اپنی جان پیاری ہے مگر میں تمہاری دکان ضرور چاؤں گا۔“

اس نے مضطربانہ انداز میں میرا بازو پکڑ لیا اور بولا

”حقانہ باتیں مت کرو۔ آئی مین کو پکڑنے کے ہزار مواقع مل جائیں گے لیکن تم نے اپنی کسی جذباتی حماقت سے اپنی جان گوا دی تو اسے ڈھونڈنے کے لیے دوبارہ کبھی اس دنیا میں نہیں آسکو گے۔ خطرے کی نزاکت کو سمجھنے کی کوشش کرو۔“

میں بے اختیار مسکرا دیا ”اللہ کی قدرت ہے کہ آج تم بظرا دینے ہوئے ہو اور مجھے صابن مشورہ دے رہے ہو۔“

”تمہارے اطمینان سے ظاہر ہو رہا ہے کہ تم کتنے کی کوئی بات مجھ سے چھپا رہے ہو۔“ اس کی آنکھوں میں شکوک کی پرچھائیاں تیرنے لگیں۔

”سب کچھ مجھ سے پوچھ لیتا چاہتے ہو۔ اپنی عقل بھی استعمال کرو۔“

”اتنی دیر سے میں اپنی عقل ہی استعمال کر رہا ہوں اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تم کوئی بات مجھ سے چھپا رہے ہو۔“

میں نے سکون سے سگریٹ کا ایک گہرا کش لیا پھر کثیف دھوس کے مرغولے فضا میں بکھیرتے ہوئے جواب دیا ”ہم دونوں اپنی اپنی جگہ سو فیصد درست ہیں۔ تمہاری دکان کے کاؤنٹر پر بیٹھنے میں ہر لمحے یہ دھڑکا رہا ہے گا کہ نامعلوم سمت سے آنے والی کوئی گولی میرا کام تمام کر دے گی مگر یہ اطمینان بھی ہے کہ میرے لوگ پیاسوں میں سے کوئی بھی مجھ کو میری موجودہ ہیئت میں نہیں پہچان سکتا۔ وہ مجھے ڈھونڈتے رہیں گے اور میں اطمینان سے ان کی گھات میں بیٹھا رہوں گا۔“

”یہ وجہ ہے تمہاری بے خوبی کی۔“ وہ ایک گہرا سانس لے کر بول پڑا ”حقیقت ہے کہ تم نے وضاحت کر دی ورنہ میرے سر پر ایک بوجھ سوار ہو گیا تھا۔ بات واضح ہوئی ہے تو میرے ذہن میں اس کا حل بھی موجود ہے۔ یہ بتاؤ کہ تمہیں دکان کی روز مرہ سرگرمیوں سے تو کوئی دلچسپی نہیں ہے!“

”مجھے دکان یا تمہارے کاروبار سے کیا لینا۔ تمہارے دھندے تم ہی کو مبارک ہوں۔“ میں نے بے رخی سے جواب دیا۔

”ذہنی اقبہ کرو۔ انہیں کیسے پتا چل سکتا ہے۔ مجھے خود پتا نہیں ہوتا کہ کون اصلی دوا لے جا رہا ہے اور کس کے ہاتھ جعلی دوا پہنچی گئی ہے۔“

”تمہارا یہ فلسفہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔“ میں نے اسے گھورتے ہوئے عصبیلی آوازیں کہا۔

”دو نمبر دوائیں اپنی پینٹنگ اور پرنٹنگ کے بل پر چلتی ہیں۔ ان کاموں کے لیے ہانگ کانگ، تائیوان اور کوریا سے سستی مشینیں مل جاتی ہیں۔ بڑی بڑی کمپنیوں کے ماہر بھی لیبارٹری لٹ کے بغیر جعلی دواؤں کو نہیں پہچان سکتے۔ دو نمبر مال آتا ہے تو میں اسے الگ نہیں رکھتا۔ ایمان داری سے اصلی دواؤں میں ملا دیتا ہوں۔ اب یہ آنے والے گاہک کی قیمت ہوتی ہے کہ اسے کیا ملتا ہے۔ میں جان بوجھ کر گاہکوں کو دھوکا نہیں دیتا۔ مارکیٹ میں تو اس سے بڑے فراڈ ہو رہے ہیں۔ اصل قیمت پر دو نمبر دوا ملتی ہے۔ اصل دوا بلیک ہوتی ہے۔“

ایمان داری اور دھوکے کے بارے میں جتنا لگیر کے نئے نظریات چونکا دینے والے تھے ”تم کو یہ سب بتاتے ہوئے شرم آتی چاہیے۔ تم اللہ کا نام لے کر اپنے کاروبار کا آغاز کرتے ہو اور کام میں اس قدر مکروہ حرکتیں کرتے ہو کہ شیطان بھی تم سے شرماتا ہو گا۔“

”بھائی! یہ دکان داری کے گرہن جو میں نے کافی مال گنوائے کے بعد دیکھے ہیں۔ تمہیں میرا احسان مند ہونا چاہیے کہ میں تمہیں یہ ساری باتیں مفت میں بتا رہا ہوں۔ ہم اللہ کا نام اپنی چیزیں بچانے کے لیے لیتے ہیں، توبہ کرنے کے لیے نہیں لیتے۔ ابھی تو توبہ کے لیے ساری عمر بڑی ہوئی ہے۔ تم دیکھ لو کہ میرے مولائے ابھی تک مجھ کو بچایا ہوا ہے۔ آج تک کسی غلط قسم کے ڈرگس انڈسٹری میری دکان میں قدم نہیں رکھا۔ جو آتا ہے، لگی بندھی رقم لے کر سلام کرتا ہے اور سر جھکا کر چلا جاتا ہے۔“

وہ انکشافات اس قدر ہولناک تھے کہ تھوڑی دیر کے لیے آئی مین اور اس کا قابل نفرت کردار میرے ذہن سے محو ہو گیا۔ میں نے حیرت اور غصے سے پوچھا ”کیا تم مجھے یہ بتانا چاہ رہے ہو کہ مارکیٹ میں یہ سارا ہیر پھیر سرکاری ڈرگس انڈسٹریز کی ملٹی بھگت سے ہوتا ہے۔“

”یار ذہنی! میرے سامنے تم اتنے معصوم نہ بنو۔ سرکاری کارندوں کی ملٹی بھگت کے بغیر کبھی غیر قانونی دھندے نہیں پنپ سکتے۔“

”تم غلط ڈرگس انڈسٹریز کو سمجھتے ہو؟“ میں نے اس کی بات کاٹ کر تیزی سے پوچھا۔

”جو بھتا لینے کے بجائے دواؤں کے نمونے لینے پر اصرار کرے، وہ ہماری راہ کا روڑا ہوتا ہے۔ پیچھے دنوں کراچی میں ایسا ہی ایک سرپیرا آگیا تھا۔ سب نے مل کر دو دنوں کی ہڑتال کی تو اس کا تبادلو ہو گیا۔ جو خود کچھ نہیں لے گا وہ اپنے اوپر والوں کو کیا دے گا۔ اس کے افسر بھی اس سے خار کھائے بیٹھے تھے۔ سالے پرالٹا کیس بن گیا۔“

”کیسا کیس؟“ ایک ایمان دار شخص کی اس بے رحمانہ درگت کا احوال میرے لیے عبرت اثر تھا۔

”اسے چھوڑو۔ تم کس کس کو روؤ گے۔ سب مل کر دونوں ہاتھوں سے دولت لوٹ رہے ہیں۔“ اس نے بے پروائی سے جواب دیا ”پولیس سی آئی اے، کوسٹ گارڈ اور کنسٹم والوں کو کیا پتا نہیں کہ گل سینٹر، موتن، واس مارکیٹ اور شہر بھر کی دکانوں میں اسمگلنگ کا سامان کہاں سے آتا ہے۔ ہر طرف بحثوں کا جگر چل رہا ہے۔ اپنی دواؤں کی ٹریڈ میں بھی یہی ہو رہا ہے۔ دکان چل نکلے تو یہ ہیروئن فروشی سے اچھا دھندا ہے۔ پکڑ دھکڑ کے خوف کے بغیر عزت سے روٹی کمائے جاتے۔ لیکن تم بلاوجہ ان باتوں میں پڑ کر اپنا وقت برباد کر رہے ہو۔ تم کو کون سی فارمیسی چلائی ہے۔ بس وہاں جا کر اپنا اڈا جمانا ہے۔ یہ سارے کام میرے آدمی سنبھالیں گے۔“

اس سے بات کر کے مجھے اندازہ ہوا کہ دوسری لائنوں کی طرح اس کے کام پر بھی ڈرگ مافیا کا راج تھا۔ یہ مانا کہ سب ایسے نہیں تھے لیکن مال و دولت کی دوڑ میں ایک بڑی تعداد بے ایمانیاں کر رہی تھی۔ میں وہ باتیں سن کر اپنا خون تو سلگا سکتا تھا، ڈرگس مافیا کا کچھ نہیں گاڑ سکتا تھا۔

”ٹھیک ہے۔ میں چلتا ہوں۔ دکان سے میں گھر چلا جاؤں گا۔ کوئی خاص بات ہوئی تو تم کو فون کر لوں گا۔“ میں نے کہا۔

”تم نے اپنی جرح کے چکر میں ایک اہم بات میرے ذہن سے نکال دی۔“ وہ اپنا سر جھٹک کر بولا۔

میں اس کی بھولی ہوئی بات کا مقرر رہا۔ اس نے قدرے توقف کے بعد اپنی بات جاری رکھی ”خطہ ہر حال میں خطرہ ہوتا ہے۔ تم کو اس سے بچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہ ضروری نہیں کہ تم کاؤنٹر کے پیچھے میری اونچی کرسی پر بیٹھے رہو۔ میں نے آرام کرنے اور قتلہ کرنے کے لیے دکان میں ایک کیمبن بنوایا ہے۔ اس کے تار یک شیشے میں سے تم دکان میں آئے جانے والے ہر شخص پر نظر رکھ سکتے ہو۔ وہ کیمبن تمہارے بیٹھے لینے کے لیے موزوں رہے گا۔“

”اس رہنمائی کا شکریہ۔ میرے جانے کے بعد سلمیٰ سے

وہ بے ہنگم پن سے ہنس پڑا ”یاروہ اتنی خوب صورت“
نفیس اور نرم و نازک لڑکی ہے۔ تم بلاوجہ اسے ہوا بنا رہے
ہو۔“

”میری بات مت مانو۔ خود تجربہ کرو۔ جب تمہیں عقل
آئے گی تو خود کو بالکل یکدہ تہاواؤ گے۔“

”تم نے کبھی اس کا ایسا ہوا کھڑا نہیں کیا۔ اب آئی میں
کے ہمارے اس سے مل بیٹھنے کے آثار نمودار ہوئے ہیں تو
تمہیں اس کے بارے میں ساری خطرناک باتیں یاد آنے لگی
ہیں۔ کچھ خدا کا خوف کرو۔ یوں میرا خون تو نہ سکھاؤ۔“

”تم جھوٹ بول رہے ہو۔“ میں نے بے باکی سے کہا
”میں گاہے گاہے یہ باتیں تمہارے کان میں ڈالتا رہا ہوں۔
اب تمہاری عقل پر ہی پردہ پڑ گیا ہو تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ وہ
ہیشہ سے ایسی تھی ایسی ہے اور ایسی ہی رہے گی۔“

”دیکھا جائے گا۔“ وہ بے پروائی سے بولا ”وہ تمہاری
منظور نظر نہ ہوتی تو میں اب تک دس بار اس کی کلائی مروڑ کر
اسے بے بس کر چکا ہوتا۔ وہ خود مجھ سے مذاق کرتی ہے۔ میں
تمہارے لحاظ میں اسے طرح دے جاتا ہوں۔“

بے نظیر ہیشمال عطر صد بہار

صدیوں پر محیط اطباء کے تجربات اور جدید سائنسی تحقیق نے
ثابت کر دیا ہے کہ خوشبو کی ایک لہر تھکے ہوئے انسانی ذہن
کے لئے اکسیر ہے۔ چنانچہ قدیم زمانے کے اطباء نے بے
شمار حیرت انگیز علاج صرف خوشبو کے ذریعے کئے۔

نادر و نایاب عطر ہے جس کی دلفریب خوشبو
انتہائی فرحت بخش اور روح پرور ہے۔ دیر
تک جسم اور لباس میں باقی رہنے والی یہ عیشاں خوشبودل و
دماغ میں سکون اور تازگی کے احساس کے ساتھ ساتھ
زندگی میں نئے جوش اور ولولے کا باعث بنتی ہے۔

اعلیٰ نتائج حاصل کرنے کے لئے صد بہار عطر تجارتی
بنیادوں پر تیار نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے معیار کو یقینی بنانے
کے لئے انتہائی محدود مقدار میں بنایا جاتا ہے۔

نفع نفع نقصان کی بنیاد پر اس نایاب عطر کی قیمت 265
روپے ہے۔ محصول ڈاک معاف ہوگا۔ گھر بیٹھے ایک خط
لکھ کر بذریعہ وی پی پائل طلب فرمائیں۔

گڈ لک پسنار پوسٹ بکس نمبر 2209 کراچی 74600

”میں اس سے کیا الجھوں گا۔“ وہ مجھے آنکھ مارتے
ہوئے مسکرا کر بولا ”تم نے دیکھا نہیں کہ اب وہ مجھ سے ڈر
گئی ہے۔ دو تین جھٹکوں میں تم سے آپ پر انگلی ہے۔ بیوی
ذرا ادب سے بات کرے تو آدمی کا دل خوش ہو جاتا ہے۔
خوشی کی حالت میں کسی سے الجھا نہیں جاتا۔“

بات پوری کر کے اس نے کین میں بچی ہوئی بیڑا اپنے
دہانے میں انڈیلی اور خالی ڈبا ڈسٹ بن میں اچھال دیا۔

میں نے رخصتی مصافحہ کرنے کے لیے ہاتھ اس کی طرف
بڑھایا تو اس نے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا اور کہا ”اس
سالے آئی میں نے ہم دونوں کا دماغ خراب کیا ہوا ہے۔
میرے ساتھ تم بھی بھول رہے ہو کہ سسلی تمہارے لیے
پرائیوٹ کالج تیار کر رہی ہے۔ تم کھانا چھوڑ کر گئے تو وہ سخت
ناراض ہو جائے گی۔“

”یار، تم اسے سمجھا لینا۔“ میں نے اس کی خوشامد کی
”ہم نے ساری باتیں کر ڈالی ہیں۔ اب میرا وقت برباد
ہوگا۔“

”ساری کہاں، ابھی تو باتیں شروع نہیں ہوئیں۔“ وہ
اوغرا نہ انداز میں مسکرایا ”اب آئی میں کا چکر چل نکلا ہے تو
اپنی بلیک کوئین بھی میدان میں اترے گی۔“

”میں کئی بار تمہیں سمجھا چکا ہوں کہ وہ خطرناک عورت
ہے۔“ میں نے دوبارہ اپنی جگہ سنبھالتے ہوئے کہا ”تمہارے
لیے بہتر ہو گا کہ اس سے دور رہو۔“

”میں اس سے دور ہی رہتا ہوں۔ میں نے اس سے کون
سی شادی کی فرمائش کی ہے۔“ جا نگیر نے الٹا مجھ سے احمقانہ
سوال کر ڈالا۔

”قرب کا مطلب صرف شادی نہیں ہوتا۔“ میں نے
غصے سے جواب دیا ”تم ہر وقت اس کی جڑ میں گھسنے کے چکر
میں رہتے ہو۔“

”واہ واہ۔“ میرے جواب پر وہ خوش ہو گیا ”تم کو بھی
کیا نادر خیال سوچتے ہیں۔ مجھے تو آج تک دیرا کی جڑ نظر
نہیں آسکی۔ تم۔۔۔“

میں نے ہنسا کر اس کی بات کاٹ دی ”اب آگے ایک
لفظ نہ بولنا۔ میری یہ بات کہیں لکھ کر رکھ لو کہ تم ایک بار دیرا
کی ناز برداروں میں لگ گئے تو دھوبی کے کتے کی طرح گھر کے
رہو گے نہ گھٹا کے۔ تم سسلی سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔
مردوں کے معاملے میں دیرا بہت سفاک ہے۔ وہ ان کو رعبھا
کر اپنے قدموں پر چھکانی ہے پھر انہیں ٹھوکروں سے اڑانا
شروع کر دیتی ہے۔ یہ اس کی سرشت ہے جسے بدلنا کسی کے
بس کی بات نہیں۔“

”میری وجہ سے اسے طرح دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کان بھول کر یہ بھی سن لو کہ وہ میری منظور نظر یا جیتی نہیں ہے۔ میرے مان کے لیے یہی کافی ہے کہ میں نے غزالہ کو خوش رکھا ہوا ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے مجھے دنیا کی کسی عورت کی پروا نہیں ہے۔“

”اس امر میں کوئی کلام نہیں کہ غزالہ ایک اچھی لڑکی اور تمہاری بہت اچھی بیوی ہے لیکن اپنی بیوی پر اتنا غور اچھا نہیں ہوتا۔ پتا نہیں تمہارے دل کو کب کوئی اور عورت بھا جائے یا پھر کسی وقت وہ اچانک ہی تمہارا ساتھ چھوڑ جائے۔“ اس نے دبے لہجے میں کہا۔

اس نے الفاظ کے انتخاب میں احتیاط کی تھی مگر اس کی بات درست تھی۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

ہم دونوں چند ثانیوں تک خاموش بیٹھے رہے۔ میں سگریٹ نوشی میں مصروف رہا۔ جمناگیر بڑ کا ناکسین نکالنے یا نہ نکالنے کے بارے میں متذبذب میں مبتلا تھا۔ سسلی کی بروقت آمد نے ہم دونوں کا مسئلہ حل کر دیا۔ اس نے اپنا چہرہ وغیرہ صاف کر لیا تھا لیکن قبض کے چست حصے پٹن کی گری میں نکلنے والے پسینے میں شرابور ہو رہے تھے۔ اس نے مسرت آمیز لہجے میں ہمیں اطلاع دی کہ میز پر کھانا تیار تھا۔

کھانا بالکل تازہ، گرم، کرم اور بہت لذیذ تھا۔ ہم آپس میں ہلکی پھلکی باتیں کرتے ہوئے شکر پری میں مصروف ہو گئے۔ کھانے کی مستطیل میز کی چوڑائی کے سامنے رکھی ہوئی اکلوتی کرسی پر سسلی صدر نشین تھی۔ اس کے دائیں بائیں جانب والی نشستوں پر ہم دونوں آئے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ باتوں کے درمیان کھانے کا دور پل رہا تھا کہ میرے گھٹنے سے کوئی گھٹنا قدرے زور سے ٹکرایا اور الگ ہو گیا۔ میں بری طرح چونک پڑا۔ میں نے دزدیدہ نظروں سے جمناگیر کی طرف دیکھا تو وہ سر جھکائے کھانے کی پلیٹ سے انصاف کرنے میں مصروف تھا۔ اگر وہ میری طرف متوجہ ہوتا تو میرے چہرے پر نمودار ہونے والی تبدیلی سے کسی گڑبڑ کا اندازہ لگا لیتا۔

وہ سسلی جیسی تیز و طرار بیوی کا شوہر تھا لیکن اس کی طرف سے یوں غافل رہتا تھا جیسے وہ اس کی زرخیز باندی ہو اور اس سے انحراف کرنے کی ہر جرات سے محروم ہو۔ سسلی اس کی آنکھ بچا کر میرے ساتھ ہمیشہ کوئی نہ کوئی حرکت کر گزرتی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے اس نے اپنی خواب گاہ میں جان بوجھ کر میرا بیڑ دیا تھا اور اس وقت کھانے کی میز پر گھٹنا لڑا دیا تھا۔ جمناگیر نے اسے برا بھلا کہا۔

نظروں سے سسلی کی طرف دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ناچ رہی تھی اور سیاہ آنکھوں میں شوخی رچی ہوئی تھی۔

کھونٹے سے بندھی ہوئی کسی بے بس گائے کی طرح اس نے گردن کو جنبش دی۔ کوئی مکالمہ نہ ہونے کے باوجود میں اس کا مدعا سمجھ گیا۔ وہ کوئی موقع نکال کر تھیلے میں مجھ سے بات کرنے کے خواہاں تھی۔ جمناگیر کی موجودگی میں میری پوزیشن محذوш تھی۔ میں نے سسلی کے اشارے کا کوئی جواب دیے بغیر اس سے نظریں چرائیں۔

کھانے کا دور ختم ہونے کے بعد جمناگیر مجھے ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ سسلی میز پر پھیلے ہوئے برتن سینٹے میں مصروف ہو گئی۔

میرا اندازہ تھا کہ سسلی سے تھیلے میں ملاقات کا مرحلہ میری کسی کوشش کے بغیر مکمل جائے گا مگر اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ عورت اسے مرد سے چوری پر مل جائے تو اسے ہوا لگتے دیے بغیر اس کی آنکھوں کا سرمہ بھی چرائی سکتی ہے۔

سسلی دیدہ دلیری سے ڈرائنگ روم میں آئی اور براہ راست مجھ سے مخاطب ہو کر دھیمی آواز میں بولی ”تم نے اپنا سارا بوجھ پار میرے اوپر ڈال دیا ہے۔ کم از کم کبھی کبھار اپنی امانت کی رقم پر بھی نظر ڈال لیا کرو۔ میں کب تک اسے لیے بیٹھی رہوں گی۔“

”جب تک مجھے تم پر بھروسہ ہے، مجھے رقم دیکھنے یا لگنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”بچی دیوی سے ایسی بے نیازی اچھی نہیں ہوتی۔“ جمناگیر نے نا سحرانہ لہجے میں مجھ سے کہا ”کبھی کبھی اس کے درشن کر لیا کرو۔ سسلی ٹھیک کہہ رہی ہے۔“

”او! میرے ساتھ آؤ۔“ سسلی نے مجھے حکم دیا پھر درواری میں جمناگیر سے پوچھا ”آپ بھی آرہے ہیں؟“

”میں پرانے مال پر نظر ڈالنا بھی پسند نہیں کرتا۔ ڈیٹی کا مال اسی کو مبارک ہو۔ تم دونوں اپنا کام کر آؤ۔ میں ٹی وی دیکھوں گا۔“

سسلی نے اس کے لیے ٹی وی وژن کا سوچا آن کر دیا اور مڑ کر اپنی خواب گاہ کی طرف چل دی۔ دو خفیہ فرمائشوں کے بعد اس نے کھانا باند ترائش کر میرے فرار کی ہر راہ مسدود کر دی تھی۔ مجھے ناچار اس کے پیچھے جانا پڑا۔

اس کے پیچھے کمرے میں داخل ہو کر میں نے جو خفیہ دروازہ بند کیا، سسلی تیزی سے میری طرف گھوم گئی ”میں نے اشارے سے تم کو متوجہ کیا تھا۔“

”میں اس تبدیلی سے بے خبر تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے خود اعتراف کیا ہے کہ اب وہ اصل کے نام پر جعلی دوا میں بھی بیچ رہا ہے۔ ایسے گھناؤنے کاموں میں آمدنی خود بخود بڑھ جاتی ہے۔ وہ کوئی اور ہیر پھیر نہیں کر رہا۔“

”غضب خدا کا۔ اب اس سے بڑا اور کیا ہیر پھیر کریں گے۔ اب وہ ہیروئن تو بیچنے سے رہے۔“

اس نے رواروی میں بے کی بات کہہ دی تھی۔ وہ اپنی شادی کی ابتدا سے ہی جہانگیر کی سرگرمیوں کے بارے میں شکوک و شبہات میں مبتلا تھی۔ وہ بھی اپنے گھر میں کتوں کی فوج پال لیتا تھا تو کبھی اپنے پورے گھر میں دن رات چراغاں کیے رہتا تھا تاکہ مسخ حملہ آوروں کا کوئی جھٹا اس کے گھر پر دھاوا بولنے کی ہمت نہ کر سکے۔ وہ ہر وقت اپنے گھر میں گھسا رہتا تھا۔ کبھی باہر نکلنا ہی پڑتا تو بیش قیمت بلٹ پروف گاڑی میں سفر کرتا تھا۔ اس نے اپنی مجبوریوں کے بارے میں کبھی بھی سلیٹی کو اپنے اعتماد میں لینے کی کوشش نہیں کی۔ ہمیشہ اسے حقارت سے دھکارتا رہا۔ اس کے دل کا چور بھی اسے سلیٹی سے بہت زیادہ قریب نہیں ہونے دیتا تھا اور یوں دن بدن ان دونوں کے درمیان ذہنی طغج بڑھتی چلی گئی۔ سلیٹی کے سارے شکوک و شبہات اپنی جگہ پر تھے مگر اسے پوری زندگی میں کبھی یہ شبہ نہیں ہوسکا تھا کہ اس کا مال دار شوہر ہیروئن فروشی کے منظم دھندے میں ملوث تھا۔

اس وقت سلیٹی ہیروئن فروشی کو بدترین اور قابل نفرت کام قرار دے رہی تھی مگر میرا خیال تھا کہ صحت بخش دواؤں میں مہلے کرنا ہیروئن فروشی سے بھی بڑا جرم تھا۔ ہیروئن لینے والے کو اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیسا زہریلا نشہ خرید رہا ہے اور اس کے دل و دماغ پر کیسے مضر اور سنگین اثرات ہو سکتے ہیں۔ میڈیکل اسٹور پر وہ زخم خوردہ بیمار دار آتے ہیں جن کے دلوں میں اپنے مریض کی زندگی کی کوئی آس ہوتی ہے۔ وہ پوری قیمت دے کر، صحیح علاج کی امید میں، دوا لیتے ہیں اور اپنے مریض کو دے دیتے ہیں پھر دوا کے معجزاتی اثرات کے انتظار میں اپنے رب سے لوگا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ وہاں دوا انہیں اس کا کوئی بے ضرر یا ضرر رساں متبادل ہوتا ہے۔ مریض کے سانسوں کی لڑی ٹوٹ جاتی ہے۔ کسی کو بچھ پتا نہیں چلتا کہ موت کے کس سوداگر نے وہ جعلی دوا بنانے اور دولت لوٹنے کا منصوبہ بنایا ہوا تھا۔

”میں نے اسے سمجھایا ہے اور مزید سمجھانے کی کوشش کروں گا۔“ میں نے سلیٹی سے کہا ”اس کا ہاتھ کھلا ہوا ہے پتا نہیں چلتا کہ موت کے کس سوداگر نے وہ جعلی دوا بنانے اور دولت لوٹنے کا منصوبہ بنایا ہوا تھا۔“

”جہانگیر تمہارا شوہر ہے۔“ اس کے سوال پر میں نے خود کو ہونق محسوس کرتے ہوئے کہنا شروع کیا ”وہ تمہاری اشارے بازیاں دیکھ لیتا تو مجھے اپنے گھر سے نکال کر تمہاری بڑیاں توڑ ڈالتا۔ تم کو اس کا زرا بھی خوف نہیں ہے۔“

”ان کے غصے سے میری جان نہ نکلتی ہوتی تو یہ گھر کب کا برباد ہو چکا ہوتا۔“

”سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی تم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتیں!“

”وہ تم کو مہانتا سمجھتے ہیں۔ تمہارے بارے میں بھول کر بھی کوئی غلط بات نہیں سوچ سکتے۔“

”اور تم اس کے اندھے اعتماد کا ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتی ہو!“ میں نے طنز میں پوچھا۔

”تم از کم اس وقت میرا ارادہ نیک تھا۔“ سلیٹی نے شوخی سے مسکراتے ہوئے جواب دیا ”میں دن بھر گھر پر ہتی ہوں۔ یہ باہر نہ جانے کیا کرتے پھرتے ہیں۔ کچھ دنوں سے میں بہت پریشان ہوں کیونکہ گھر میں آنے والی رقموں کی مقدار اچانک بڑھ گئی ہے۔“

”کن رقموں کی بات کر رہی ہو؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”یہ کہتے ہیں کہ دکان کی آمدنی بڑھ گئی ہے۔ کسی جائز کاروبار میں یوں اچانک آمدنی نہیں بڑھا کرتی۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ کہیں انہوں نے کوئی ہیرا پھیری نہ شروع کر دی ہو۔ خدا خدا کر کے اب ہم ان کے ماضی کی دہشت سے آزاد ہوئے ہیں۔ اب کوئی نیا مسئلہ کھڑا نہ ہو جائے۔“

اس کی تشویش کا سبب جان کر میں بے ساختہ ہنس پڑا ”سنا ہے کہ عورتیں جائز اور ناجائز میں امتیاز نہیں کرتیں۔ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے مرد زیادہ سے زیادہ رقم کما کر گھر لائیں۔ تم عجیب عورت ہو کہ شوہر کی آمدنی میں اضافے سے پریشان ہو رہی ہو۔“

”میں بے تحاشا آنے والی دولت کا نتیجہ بھگت چکی ہوں اس لیے ڈرتی ہوں۔“

”وہ پیسے گھر کیوں لاتا ہے؟ اپنی پونجی بینک میں کیوں نہیں رکھتا؟“

”کالا دھن ہو گا۔ تم نے بھی تو اپنی بہت بڑی رقم میرے پاس رکھوائی ہے۔ تم دونوں کی بعض عادتیں اور حرکتیں بالکل یکساں ہیں۔“ اس نے منہ بنا کر کہا اور قدرے توقف کے بعد شکوہ کیا ”تم نے ان کی آمدنی میں اضافے والا معاملہ گول کر دیا۔“

راستے بڑھ گیا ہے۔ میں اسے راہِ راست پر لانے کی کوشش کروں گا۔“

”تم لمبے عرصے کے لیے غائب ہو جاتے ہو تو میرے دل میں اداسی ڈیرے ڈال دیتی ہے۔ ذرا آتے جاتے رہا کرو تو میرے دل کو ڈھارس رہے گی۔“ سلمیٰ کے تیور یکایک بدل گئے۔

”مم... میں آؤں گا اور آتا رہوں گا۔“ میں نے بوکھلا کر وعدہ کیا ”کیا تم نے رقم دکھانے کا ارادہ ملوثی کر دیا ہے۔“ وہ تو تم سے ملنے کا بہانہ تھا۔“ وہ ایک اداس مسکرا کر بولی ”دیکھنا چاہو تو میں چابی نکالتی ہوں۔“

میں نے گھبرا کر اسے روک دیا ”ہرگز نہیں۔ اس کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے تم پر پورا اعتبار ہے۔“ اس کا ازار بند کے سرے پر بندھی ہوئی چابی کی طرف بڑھتا ہوا ہاتھ رک گیا۔ چابی کے گم یا چوری ہو جانے کے خوف سے اسے وہ اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتی تھی۔ یہ بات مجھ پر امانت داری کے ابتدائی دنوں میں ہی منکشف ہو چکی تھی۔

سلمیٰ نے اپنا اصل مسئلہ مجھ سے بیان کر کے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیا تھا اور اس کے دماغ پر رومان کا ہلکا سا بھوت سوار ہونے لگا تھا۔ وہ صورت حال میرے لیے خندوش تھی۔ میں نے اس کی دل جوئی کرنے کے بجائے اس کی باتوں کے اگلے سیدھے جواب دے کر اپنی جان چھڑائی اور خواب گاہ سے نکل آیا۔

”میرا خیال تھا کہ سلمیٰ تم کو رقم گنوانے بیٹھ گئی تو تم ایک آدھے گھنٹے سے پہلے کمرے سے باہر نہیں آؤ گے۔“ مجھے دیکھتے ہی جہانگیر نے کسل مندی سے کہا اور میں بری طرح چونک پڑا۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ اسے ہم دونوں پر شبہ ہو چکا تھا اور وہ مجھ پر گہرا طنز کر رہا تھا۔

”وہ رقم اتنی بڑی ہے کہ اسے گننے کے لیے تمہاری مدد ضروری تھی۔“ میں نے تسنیل کر جواب دیا ”میں تمہاری بیوی کے ساتھ کلبیا میں گز نہیں چھوڑ سکتا تھا۔“

”مجھ سے اپنی رقم نہیں گئی جاتی، میں تمہارے ڈالر کیا گنوں گا۔“ اس کی بے پروائی سے متراش تھا کہ اس نے جو کچھ کہا مصدومانہ سادگی سے کہا تھا۔ اس کے فقرے میں طنز کا شائبہ نہیں تھا۔

میں نے ان دونوں سے اجازت لی اور ان کے فلیٹ سے نکل کھڑا ہوا۔

سڑک پر آکر میں نے ٹیکسی پکڑی اور لی مارکیٹ کی

طرف روانہ ہو گیا جہاں جہانگیر کی گولڈن فارمیسی واقع تھی۔

میرا بس چند بار اس دکان پر جانا ہوا تھا۔ وہ اس کا کاروباری ٹھکانا تھا۔ میں کبھی گپ شپ لڑانے کی نیت سے وہاں نہیں بیٹھا تھا۔ جس کام سے گیا تھا اسے پورا کرتے ہی وہاں سے لوٹ گیا تھا۔ مجھے اس کے ملازموں کے چہروں مہروں پر غور کرنے کا وقت اور موقع ہی نہیں ملا تھا مگر گولڈن فارمیسی میں قدم رکھتے ہی ان دونوں نے بڑھ کر میرا استقبال کیا تو میں نے بلا توقف انہیں پہچان لیا۔ ان کے چہرے میرے لاشعور کے کسی نہاں خانے میں بہت اچھی طرح محفوظ تھے۔

میں کاؤنٹر کے پیچھے داخل ہو کر تاریک شیشوں کی دیواروں والے مختصر سے کیمن کی طرف بڑھ گیا۔ ان دونوں میں سے قدرے معمر آدمی میرے پیچھے تھا۔ ”جہانگیر صاحب کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔ کوئی گڑبڑ تو نہیں ہو گئی۔“ کیمن میں داخل ہوتے ہی معرلازم نے سوال کیا۔

”اس کی طبیعت ٹھیک ہے۔ چند دنوں کے لیے گھر پر آرام کرنے کا سمود ہے۔ تمہیں گڑبڑ کا خیال کیوں آیا؟“ میں نے پوچھا۔

”آپ کے آنے سے دس منٹ پہلے ان کا فون آیا تھا۔ کہہ رہے تھے کہ اب دکان پر صاف تھری دوائیں بکیں گی۔ جعلی مال ضائع کرویا جائے۔“ اس نے دھیمی آواز میں رازداری سے کہا۔

”یہ بہت اچھا فیصلہ ہے۔ کیا تم اس سے خوش نہیں ہو؟“ میں نے جہانگیر کے فیصلے سے اپنی بے خبری یا باخبری کا اعتراف کیے بغیر کہا۔

منیر نامی اس ملازم کے الفاظ سننے ہی مجھے سلمیٰ کا خیال آیا تھا۔ میں نے دواؤں میں جعل سازی کے موضوع پر جہانگیر سے جو کچھ کہا تھا وہ خاصا سخت تھا لیکن اس ڈھیٹ شخص نے میری باتوں کا زیادہ اثر نہیں لیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں نے اس دھندے کے بارے میں سلمیٰ کو باخبر کر کے ایک کار خیر کیا تھا۔ شاید وہ میری روائی کے بعد جہانگیر سے اچھ گئی ہوگی کہ زیادہ پیسے کے لالچ میں وہ ایسے مذموم کام میں کیوں ملوث تھا۔

اس وقت جہانگیر کی رگ اتری ہوئی تھی۔ وہ اندر سے خوش تھا کہ اپنے ماموں کی بدنامی اور گرفتاری کے بعد سلمیٰ اپنے بلند مقام سے گر کر اسی مرتبے پر آئی تھی جہاں وہ ماضی کے ایک مجرم کے طور پر فائز تھا۔ اسے دوسری خوشی یہ تھی

”باقی اشاک میں کوئی گھپلا نہیں ہے؟“ میں نے بے یقینی سے پوچھا۔ مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی تھی کہ صرف سات دواؤں میں جعل سازی کے نتیجے میں جمانگیر کی آمدنی میں اتنا اضافہ ہو گیا تھا کہ سسلی جیسی خاندان دار خاتون اس اضافے کو نوٹ کیے بغیر نہ رہ سکی۔

”باقی اشاک صاف ہے۔“ اس نے کھلے دل سے آگاہ کیا۔

”پھر ان ساتوں دواؤں کو بھی ضائع کر دو۔ کل ان کا اشاک پورا کر لیتا۔“

”صاحب! ان میں سے چار گولیاں بہت منگی ہیں۔ لاکھ روپے کے قریب نقصان ہوگا۔“ وہ تشویش سے بولا۔

”پر اومت کرو۔ جمانگیر نے شور کیا تو ایک لاکھ روپے میں اپنی جیب سے دے دوں گا۔ اب ایمان داری پر کمر باندھتی ہے تو پوری ایمان داری سے کام لو۔ اس لمحے کے بعد اس دکان سے ایک بھی جعلی گولی نہیں بیچی جائے گی۔ نہ جعلی دوائیں خریدی جائیں گی۔“

وہ سر جھکا کر خاموشی سے کیمین سے نکل گیا۔ اس دوران میں دوسرا ملازم دکان میں آنے والے گاؤں کو نمٹانے میں مصروف رہا تھا۔

وہ کیمین مختصر لیکن آرام دہ تھا۔ چھوٹی میز پر کپڑوں پرانے لوازم سمیت موجود تھا۔ بیٹھنے والی آرام دہ کرسی بھی زیادہ بڑی نہیں تھی۔ ایک دیوار کے ساتھ آرام کرنے کے لیے دیوان پڑا ہوا تھا۔ میں کرسی پر بیٹھا جھٹلایا اور باہر کا جائزہ لیتا رہا۔ میرے لیے آرام سے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ حالات میں آئی میں کی طرف سے کوئی پیش رفت ہو۔

تھوڑی دیر بعد میرے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ دوسری طرف سے حلال بول رہا تھا۔

”نہوں نے قدرے تاخیر کے ساتھ“ ایک بچے چوپڑا کو پولیس ہیڈ آفس پہنچا دیا۔“ اس کی آواز سے مسرت چھوٹی پڑ رہی تھی۔

”میرے لیے یہ آج کی بہت بڑی خبر ہے لیکن دکھ اس بات کا ہے کہ اس کی مناسب خاطر تواضع نہیں کی جاسکے گی۔“

”مناسب کیا“ اس پر ہاتھ اٹھانا بھی دشوار ہے۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ بھارتی قونصل خانے کا ایک افسر روز اس سے ملے آئے گا۔“

”پھر تم اس موزی کیوں ہی پالتے رہو گے؟“ میں نے

کہہ دیا۔ اسے اپنی خاندانی برتری کا خیال اترنے کے بعد سسلی کے رویے میں نمایاں تبدیلی آچکی تھی۔ نہ جمانگیر کے دل میں پیدا ہونے والی اسی نرمی کا کمال تھا کہ سسلی کے اصرار پر وہ جعلی دواؤں کی فروخت کے دھندے سے نائب ہوئے پر آمادہ ہو گیا۔

سسلی اپنے شوہر کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ جمانگیر کو زیادہ سوچنے سمجھنے کا موقع مل گیا تو وہ اپنی روش بدلنے سے منحرف ہو جائے گا۔ میرے چلے آنے کے بعد گھر میں جھیلے کا راج تھا۔ جمانگیر کے بیٹ میں بیڑ کے کئی ڈبوں پر مرغن خوراک اتر چکی تھی۔ سسلی نے یقینی طور پر اپنے ہر حربے سے کام لے کر جمانگیر کو مجبور کر دیا ہو گا کہ وہ فون کر کے اسی وقت اپنے ملازموں کو جعلی دواؤں کی تلفی کا حکم دے دے۔ وہ بات ملازموں وغیرہ تک پھیل جانے کے بعد جمانگیر کے لیے فیصلہ لوٹانا مشکل ہو جاتا۔

”صاحب مجھ سے زیادہ کون خوش ہوگا۔ مجھے تو کام کرنا ہے اور تنخواہ لینی ہے۔ پیسے اتنے ہی ملیں گے۔ اچھا ہوا کہ مفت کے ایک گناہ سے جان چھوٹ گئی۔“ منیر کہہ رہا تھا ”پتا نہیں اللہ کے کس نیک بندے نے ہمارے صاحب کو یہ راہ بھائی ہے۔ ایک بار کسی دکان دار کے منہ کو خون لگ جائے تو اس کا سدھنا مشکل ہوتا ہے۔“

”اب جعلی دواؤں کے ڈبے ضائع کر دو۔ یہ کام شام تک ہو جانا چاہیے۔“ میں نے اسے ہدایت کی۔

”یہ کام زیادہ تر گولیوں میں ہوتا ہے۔ آپ آئے تو ہم سر ہنڈ ڈبے الگ کر رہے تھے۔“ اس نے سر جھکا کر کہا۔

”اور جو ڈبے یا پتے اصلی دواؤں میں ملے ہوئے ہیں ان کا کیا ہوگا؟“ میرے لیے اپنی باخبری کا اظہار کرنا ضروری ہو گیا تھا۔

منیر کی تھیرزدہ نگاہیں میرے چہرے پر مرکوز ہو گئیں ”آپ کو سب معلوم ہے پھر تو یہ نیک مشورہ آپ نے ہی دیا ہوگا۔ ملی ہوئی دواؤں میں اصلی اور نقلی کا پتا چلانا ہمارے لیے بھی ناممکن ہے۔ جمانگیر صاحب کہتے تھے کہ بے ایمانی بھی پوری ایمان داری سے کی جانی چاہیے۔“

”اسی ملی جلی دواؤں کی تعداد کتنی ہے؟“ میں نے چند ثانیوں تک سوچنے کے بعد سوال کیا۔

”ہمیں دو نمبر کام شروع کیے ہوئے آٹھ دس ہفتے ہوئے ہیں۔ ویسے بھی ہر دوا کی نقل نہیں بنتی۔ بہت زیادہ چلنے والی دواؤں میں ہیر پھیر کیا جاتا ہے۔ ہمارے پاس اس وقت

سات دوائیں ملا جلا کر چل رہی ہیں۔“

ہوتا۔ وہ صرف پیسے کے لیے ہر حد سے گزر جاتے ہیں۔“
شاید میں جذبات کی رو میں بہہ رہا تھا۔ میرا وہ فقرہ مکمل
ہوئے ہی جلال نے غیر محسوس انداز میں میری بات کاٹ دی
”تمہیں چوڑا کے بارے میں فکر مند نہیں ہونا چاہیے۔ اب
تم میرے حق میں دعا کرو کہ میں ونود کو کبھی گھیرنے میں
کامیاب ہو جاؤں۔“

”یہ یاد رکھنا کہ وہ اسے چوڑا کی طرح قتالی میں سجا کر
تمہاری خدمت میں پیش نہیں کریں گے۔“ میں نے اسے یاد
دلایا ”وہ بھارتی قومیت کا حامل ہے“ را کا باقاعدہ ایجنٹ ہے
اور اسے یہاں باقاعدہ۔ غارتی تحفظ حاصل ہے۔“

”مجھے معلوم ہے۔ جہاں قانون بے بس ہو جاتا ہے وہاں
دوسرے حربے کام آتے ہیں۔“ جلال کی آواز پڑا اعتماد تھی۔
”میرا اندازہ ہے کہ تم ہر وقت قانون اور ضابطوں کی
زنجیر میں بندھے رہتے ہو۔“

”مجھے میرے منصب کی مجبوریوں کا اتنی شدت سے
احساس نہ دلاؤ۔ یہ مجبوریاں نت نئی راہوں پر چلنے پر مجبور
کردیتی ہیں۔ ذرا ٹھنڈے دل سے غور کرو کہ اپنی تمام
سرگرمیوں کے باوجود تم آج تک کیوں آزاد ہو۔ قانون اور ہر
دستور سے ماورا اسٹیشن ٹاسک فورس کے تصور نے کس کے
ذہن میں جنم لیا ہوگا۔ یہ اقتدار اور اختیار کے مالک اور
دور اندیش لوگوں کے فیصلے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ملکی
مفادات کے تحفظ کے لیے دشمنوں کا پیچھا کرنے والے ایک
لکیر تک پہنچ کر رک جانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس سے
آگے انہیں ضابطوں کی آگ جلا کر خاک کردیتی ہے۔ اس
لکیر سے آگے نکل جانے والے مجرموں کو ان کے کیفر کردار
تک پہنچانے کے لیے سبایوں کی ضرورت ہوتی ہے جن کی کوئی
بیچان نہ ہو۔ ہماری سلامتی کے لحاظ یہ گناہ سائے ایس بی
ایف میں پیلے اور پروان چڑھتے ہیں جہاں ہمارے پر چلے ہیں
وہاں یہ فرتے دشمن کو جلا کر رکھ کر دیتے ہیں۔“

پہلے میں جذباتی ہو رہا تھا۔ اس نے مجھے لوک کر دو کا تو
میں نے غیر ارادی طور پر اس کی دکھتی رگ پہا تھو رکھا وہ اور
وہ جذباتی ہونے لگا۔ اس کی باتوں سے اس عزم کا اظہار ہو رہا
تھا کہ ونود سے عبداللہ کا انتقام لینے کے لیے وہ کسی رکاوٹ کو
خاطر میں نہیں لائے گا۔ بین السطور میں کچھ ایسا اشارہ بھی
تھا کہ وہ اپنے سینے میں بھڑکنے والی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے
لیے اسٹیشن ٹاسک فورس سے مدد لے گا۔

بات ایسے نازک موڑ پر تھی کہ میں نے اسے کھینچنا
چھوڑنا نہ تھا۔ میں نے اسے کھینچنا چھوڑنا نہ تھا۔ میں نے اسے کھینچنا

”جسمانی تشدد کے علاوہ ہمارے لیے پاس دوسرے
نفسیاتی اور اعصابی حربے ہیں جن کا استعمال شروع کر دیا گیا
ہے۔“ اس نے مجھے خوش خبری سنائی ”ہم ایسے معاملات سے
نہننے میں خاص مہارت رکھتے ہیں۔ ضرورت پیش آئی تو اس
پر تشدد کی بھی کوئی نہ کوئی راہ نکل آئے گی۔“

”نفتیش کی ضروریات سے قطع نظر بھی وہ تشدد کا مستحق
ہے۔ اس کا حشر کم از کم راجا جیسا ضرور ہونا چاہیے۔“
”تم فکر نہ کرو۔ اس کا انجام راجا سے زیادہ ہوگا۔۔۔“
”اس کا مطلب ہے کہ تمہارے ذہن میں کوئی تجویز جنم
لے چکی ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا ”تم مجھے حیل
کر پوری بات کیوں نہیں بتاتے!“

”بلی سی بے ساختہ ہنسی کے بعد اس کی آواز ابھری ”وہ
عمر کوٹ کا رہنے والا ہے۔ میں کسی بھی وقت اسے وہاں منتقل
کرا دوں گا پھر دیکھتا ہوں کہ بھارتی فو نصل خانے والے
روزانہ اس کی خبر گیری کیسے کرتے ہیں۔“

”وہ اس کی عمر کوٹ منتقلی پر سخت شور مچائیں گے۔ وہ
اسے معصوم نہیں ہیں کہ تمہاری نیت اور ارادوں کو نہ سمجھ
سکیں۔“

”اس احتجاج کی گنجائش نہیں ہوگی۔ یہ بتایا جائے گا کہ
کچھ کڑیاں عمر کوٹ میں ہیں۔ کیس کی تیاری کے لیے ملزم کا
وہاں لے جایا جانا گزیر ہے۔“

”یہ تمہارے معاملے ہیں۔ انہیں تم بہتر سمجھ سکتے ہو۔
میری دلی آرزو یہ ہے کہ وہ قانون کی گرفت میں آ ہی گیا ہے تو
کوئی بھی تحفظ اس کے کام نہ آ سکے۔ اس کا وہی حشر اور
انجام ہونا چاہیے جس کا وہ مستحق ہے۔“ میں نے اپنے
اشتغال پر قابو رہتے ہوئے کہا۔

”بلی سی تفسیسی ہنسی کے ساتھ اس کی آواز ابھری ”میں
تمہاری کیفیت کو خوب سمجھ رہا ہوں کیونکہ میں خود بھی ونود
کے بارے میں اسی کیفیت سے گزر رہا ہوں۔ طبیعت یہ چاہتی
ہے کہ پوری درندگی کے ساتھ اس کے بدن کو چیر پھاڑ کر رکھ
دیا جائے۔ غداری کی سزا اس سے کم نہیں ہونی چاہیے۔“

”جو لوگ بھارتی یا پھر غیر ملکی ہیں ان کی جرمناہ اور
سازشی سرگرمیاں قابلِ فہم ہوتی ہیں۔ ان کو اس زمین سے
پیارا ہوتا ہے نہ وہ یہاں رہنے والوں سے کوئی لگاؤ رکھتے ہیں۔
ان کے لیے دولت سب کچھ ہوتی ہے۔ بھارتی جاسوس یہاں
کام کرتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہوں گے کہ وہ اپنے ہندو
دلش کی سر بلندی کے لیے ایک مسلمان ملک کی جڑیں کاٹ
رہے ہیں۔ غداروں کے ساتھ ایسا کوئی مثال نہیں

کریں۔“ جلال شاید اپنی تشفی کے لیے مجھ سے جرح کر رہا تھا۔

”حالات کا رخ تمہارے اس اندیشے کی نفی کر رہا ہے۔ آئی مین بہت زیادہ تیزی دکھا رہا ہے۔ اس نے جس انداز میں راجا اور جوشی کو گھیرا تھا اور اس کی روشنی میں اس کا اگلا ہدف جمائیکیری ہونا چاہیے۔ مجھے امید ہے کہ وہ فارمسی کی طرف آنے میں زیادہ دیر نہیں لگائے گا۔“

”میں ایک مرتبہ پھر اپنی پیشکش دہرا رہا ہوں۔ میری پوری نفی تمہارے ایک اشارے پر میدان میں اتاری جاسکتی ہے۔“ اس کی آواز پر تشویش ہوئی۔ اپنے طور پر وہ شی اور اس کے بہنوں کے طریقہ کار سے اچھی طرح واقف تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ لوگ اپنے حریفوں کو معاف کرنے والے لوگ نہیں تھے۔ اپنی گرفت میں آنے والے حریف کو بہت بے رحمی سے ذبح کر ڈالتے تھے۔ گردنیں کاٹنے کے اس کھیل میں میری طرف سے ذرا بھی کوتاہی ہوتی تو آئی مین وہیں میری گردن اتار کر رکھ دیتا۔

”تمہیں مضطرب ہونے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے اسے اطمینان دلایا۔ ”میں نے ضرورت محسوس کی تو لمحہ بھر کے لیے بھی توقف نہیں کروں گا۔ بلا جھجک تم سے بد مانگ لوں گا۔ اس وقت میں نے ایس ٹی ایف والوں کو بھی اس معاملے سے الگ تھلک رکھا ہوا ہے۔“

”جیسی تمہاری مرضی!“ اس کی آواز مضطرب سی تھی مگر میں نے اندازہ لگایا کہ وہ میرے جواب سے مطمئن ہو گیا تھا۔ شاید اسے یہ خلش ستا رہی تھی کہ میں آئی ٹی کی فیلڈ فورس کے مقابلے میں اول خان کے آدمیوں پر زیادہ اعتماد کرتا تھا۔ میری وضاحت نے اس کی وہ خلش دور کر دی تھی۔

ہمارے مذاکرات ختم ہو گئے۔ میں فون آف کر کے کیمپن سے باہر نکل آیا۔ اس وقت کاؤنٹر پر کئی گاہک موجود تھے اور جمائیکیری کے دونوں ملازم مستعد سیلز مین بنے، گاہکوں کے نئے اپنے ہاتھوں میں تھے، تیزی سے دوائیں نکالنے میں مصروف تھے۔ میں اطمینان سے جمائیکیری اوچی کرسی پر چڑھ کر بیٹھ گیا تاکہ گاہکوں سے رقوم وصول کر کے ان دونوں کا کام ہلکا کر سکوں۔

کرسی سنبھالنے کے بعد غیر ارادی طور پر میری نگاہیں دکان میں موجود گاہکوں کی طرف اٹھ گئیں۔ میں نے محسوس کیا کہ ان لوگوں میں موجود ایک کمرانی بہت غور سے میری طرف دیکھ رہا تھا مگر میرے متوجہ ہوتے ہی وہ سٹاک کاؤنٹر کے شیکس میں سرگرم ہو گیا۔ وہاں اس کی کھینچ میں مصروف

نتیجہ بہر حال سامنے آجانا تھا۔ میں نے زبردستی ہنس کر کہا ”اس وقت تم سیاسی زبان استعمال کر رہے ہو۔ یہ بات ایک سیاسی لیڈر لکھتا ہے کہ پاکستان کے ہر لکیشن میں انسان نہیں، فرشتے ووٹ ڈالتے ہیں۔“

”اور یہ فرشتے ایجنسیاں فراہم کرتی ہیں۔“ اس نے فقہر لگایا۔

”اور کہاں سے آئیں گے۔ ابھی تم نے خود ایس ٹی ایف والوں کو فرشتوں کا نام دیا ہے۔“

وہ ہنس پڑا ”تم بات پکڑ لیتے ہو۔ مجھ سے بات کرتے ہوئے الفاظ کو نظر انداز کر دیا کرو، مفہوم سمجھا کرو۔ یہ بتاؤ کہ اس وقت تم کہاں ہو۔“

میں ہنسی ہاتھ میں لیے ایک تالاب کے کنارے بیٹھا ہوا ہوں۔ پچھلی ڈور میں لگے کانٹے پر منہ مارے گی اور میں گھر لوٹ جاؤں گا۔

”میرا اندازہ ہے کہ تم اس وقت آئی مین کے شکار پر ہو سکتے ہو۔ کیا میرا اندازہ غلط ہے۔“

”اس وقت بساط پر ہمارے سامنے وہی ایک کلیدی مرہ رہ گیا ہے۔ تمہارے اندازے بہت کم غلط ثابت ہوتے ہیں۔“

”پھر تو تم جمائیکیری رہائش یا دکان کی نگرانی کر رہے ہو گے۔“ اس کی طرف سے بے ساختہ تبصرہ آیا۔

”میں نے تم سے کہا تھا کہ میں اپنے جگر کی دوست کو چارہ بنانا پسند نہیں کروں گا۔“ میں نے اسے یاد دلایا۔

”پھر تم کہاں ہو اور کیا کر رہے ہو؟“ اس کی آواز میں الجھن عود کر آئی۔

”میں گولڈن فارمسی پر جمائیکیری جگہ سنبھالے بیٹھا ہوں۔“

”اوہ!“ اس کی آواز میں ہلکی سی حیرت تیر رہی تھی ”اسے پہچانے کے لیے تم نے اسے پوری طرح کیو فلاج کر دیا۔“

”اے پورے معاملات کے سرپر کا پتا نہیں ہے۔ وہ بے خبری میں ہی طرح مارا جاتا۔“

”تمہارا کیا خیال ہے؟ وہ اسے اٹھانے کے لیے فارمسی پر چڑھائی کریں گے!“

”ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“ میں نے سوچتے ہوئے جواب دیا ”میرا وجد ان بتا رہا ہے کہ وہ جو کچھ بھی کریں، ان کا نشانہ جمائیکیری بجائے دکان بنے گی۔“

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ جمائیکیری سے پہلے اس کا نشانہ بن جائے۔“

ہو گیا۔

کے دوران اپنی زبان سے ایک لفظ ادا نہیں کیا تھا۔

اس سوال کے ساتھ میرے دل میں شدید خواہش ابھری کہ اسے بولنے پر مجبور کیا جائے۔ وہ خاموش کوشش کرتا تھا۔

”میرے پاس پانچ سو روپے کا کھلا نہیں ہے۔ کوئی چھوٹا نوٹ دے دو۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جمایا۔

یہ دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ میرے الفاظ پر اس کے چہرے پر کسی قسم کا تاثر نہیں ابھرا تھا۔ اس نے کسی بھی ایک مشتبی روٹ کی طرح اپنی پلکیں جھپکائیں پھر خفیف سی مسکراہٹ کے بعد اپنے دہانے اور بائیں کان کے قریب ہاتھ کے تیز اشارے کرنے لگا۔

وہ مجھے بتانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ گونگا اور برا تھا اس لیے میرا مفہوم سمجھنے اور اس کا جواب دینے سے قاصر تھا۔

میرے لیے اس کا وہ بہانہ قابل قبول نہیں تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ اس قبیل سے تعلق رکھنے والا ایک گونگا اور برا شخص اتنا زیادہ پڑھا لکھا نظر آئے۔

میں نے دوسرے گاہکوں کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی اپنی دواؤں کے انتظار میں دکان کے ملازموں کی طرف متوجہ تھے۔ میں نے اس کے ہاتھ سے پانچ سو روپے کا نوٹ لیتے ہوئے کاؤنٹر پر جھک کر دھیرے سے کہا ”تم آلو گے پچھے ہو!“

اس کے ہونٹوں پر شیم سی مسکراہٹ تیر گئی۔ وہ منہ سے کچھ نہیں بولا۔

میں نے بالکل آخری لمحے پر اپنا ارادہ بدل کر اسے اردو میں وہ نرم سی گالی دی تھی ورنہ میں نے سوچا تھا کہ اس سے انگریزی میں کوئی تلخ اور زہریلا فقرہ کہوں اور پھر اس کے چہرے کے تاثرات میں رونما ہونے والی تبدیلی دیکھوں۔

اس پر پہلی نگاہ پڑنے ہی میرے ذہن میں جان الیش کوف والے تجربے کا خیال آیا تھا۔ وہ اپنی دانست میں عبدالمجید یمنی کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک امریکی نیگرو کو مقامی لباس پہنا کر اپنے ساتھ لایا تھا اور بری طرح ناکامی سے دوچار ہوا تھا۔

اگر گولڈن فارمیسی کا وہ گاہک بھی مکرانی ہونے کے بجائے کوئی امریکی نیگرو تھا تو میری زبان سے انگریزی میں کوئی گالی سننے ہی سمجھ لیتا کہ اس کی چال بری طرح ناکام ہو چکی تھی اور میں نے اس کی صحیح قومیت پہچان لی تھی۔ وہ بدک کر اچانک کوئی بھی خطرناک حرکت کر سکتا تھا۔ اس زبانی مہم جولی کا سب سے بڑا نقصان یہ ہو تا کہ وہ ذرا ماطل پکڑنے کے بجائے اسی مرحلے پر ختم ہو جاتا اور آئی میں کے دیدار کی

وہ دراز قامت اور صحت مند آدمی تھا جو قمتض شلوار میں ملبوس تھا۔ ایک بات جو اسے بہت زیادہ ممتاز کر رہی تھی وہ اس کی آنکھوں پر لگی ہوئی عینک تھی۔ مینائی کی عینک کے ساتھ وہ کوئی سنجیدہ اسکار لگ رہا تھا۔

مکرانیوں کے لیے میں نے ہمیشہ اپنے دل کی گہرائیوں میں ایک عجیب سی محبت محسوس کی ہے۔ اپنی قدیم روایات کی امانت داری کرنے والے یہ لوگ بہت مخلص، سچے، محبت کرنے والے اور دلیر ہوتے ہیں لیکن معاشی مجبوریوں اور معاشرتی استحصال کی وجہ سے مایہ گیری اور دوسرے آبائی پیشوں سے جڑے رہنے پر مجبور ہیں۔ بحیرہ عرب کی ساحلی پٹی پر بسنے والوں کے لیے محرومیاں ایک مدت سے مقدر بنی ہوئی ہیں۔ ان کے دور افتادہ علاقوں میں اسکول ہیں نہ شفا خانے۔

پینے کا صاف پانی میسر ہے نہ گندے پانی کی نکاسی کا نظام۔ ایسے سفاک اور پُر آشوب ماحول میں بھی خال خال مکرانی لکھ پڑھ کر مختلف شعبوں میں ملک و قوم کی جان سوز خدمت کر رہے ہیں لیکن یہ افسوس ناک المیہ ہے کہ اس معاشرتی اکائی میں تعلیم کا اوسط اتنا کم ہے کہ سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ ان لوگوں میں بھی ایک طبقہ مراعات یافتہ ہے لیکن اس کی تعداد بہت قلیل ہے۔ وہ اپنے طور طریقوں کی وجہ سے دور سے پہچانا جاتا ہے۔ خواص سے قطع نظر، عوام میں ایسی صورتیں عقنا ہیں جن پر لکھی علم کی لکیریں دور سے پڑھی جا سکیں۔

وہ سیاہ فام مجھے عام مکرانیوں جیسا لگا نہ اس میں خواص والا شاہانہ کرد فر تھا۔ موچکوں سے بے نیاز سنجیدہ چہرے اور کشادہ پیشانی سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ غورو فکر کرنے کا عادی اور غالباً خاصا پڑھا لکھا تھا۔ اس پر میری نظر محض اس وجہ سے رکی تھی وہ بہت اشناک سے مجھے گھور رہا تھا۔ جوں ہی اس نے شوکیس سے نظریں ہٹائیں، میں اسی کی ترکیب استعمال کرتے ہوئے انجان بن گیا اور کیش بکس کا جائزہ لینے لگا۔

میر نے اس کی مطلوبہ دوا پہلے نکال دی اور اکیس روپے بتائے۔ وہ مکرانی دوا کا ڈبا کے کر میری طرف آیا اور ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ پانچ سو روپے کا نوٹ میری طرف بڑھا دیا۔ جب اس نے اپنی جیب سے وہ نوٹ نکالا تو میں نے واضح طور پر دیکھا کہ اس کی جیب میں سو روپے کے کئی نوٹ بھی موجود تھے۔ معاً میرے ذہن میں سوال ابھرا کہ وہ خاموش کوشش کیوں تھا۔ اس نے میرے مشاہدے

حسرت میرے دل میں رہ جاتی۔

اپنی جیتمانہ مسکراہٹ کے باوجود وہ صحیح صورت حال کا ادراک کرنے سے قاصر رہا۔ بس اس نے کھڑے کھڑے قدم بدلے ورنہ پر سکون رہا۔ میں نے دانستہ اکیس روپے کے بجائے پچیس روپے کاٹ کر بقیہ رقم اس کی طرف بڑھادی۔

اس نے اپنا اطمینان ظاہر کرنے کے لیے رقم گنی اور اپنی جیب میں ڈال لی۔ اس نے ایک بار بھی یہ ضرورت محسوس نہیں کی کہ دوا کے ڈبے پر چھپی ہوئی قیمت دیکھ کر مجھ سے مزید پیسوں کی واپسی کا مطالبہ کرے۔

اس کی حرکات سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کے لیے وہ دوائی تھی یا پھر اسے رقم کی کوئی پروا نہیں تھی۔

اس پر شبہ ہو جانے کے بعد میرے دل کی دھڑکنیں یک بیک تیز ہو چکی تھیں۔ میری دانستہ میں اس شکار کا ہانکا شروع ہو چکا تھا جس کے لیے میں تیار کیے بیٹھا تھا۔ میرے دل میں بہت شدت سے یہ خواہش ابھری کہ اس وقت میرے آس پاس کوئی مددگار موجود ہوتا تو میں اسے مشتہ سیاہ فام کا پیچھا کرنے پر لگا دیتا۔



میرے گولڈن فارمی پر بیٹھے کی بات سنتے ہی سلطان شاہ مضطرب ہو گیا تھا۔ اس کی ذاتی رائے تھی کہ میں آگ کے شعلوں سے پھیلنے کی نادانی کرنے جا رہا تھا مگر اس نے میرے تیور دیکھ لیے تھے۔ میری رہی کے خیال سے اس نے اپنی زبان بند رکھی اور دل ہی دل میں ان خطرات کا تذکرہ کرنے کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا جو مجھے اس مہم میں پیش آسکتے تھے۔

وہ میرے اس خیال سے متفق تھا کہ فارمی کے گرد زیادہ بھیڑ بھاڑ ہونے کی وجہ سے ہمارا دشمن قبل از وقت چوکنما ہو جائے گا اور ایسا کوئی وار کر گزرنے کا جس کا کوئی توڑ نہیں ہوگا۔ اسی کے ساتھ وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ میرا بالکل یکہ و تنہا ہونا بہت خطرناک اور وقت کے تقاضوں کے خلاف تھا۔

وہ صبح چار بجے تک جاگتا اور ہسٹری کرٹوشن بدلتا رہا۔ اس کے ذہن میں رہ رہ کر نئے دوسرے سرا بھار رہے تھے جن میں میری دردناک موت کا اندیشہ سب سے قوی تھا۔ آخر کار اس نے کسی کو اعتماد میں لیے بغیر، اپنے طور پر ایک فیصلہ کر لیا کہ وہ مجھ سے اپنے اختلاف رائے کا اظہار کر کے مجھے ناراض نہیں کرے گا لیکن مجھے بالکل بے یار و مددگار بھی نہیں چھوڑے گا۔ اس فیصلے پر پہنچنے کے بعد اس کی آنکھ لگ گئی۔

چند گھنٹوں کی نیند لینے کے بعد سلطان شاہ اس خوف آئی میں نے کسی امکانی خطرے سے اپنی گردن بچانے کے لیے جس سنک دلی سے نادر کو نیم گن کا نشانہ بنایا تھا اس کے پیش نظریہ قوی امکان تھا کہ وہ اپنی آزادی کے لیے اس بد نصیب سیاہ فام کو بھی ٹھکانے لگا دیتا جو اس کے دشمنوں کی نظروں میں آچکا تھا۔

ایک امکان یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ کوئی عام سیاہ فام نہیں بلکہ امریکی سیکرٹ سروس کا کوئی ایجنٹ ہو جو میری تلاش میں آئی میں کی معاونت کر رہا ہو۔ اگر یہ مفروضہ درست ہوتا تو

سے سات بجے بیدار ہو گیا کہ کہیں میں کسی سے کچھ کہے سے بغیر خاموشی سے جہانگیر کی طرف نہ چل دوں۔

اس نے اٹھ کر گھر کا جائزہ لیا، سب سو رہے تھے۔ وہ اپنی تیاری مکمل کر کے بستر پر دراز ہو گیا۔

میرے اور ویرا کے ساتھ بھرپور گفتگو کے دوران بھی اس نے کسی کو اپنے ارادے کی بھٹک نہیں لگنے دی۔ عربوں کی حمایت میں ویرا سے یوں جوش و خروش سے بحث کرتا رہا جیسے کہ ارض کی بقا کا رومدار ہی اس بحث کے نتیجے پر ہو۔

میں جہانگیر کے گھر جانے کا ارادہ کر کے ان لوگوں سے رخصت ہوا تو چند منٹ بعد سلطان شاہ نے بھی شہر کی کوچہ نوردی کا ارادہ ظاہر کیا اور گاڑی لے کر گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ اسے اندازہ تھا کہ جہانگیر کے گھر پر مجھے زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ اس سے کچھ دیر تک باتیں کرنے کے بعد مجھے آخر کار گولڈن فارمیسی کا رخ کرنا تھا جہاں مقابلے کی اصل بسات جانی تھی۔

اس نے مین روڈ سے ہٹ کر ایک ایسی گلی میں گاڑی پارک کی جہاں میری نظر نہیں پڑ سکتی تھی۔ وہ اس علاقے کی پُر ہجوم فٹ پاتھ پر راستہ بناتا ہوا گولڈن فارمیسی کے سامنے سے گزرا اور پھر اسی کے آس پاس منڈلانے لگا۔

کچھ دیر بعد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ قرینے کے لباس میں زیادہ دیر تک وہاں موجود رہا تو کسی نہ کسی کی نظروں میں آجائے گا۔ اس نے خاموشی سے سڑک عبور کی اور لی مارکیٹ کے سرکاری پیشاب خانوں کی طرف بڑھ گیا۔

وہ وہاں سے برآمد ہوا تو اس کے حلیے میں نمایاں تبدیلی آچکی تھی۔ سنورے ہوئے بال بے ترتیب اور آوارہ ہو چکے تھے۔ اس نے اپنی قمیص پتلون سے باہر نکال لی تھی۔ گریبان کے دو بٹن کھول کر قمیص کے کار کو اوپن کر کے انداز میں گردن سے پیچھے ڈھکا لیا تھا۔ چمکتے ہوئے جوتوں پر گرد اور میلے چونے کی تہ آچکی تھی۔

اپنے نئے گیٹ آپ کی ضروریات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس نے اپنی زندگی میں پہلی بار ایک پواڑی سے ہلکے تمباکو کا ایک پان خرید اور منہ میں دبایا۔

اپنی نئی ہیئت میں وہ اباش اور آوارہ گرد نوجوان نظر آ رہا تھا۔ وہ اپنی دانست میں خاصا وقت گزار کر آیا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر فارمیسی کے کاؤنٹر کے پیچھے نظرس دورائیں مگر میں وہاں نہیں پہنچا تھا۔

اچانک اسے ہلکے سے سرور کے ساتھ اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے زندگی میں کبھی پان نہیں کھایا تھا۔ اس وقت اپنی اداکاری میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے تمباکو

والا پان منہ میں دبا بیٹھا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ پان کی تہوں میں دبا ہوا تمباکو اس کا کچھ نہیں بگاڑے گا۔ مزید احتیاط کے طور پر اس نے گاہے گاہے منہ چلانے کا سلسلہ بھی متوقف کر دیا تھا۔ پان میں موجود اجزاء نے ترکیبی اس کے لعاب دہن میں دھیرے دھیرے خود ہی گھل رہے تھے۔

اس نے پان خوروں کو اکثر گھٹاؤنے انداز میں ہر جگہ پچکا ریاں مارتے دیکھا تھا اور ہمیشہ ان پر دل ہی دل میں ملامت کی تھی مگر اس وقت سلطان شاہ پر نظریہ ضرورت پوری شدت کے ساتھ آشکار ہو رہا تھا۔ نامطلوب سرور کی پہلی لہر کے حملہ آور ہوتے ہی اس نے اندازہ لگایا تھا کہ اس نے فوری طور پر اس مغلوبے سے نجات حاصل نہ کی جو دھیرے دھیرے اس کے دہانے میں جمع ہو رہا تھا تو وہ تیرا کر کہیں بھی ڈھیر ہو جائے گا پھر آئی مین اور اس کے آدمی اسے روند کر بھی گزر جاتے تو اسے جلدی ہوش نہ آتا۔

وہ ہولے ہولے لہراتا ہوا بجلی کے ایک کھمبے تک پہنچا اور اس سے ٹیک لگا کر سڑک پر پیک کی ایک لمبی سی پچکاری مار دی۔ اس حرکت سے اسے فوری طور پر افاق ہوا۔ ہر وقت اور ہر جگہ تھوکنے کی عادت سے احتیاج کی وجہ سے اس نے ٹرا سپورٹ لائن میں دن رات کام کرنے کے باوجود کبھی نسوار نہیں چکھی تھی۔ اس لمحے اسے اندازہ ہوا کہ تمباکو اور نسوار کھانے والے ناشائستگی کے ارتکاب پر کیوں مجبور ہوتے ہیں۔

تمباکو والا پان اس کے لیے ایک بہانہ بن گیا۔ اس سے پیدا ہونے والی مجبوری کے نتیجے میں وہ جس کھمبے سے ٹکا تھا وہ اس کے لیے بہت موزوں تھا۔ وہاں کھڑے کھڑے اس نے ایک دراز قامت، صحت مند اور معنک سیاہ فام کو تیسری مرتبہ فٹ پاتھ سے گزرتے ہوئے، گولڈن فارمیسی میں جھانکتے دیکھا تو چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کا خیال تھا کہ اس سے پہلے اس نے مشتبہ آدمی کو مخالف سمت سے آتے دیکھا تھا۔

اس نے اپنی جگہ نہیں چھوڑی۔ کھمبے سے ٹیک لگائے، دھیرے دھیرے جھک کر آ رہا۔ پے در پے پیک کی کئی پچکاریاں اگلنے کے بعد اسے اطمینان ہو گیا تھا کہ اس کے دہانے میں جو کچھ باقی رہ گیا تھا اس میں تمباکو کا جو ہر خاص نہ ہونے کے برابر تھا۔

اس معنک اور مذہب سیاہ فام نے اس کے بہن میں بالکل سی بچادی تھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ جو تھیں بار گولڈن فارمیسی کے سامنے سے گزرتا ہوا نظر آیا تو وہ ضرور اس کے پیچھے جائے گا تاکہ اس کی حقیقت اور عزائم کے

بارے میں کچھ جان سکے۔
 مقصد کے تحت گولڈن فارمیسی کے گرو منڈلا رہا تھا۔ وہ اپنا

مقصد حاصل کے بغیر وہاں سے نہیں جاسکتا تھا۔

آپس میں ہونے والی گفتگو کا ایک ایک لفظ اس کے ذہن میں محفوظ تھا۔ اسے یاد تھا کہ ویرا نے پچھلی رات پہلی بار جمانگیر کی ذات کو درپیش خطرے کی نشان دہی کر کے مجھے بے چین کر دیا تھا۔ اس نے سمجھ لیا کہ وہ کالا جمانگیر کی آمد کا منتظر تھا۔ یہ اس کے مقدر کی خرابی تھی کہ میں جمانگیر کو اس کے گھر چھوڑ کر ادھر آ رہا تھا۔

سلطان شاہ نے واپسی کے لیے کالے والی حماقت نہیں کی بلکہ سڑک پار کر کے فٹ پاتھ بدل لی۔

متعدد ٹھیلوں پر مشتمل ایک بازار کے قریب سے گزرتے ہوئے اس کی نظر فیصوں کے پھیلے پر پڑی۔ وہاں لندا بازار کی پرانی مگر صاف ستھری قبیسیں بیس بیس روپے میں یک رہی تھیں۔ اس نے اپنی نیلے رنگ کی چار خانوں والی قبیس پر نگاہ ڈالی اور سوچ میں پڑ گیا۔

حالات بتا رہے تھے کہ سورج ڈھلنے سے پہلے اس کالے سے ایک مرتبہ پھر سامنا ہونا ناگزیر تھا۔ سلطان شاہ کا زور دار کدسا لھانے کے بعد وہ اس کی صورت دیکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا لیکن اس کی مخصوص قمیص کو آسانی سے پہچان سکتا تھا۔ اس نے بس چند ثانیوں کے لیے سوچا اور پھر اس ٹھیلے کی طرف بڑھ گیا۔

اس نے پھیلے سے اسے لیے نصف آستینوں والی ایک سفید بش شرٹ خریدی اور لوگوں کی موجودگی کی پروا کیے بغیر اپنی قمیص کی جیب خالی کر کے اسے اتارا اور سفید بش شرٹ پہن لی۔ ٹھیلے والا اس کی مروا لگی اور ہمت کے قصیدے پڑھنے لگا۔ اس نے قیمت ادا کر کے اتاری ہوئی قمیص ٹھیلی میں ڈالی اور وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ اس ریڈی میڈ تبدیلی کے بعد اسے پورا یقین ہو گیا تھا کہ دوبارہ سامنا ہونے پر وہ صورت حرام امریکی آسانی سے اسے نہیں پہچان سکے گا۔

واپسی پر کافی دیر تک وہ کالا اسے نظر نہیں آیا۔ اس دوران میں، میں فارمیسی پر پہنچ چکا تھا۔ مجھے دیکھ کر سلطان شاہ کی جان میں جان آئی۔ اسے یہ اندازہ نہیں ہوا کہ وہ کالا مجھے دیکھ لینے کے بعد وہاں سے غائب ہوا تھا یا اس سے پہلے ہی کہیں رو پھوکر ہو گیا تھا۔

ایک طرف سلطان شاہ مجھے اس کے بارے میں ہوشیار کرنے کے لیے بے چین تھا۔ دوسری طرف اسے یہ اندیشہ تھا کہ کالا کسی بھی لمحے نمودار ہو جائے گا۔ وہ سلطان شاہ کو فارمیسی میں موجود یا آتے جاتے دیکھ لیتا تو کھیل بگڑ سکتا تھا۔ کالا اسے ٹھکانے والے کی حیثیت سے پہچانتا یا نہ پہچانتا، یہ

اسے زیادہ دیر تک انتظار نہیں کرنا پڑا۔ بھڑ میں سب سے اوپر تیرتا ہوا، سیاہ فام کا چہرہ اسی سمت سے نمودار ہوا تھا جدھر وہ آخری بار غائب ہوا تھا۔ شاید وہ دو چار سو گز کے فاصلے میں وہیں منڈلا تا پھر رہا تھا۔ اس بار بھی شفاف عدسوں کے پیچھے چمکتی ہوئی سیاہ آنکھیں فارمیسی کی طرف نگہراں تھیں۔

سیاہ فام کے قریب سے گزرتے ہوئے سلطان شاہ نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کالے سے اڑنے کے لیے کیا راہ اختیار کی جائے۔ اس وقت تک وہ اسے کوئی مقامی سمجھ رہا تھا مگر اسے یہ یقین ہو چلا تھا کہ وہ ان ہی لوگوں کے لیے کام کر رہا تھا جن کی تلاش میں، میں اپنا گھر چھوڑ کر گولڈن فارمیسی کی راہ اختیار کرنے پر مجبور ہوا تھا۔

سلطان شاہ کو فوری طور پر اور کوئی راہ نہ سوجھی تو اس نے یکایک اپنی رفتار بڑھا دی اور اس کالے کے قریب سے گزرتے ہوئے اسے اس زور سے شانہ مارا کہ وہ لڑکھڑاکر گرتے گرتے رہ گیا۔

”اوع... یوسن آف اسے بچ!“ خالص امریکی لب و لہجے میں ایک دہلی دہلی بے ساختہ غراہٹ اس کے کانوں میں آئی مگر وہ مڑ کر دیکھنے بغیر، اسی رفتار سے آگے بڑھتا چلا گیا۔ اس کے بدن میں سنسنی کی لہریں سراپت کر گئیں، جسے وہ ایک مقامی نمرانی سمجھ رہا تھا وہ امریکی کالا اٹکا تھا۔ اس کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ اس نے رکنے یا مڑنے کی حماقت نہیں کی تھی مگر کالے کی کسی متوقع جارحیت کا مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔

ترقی یافتہ ملکوں کے شہری تیسری دنیا کے کسی پس ماندہ ملک کا رخ کرتے ہیں تو چھوٹی بڑی بد تمیز یوں کا سامنا کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہوتے ہیں۔ کسی بد مزگی میں الجھ کر اپنی راہ کھوئی نہیں گرتے۔ وہ کالا بس اپنی مادری زبان میں... جڑوا تارہ گیا۔ اس نے سلطان شاہ کو عملی طور پر کوئی سبق دینے کی کوشش نہیں کی۔

سلطان شاہ اپنی کامیابی پر نازاں تھا۔ اس کالے کا غیر ملکی بلکہ امریکی ہونا اس امر کی دلیل تھا کہ وہ ڈینی کے خون کے پیاسوں کا سانس بھی تھا۔ سلطان شاہ کا دماغ بادلوں سے بھی اوپر اڑ رہا تھا اور قدموں میں مزید تیزی آگئی تھی۔

بہت دور نکل آنے کے بعد اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا اور وہ رک کر پلٹ پڑا۔ اسے یقین تھا کہ دور نکل آنے کے باوجود اس نے کالے کو نہیں کھویا ہوگا۔ وہ کسی خاص

اسے کس نے گرایا ہو گا۔ وہ حیرت ناک سرعت سے فٹ ہاتھ سے اٹھا اور کسی پیشہ ور یا کسری طرح کے تان کر سلطان شاہ پر ٹوٹ پڑا۔

اسے اپنے حریف سے اتنی پھرتی کی توقع نہیں تھی۔ بائیں جڑے پر ایک زوردار گھونسا کھا کر اس پر چودہ طبق روشن ہو گئے اور وہ لڑکھڑاتا ہوا دور چلا گیا۔ کالا دوبارہ اس پر جھپٹا تو اس نے دائینی لات اس کے پیٹ کے نچلے حصے میں رسید کی۔ کالا ذہنت سے بلبلاتا ہوا دہرا ہو گیا۔

سلطان شاہ نے بڑھ کر اسے لاتوں اور گھونسوں پر رکھ لیا۔ وہ صحت مند ہی نہیں، سخت جان بھی تھا۔ خود کو سنبھالنے تک سکون سے مار کھاتا رہا۔ سلطان شاہ نے اس کے چہرے پر کئی جگہ سے خون نکال دیا تھا پھر وہ کسی کمانڈو کی طرح تیزی سے حرکت میں آیا۔ اس کے دونوں ہاتھ چل پڑے تھے۔ سلطان شاہ اس کے تابڑ توڑ حملوں سے بوکھلا گیا۔

وہ واقعہ فارمیسی سے کافی فاصلے پر پیش آیا تھا اس لیے دکان میں کسی کو پتا نہیں چل سکا کہ تھوڑی دور کیا تماشا ہو رہا تھا۔ ان دونوں کے گرد تماشا یوں کی بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔ سب مبہوت ہو کر یوں وہ خونی مقابلہ دیکھ رہے تھے جیسے پیسے دے کر وہاں آئے ہوں۔ کسی نے دخل انداز ہونے یا انہیں الگ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

”پکڑ لو اسے۔ یہ خطرناک بد معاش ہے۔“ بازی ہاتھ سے نکلنے دیکھ کر سلطان شاہ نے لوگوں کو اکسایا۔ اس کے پہلے فقرے پر مجمع میں کہیں کہیں تحریک سی ہوئی تھی لیکن کالے کی بد معاشی کا اعلان سنتے ہی سب کے حوصلے دم توڑ گئے۔

”اڑے مارو سالے کو۔ یہ شیدی نامیں اے!“ ایک نوجوان کو طراہ آیا اور اس کے ساتھ کئی تندرست آدمی کالے کی طرف لپکے۔

کالے کے لیے وہ تبدیلی تباہ کن تھی۔ وہ بہت ہوش مندی سے لڑ رہا تھا۔ اس نے بجلی کی سی سرعت سے اپنی جیب سے اپنا ہتھیار نکال لیا۔

اس کے ہاتھ میں بیم گن دیکھتے ہی سلطان شاہ کے فرشتے کوچ کر گئے۔ پہلے نوزل والی بیم گن کو وہ ہزاروں ہتھیاروں میں دور سے پہچان سکتا تھا۔

اس وقت کالے کے لیے سلطان شاہ کمزور حریف تھا۔ اسے اصل خطرہ ان تماشا یوں کی طرف سے تھا جو مشتعل ہو کر اس پر حملہ آور ہونے والے تھے۔

”رک جاؤ!“ وہ بیم گن کی نال لہرا کر حلق کے بل انگریزی میں دہاڑا ”ورنہ سب کو جلا کر رکھ کر دوں گا۔“ اس کی جان پر بن آئی تھی۔ اس نے اپنی دھمکی کے

زورور سمجھ لیتا کہ وہ میرا سا مٹھی ہے۔

سلطان شاہ سخت تذبذب کے عالم میں کافی دیر تک فارمیسی کے آس پاس گھومتا رہا۔ قہیں تبدیل کرنے کے بعد اس نے دوبارہ بجلی کے گھمے کا سہارا نہیں لیا تھا۔ اسی دوران میں کالا اپنے ہاتھ میں ایک پرچا لیے نمودار ہوا اور بے ہوش فارمیسی میں داخل ہو گیا۔

پتا نہیں وہ کیا منصوبہ لے کر وہاں پہنچا تھا۔ اس وقت تک کہیں میں تھا۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ میں اس کی واپسی سے پہلے کہیں سے باہر نکل آتا۔ سلطان شاہ کو یقین ہو گیا کہ وہ کالا دکان میں میری موجودگی سے باخبر ہو چکا تھا اور صرف یہ ہتھ لینے کے لیے اندر گیا تھا کہ میرے اغوا کی واردات کی نفاذیابی کے کیا امکانات تھے۔

یہ ایک اتفاق تھا کہ میں امریکی سیاہ فام کی واپسی سے پہلے کاؤنٹر پر آگیا اور میری چھٹی حس نے مجھے اس کی طرف سے خبردار کر دیا۔

مجھ سے بقایا رقم لینے کے بعد وہ برا سرا امریکی گولڈن فارمیسی سے باہر نکلا تو سلطان شاہ نے اپنی کہیں گاہ چھوڑ دی۔ اس نے کالے کا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔ کالے کے انداز میں ذرا بھی غلط یا گھبراہٹ نہیں تھی۔ دوسری طرف سلطان شاہ کا خون کھول رہا تھا کہ اس کا ایک دشمن اس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر دیدہ دلیری سے واپس جا رہا تھا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ وہ کالا جسمانی طور پر اس سے کم تر نہیں تو برتر بھی نہیں تھا۔ دست بدست مقابلہ ہوتا تو برابر لی لڑائی ہوتی۔ کالا ایسے کسی ٹکراؤ کے لیے تیار نہیں تھا۔ سلطان شاہ سر سے پیر تک آتش فشاں بنا ہوا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ کالے کو بری طرح لہو لہان کر دے گا۔

سوچتے سوچتے اس کا ذہن ماؤف ہونے لگا۔ اس نے چاکر ممکنہ نتائج پر زیادہ غور کر کے وہ اپنی مراد انگی کو پٹا لگا رہا تھا۔ وہ کسی وحشی سانڈ کی طرح، لوگوں کو چیر کر اپنا راستہ بناتا ہوا آگے بڑھا اور پیچھے سے اڑنگ لگا کر کالے کو پُر شور آواز سے فٹ ہاتھ پر گر دیا۔

کالے کے جسم کے گرنے کا دھماکا بہت زوردار تھا۔ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلنے والی بدلیسی مغلفات کا طوفان بھی کم نہیں تھا۔ وہ سلطان شاہ کو لیرا اور جیب کترا قرار دے رہا تھا۔

سلطان شاہ کو اپنی ابتدائی فتح مندی کا پوری طرح ادراک کرنے کا موقع نہیں ملا۔ قرب وجوار کے لوگ اس واقعے پر اتنی تیزی سے سٹے تھے کہ درمیان میں بس وہی دونوں رہ گئے تھے۔ کالے کے لیے یہ سمجھنا دشوار نہیں تھا کہ

دروازے پر ٹیپ سے ایک ٹوٹا ہوا آئینہ چپکایا ہوا تھا۔ سلطان شاہ کو اس میں اپنے چہرے کا عکس دیکھ کر صدمہ ہوا۔ اس کو اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ کالے نے اسے اتنی بے رحمی سے مارا ہوگا۔

اس نے سفید بٹن شرت کی آستین پانی میں تر کر کے اپنے زخم صاف کرنے شروع کر دیے تاکہ باہر نکلنے کے قابل ہو سکے۔

اس وقت اس کے سامنے دو راستے تھے۔ باہر نکل کر اپنی گاڑی تک پہنچنے کی کوشش کرنے کے بجائے کوئی بھی سواری پکڑنے اور سیدھا گھر لوٹ جائے یا اسے گڑے ہوئے چہرے کو لوگوں سے بچاتے ہوئے مجھ تک پہنچنے کی کوشش کرے۔

اس کے لیے دو سری راہ پسندیدہ تھی لیکن مشکل یہ تھی کہ راستے میں پولیس سے سامنا ہو جاتا تو وہ ایک نئی آفت میں گرفتار ہو سکتا تھا۔

گولڈن فارمی میں اور اس کے آس پاس جو کچھ ہوا وہ اس قدر لرزہ خیز اور ناقابل یقین تھا کہ اس کا میرے علم میں آنا ضروری تھا۔ ایک سیاہ فام امریکی کا مقامی لباس میں مجھ تک پہنچنا اور پھر سرعام نیم گن استعمال کرنا معمولی واقعات نہیں تھے۔ شی میں نیم گنز صرف آئی مین کے رتبے پر فائز لوگوں کو دی جاتی تھیں۔ سیاہ فام کے نیم گن چلانے سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ وہی شی کا کیا آئی مین تھا جو میرے خلاف فٹ ٹھونک کر کراچی کے میدان میں اترتا تھا۔

سلطان شاہ اپنے زخموں کی صفائی اور قیص کی تبدیلی کے بعد بیت الخلاء والے ہال سے باہر نکلا تو کسی نے اس پر دھیان نہیں دیا۔ ہر طرف خوف و ہراس اور سنسنی کا راز تھا۔ سامنے والی فٹ پاتھ پر سناٹا ہو چکا تھا۔ جائے واردات کے قریب واقع تمام دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ ٹھیلوں اور پتھاروں والے اپنا سارا سازو سامان جوں کا توں چھوڑ کر کہیں بھاگ چکے تھے۔ سڑک کے اس پار پولیس والوں کی وردیاں اور ٹوئیاں ہی ٹوپیاں نظر آ رہی تھیں جن میں رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ واردات اتنی سنگین تھی کہ شاید ملاتے کے ذمے وارڈن نے وائرلیس پر رابطہ کر کے دوسرے علاقوں سے بھی کمک طلب کر لی تھی۔

پولیس والوں کی بوکھلائی ہوئی بھیڑ میں سلطان شاہ یہ نہیں دیکھ سکا کہ امریکی کالے کی ہیکر گن کا شکار ہونے والے کا کیا حال تھا۔ وہ ضابطے کی کارروائیوں کے انتظار میں فٹ پاتھ پر ہی بڑا ہوا تھا، انسانی ہمدردی کی بنیاد پر اسے اسپتال لے جایا جا چکا تھا۔ اس بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔

نتیجہ کا انتظار کیے بغیر نیم گن کا ٹریگر دبا دیا۔ لیور شعاعوں کی زمیں اگر ایک شخص کا بایاں بازو کوٹ کر نیچے گر گیا۔ وہ ایک آن ہونا اور ناقابل یقین واقعہ تھا۔ تماشاخیوں میں بھگدڑ مچ گئی اور وہ شور مچاتے ہوئے بھاگ نکلے۔ کسی کو اپنا ہوش نہیں تھا۔ جدھر جس کے سینک سمائے وہ اسی طرف ہولیا۔

کالا بھی وہاں نہیں رکا۔ تماشاخیوں کے پیر اکھاڑتے ہی اس نے بھی ایک طرف دوڑ لگا دی۔

سلطان شاہ نے مجروح آنکھوں سے اس بے گناہ کو دیکھا جو کالے کے ہاتھوں اپنے پائیں بازو سے مجروح ہو چکا تھا اور اس وقت فٹ پاتھ پر بری طرح چبچ کر تڑپ رہا تھا۔ واردات مکمل ہو چکی تھی۔ اصل جرم متوقع سے فرار ہو گیا تھا۔ وہ گنجان کاروباری علاقہ تھا۔ کسی بھی لمبے پولیس کی نفری وارد ہو سکتی تھی۔ اس وقت وہ واردات کا اکلوتا فریق تھا۔ گلو خلاصی کی نوبت آنے سے پہلے پولیس والے اس کا حشر خراب کر سکتے تھے۔ وہاں سے نکل جانا ہی اس کے حق میں بہتر تھا۔

اس نے فٹ پاتھ پر گری ہوئی چار خانے والی قیص کی تبدیلی اٹھائی اور سڑک پر دوڑنا چلا گیا۔

بھگدڑ کے نتیجے میں پیدا ہونے والا، تماشاخیوں کا ایک ریلا گولڈن فارمی کے سامنے سے بھی گزرا۔ دونوں ملازموں نے لوگوں سے پوچھنا چاہا لیکن ہر ایک پر موت کی سی گھبراہٹ طاری تھی۔ کسی کو رک کر جواب دینے کا ہوش نہیں تھا۔ اس بھیڑ میں بہت سے لوگ ایسے تھے جن کو اصل واقعے کی ہوا بھی نہیں لگی تھی۔ بس انہوں نے دوسروں کی دیکھا دیکھی سرب پر پیر رکھ کر بھاگنا شروع کر دیا۔

اس وقت ہمیں صرف اتنا پتا چل سکا کہ آس پاس کوئی خطرناک جھگڑا ہو گیا تھا۔ دکان داروں نے جزی کے ساتھ شٹر گرانے شروع کر دیے تھے۔

ادھر سلطان شاہ دوبارہ ایک سرکاری بیت الخلاء میں جا گھسا تھا اور اپنے متورم چہرے کو سہلارہا تھا۔ وہ اس کو ٹھنڈی کے استعمال کی سرکاری فیس پیشگی ادا کر کے اندر داخل ہوا تھا اس لیے اندر دھندلا سا اجالا پھیلا ہوا تھا جو مشترکہ چھت پر لگے ہوئے اکلوتے بلب کا مہون منت تھا۔

سلطان شاہ نے متعفن باتھ روم کا بولٹ چڑھا کر اپنا جائزہ لیا تو سفید بٹن شرت پر نازہ خون کے کئی دھبے آچکے تھے۔ اس نے وہ بٹن شرت وہیں اتار دی اور اپنی چار خانے والی قیص دوبارہ پہن لی۔

کسی شوقین مزاج جمعدار نے اس باتھ روم میں

ہوئے تو ایک شخص جھک کر اندر آتا ہوا نظر آیا۔ وہ دکان میں داخل ہو کر سیدھا کھڑا ہوا تو میں پہلی نظر میں اسے نہیں پہچان سکا۔ اس کا چہرہ جا بجا نیلا ہو رہا تھا۔ دانتے رخسار کی ہڈی پر جلد چھنی ہوئی تھی۔ اسی آنکھ کے نیچے گہرائیل پڑا ہوا تھا۔ سیدھا ہوتے ہی وہ تیر کی طرح میری طرف آیا تو میں بھونچکا رہ گیا۔

میں اسے گھر پر چھوڑ کر آیا تھا۔ مجھے شدید حیرت ہوئی کہ وہ اس وہاں کیسے آگیا تھا اور کس حال میں تھا۔

”یہ کیا ہوا؟ تم کس سے لڑ کر آرہے ہو؟“ میں نے بے اختیار اس کے دونوں شانے تھام کر پوچھا۔

میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس کی نظریں دونوں ملازمین کی طرف اٹھ گئیں جو ایک گڑھے ہوئے ابھیں چہرے کو بے اعتباری سے تنک رہے تھے۔

میں نے اسے کاؤنٹر کے پیچھے بلایا اور اپنے ساتھ لے کر کیبن میں چلا گیا۔

تخلیہ میسر آنے پر اس نے میرے سوال کا انتظار کیے بغیر بولنا شروع کر دیا ”میں عینک والے کالے امریکی سے ٹکرا گیا۔ وہ کمانڈو نہیں تو اچھا پاکس ضرور ہے۔ میں نے بھی اس کی خاصی مرمت کی لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ وہ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔“

”تم کس امریکی کی بات کر رہے ہو؟ یہاں سے نکلنے والا کالیا تو گونگا اور بہرا مقامی تھا۔“

سلطان شاہ کے پھولے ہونٹوں پر ہلکی سی استہزائیہ مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ دھیرے سے بولا ”اس نے تمہارے سامنے اداکاری کی ہوگی۔ مجھ سے لڑتے ہوئے وہ بہت روانی سے انگریزی میں گالیاں بک رہا تھا۔“

”مگر یہ سب ہوا کیسے!“ میں نے اسے دوبار پر بٹھاتے ہوئے تھیرزدہ لہجے میں پوچھا ”اس وقت تم یہاں کیا کر رہے تھے؟“

”رات کو تم نے اکیلے ہی شہر کی کھار میں گھسنے کا ارادہ کیا تھا۔ میں تمہارے اس فیصلے سے مطمئن نہیں تھا۔“ اس نے صوفے پر نیم دراز ہو کر اپنی کہانی شروع کر دی۔

وہ ہم دونوں کی ذہنی ہم آہنگی کی ایک انوکھی مثال تھی۔ ادھر میں دکان میں خود کو تنہا اور پراسرار کالے کے مقابلے میں بے بس محسوس کر کے بیچتا رہا تھا اور ادھر سلطان شاہ میری بے خبری میں اس کی خبر لینے کے لیے اپنے مورچے میں موجود تھا۔

اگر سلطان شاہ نے اس شخص کو گھیرنے کی ناکام کوشش نہ کی ہوتی تو میں اس کے بارے میں مسلسل تذبذب میں مبتلا

گونڈن فارمیسی کی سمت والی پوری فٹ پاتھ دور دور تک ویران ہو چکی تھی۔ کسی کسی بلڈنگ کے زینوں میں دو چار افراد کھڑے ہوئے نظر آرہے تھے لیکن سڑک کی دوسری جانب بھیڑ میں بندرتج اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ہر شخص کی شمس آمیز نظریں سڑک کے پار جھی ہوئی تھیں۔ اس بھیڑ بھار اور افرا تفری کی وجہ سے وہاں سے گزرنے والے ٹریفک کی رفتار بہت سست ہو گئی تھی۔ ٹریفک کے اکاؤنٹ سپاہی اسے کنٹرول کرنے میں ناکام ہو چکے تھے۔

وہ ماحول سلطان شاہ کے لیے سازگار تھا۔ کسی کو اتنا ہوش نہیں تھا کہ وہ اس کے چہرے کے تازہ زخموں پر دھیان دیتا۔ وہ سڑک عبور کیے بغیر بھیڑ میں اپنا راستہ بناتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔

اس نے یہ بھانپ لیا تھا کہ گونڈن فارمیسی وہاں سے دور ہونے کی وجہ سے زیادہ افرا تفری کی زد میں نہیں آئی تھی۔ پولیس والوں نے بھی اتنی دور تک پھیلنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ اسی سمت میں چلا ہو گا گونڈن فارمیسی کے سامنے پہنچے گا اور موقع پا کر تیزی سے سڑک پار کر کے جمائیک کی دکان میں پہنچ جائے گا۔ اسے پورا اطمینان تھا کہ ایک بار اس پناہ گاہ میں پہنچ جانے کے بعد وہ ہر خطرے سے محفوظ ہو جائے گا۔



بھگدڑ اور افرا تفری سے ہم تینوں کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اسی علاقے میں کوئی بڑی واردات ہو گئی ہے۔ یہ پتا نہیں چل سکا تھا کہ واردات کی نوعیت کیا تھی۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ کسی کو قتل کر دیا گیا تھا یا ڈکیتی ہوئی تھی۔

دوسرے دکان داروں کے ساتھ ساتھ منبر نے پہلے بولالا کر دکان کا پورا شٹر گرا دیا تھا اور خود ہر جم کر کھڑا ہو گیا تھا۔ میں دوسرے ملازم کے ساتھ دکان میں محسوس تھا۔ کچھ دیر تک جائزہ لینے کے بعد اس نے آدھا شٹر اٹھایا اور اندر

میرے لیے دکان کے کیبن میں گھسے رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ میرا ذہن مسلسل اس کوئلے اور بھرے کالے میں الجھا ہوا تھا جو دکان میں آیا اور پراسرار انداز میں ایک دوا خرید کر لے گیا۔ اس وقت تک میرے ذہن کے کسی بعید ترین گوشے میں بھی یہ خیال نہیں تھا کہ اس علاقے میں ہونے والی گڑبگ اس کی ذات سے کوئی تعلق رہا ہوگا۔

ہم تینوں ایک ساتھ کھڑے ہو کر اس واقعے کے بارے میں اپنی اپنی سباط کے مطابق قیاس آرائیاں کر رہے تھے کہ اچانک آہنی شٹر دھڑ دھڑایا۔ ہم تینوں چونک کر ادھر متوجہ

رہتا۔ مجھے اس کے گونگے اور بہرے پن پر شدید حیرت ضرور ہوئی تھی مگر میں یہ اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ وہ جان ایش کوف کے ساتھی کی طرح امر کی نژاد ہوگا۔

میں نے آئی مین کے بارے میں ایک فیصلے پر پہنچنے کے بعد گولڈن فارمیسی سنبھالنے میں جتنی تیزی دکھائی تھی، آئی مین نے اس سے زیادہ پھرتی سے کام لے کر مجھے حیران کر دیا تھا۔

”اب تمہارا یہاں بیٹھنا مندوش ہو چکا ہے۔“ اس نے اپنی کمائی سنانے کے بعد پُر تشویش لہجے میں کہا۔

”یہ بعد کی باتیں ہیں۔ پہلے اپنی مرہم پی کی فکر کرو۔“ میں نے بے پروائی سے جواب دیا۔

میں نے منیر کو آواز دے کر بلایا تو وہ اندازہ لگا چکا تھا کہ زخمی اجنبی میرا قریبی دوست تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اندرونی ضربات اور بیرونی زخموں کے علاج کے لیے کون سی دوائیں زیادہ کارگر ثابت ہو سکتی ہیں۔

منیر نے میری مدد سے ذرا سی دیر میں سلطان شاہ کی چونوں پر دوائیں لگائیں اور پھر میرے اشارے پر باہر چلا گیا۔

”جو کچھ ہونا تھا ہو گیا۔ اب تمہارا یہاں بیٹھنا غیر ضروری ہے۔ گاڑی لگی میں موجود ہے۔ خاموشی سے یہاں سے نکل چلو۔“ منیر کے چلے جانے کے بعد سلطان شاہ نے

مجھے زور لہجے میں مشورہ دیا ”ہم وہاں مل بیٹھ کر کرنی راہ کا تعین کر سکیں گے۔“

”چھین چھڑاؤ کا سلسلہ چل نکلا ہے تو اب مجھے یہاں موجود رہنا ہوگا۔ کچھ پتا نہیں کہ کب حالات کیا رخ اختیار کر لیں۔“ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”آج کے تصادم کے بعد یہ امکان نہیں ہے کہ وہ پلٹ کر دوبارہ ادھر آئے۔“

”یہ تمہاری رائے ہو سکتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ ان دونوں واقعات کو یک جا کر کے نہیں سوچ سکے گا۔“

”دونوں واقعات ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں۔ وہ گولڈن فارمیسی میں قدم رکھتا ہے اس کے پیچھے جاتا۔“

”یہ تمہاری سوچ ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ وہ کیا سوچ رہا ہوگا۔“

”فارمیسی سے نکلے ہی مجھ سے ٹکراؤ کو وہ اتفاق قرار نہیں دے گا۔“ سلطان شاہ نے اصرار کیا۔

”تم کچھ بھول رہے ہو۔“ میں نے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا ”اسے یہ پتا نہیں چل سکا ہوگا کہ وہ میری بلکہ

فارمیسی کے مالک کی آمد کے انتظار میں آس پاس منڈلا رہا تھا تو تم نے اس کی حرکتیں نوٹ کر لی تھیں۔ وہ اپنی دانست میں

دامن بچا کر دکان کی گمرانی کرتا رہا اور میرے آنے کے بعد اندر گھس آیا۔ اس نے ایک دوا خریدی، اپنے گونگے اور بہرے ہونے کا بہانہ کیا اور پیسے ادا کر کے واپس لوٹ گیا۔ اس کے کام کا یہ حصہ بالکل شفاف تھا۔ وہ تمہاری ذات کو اپنی اس کارروائی سے نہیں ملا سکتا۔“

”تمہارے ذہن میں اس کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہوگا۔“ سلطان شاہ نے اپنی نگاہیں میرے چہرے پر مرکوز کر دیں۔

”میرے ذہن میں کچھ بھی نہیں ہے۔ تم نے خود بتایا کہ سنبھلنے کے بعد اس نے تمہیں لیرا اور جبب کترا قرار دیا تھا۔“

سلطان شاہ کی آنکھوں میں حیرت تیرنے لگی ”تمہارا خیال ہے کہ وہ سچ بول رہا تھا۔“

”مجھے اور اضطراب کی حالت میں بڑے سے بڑا اداکار بھی سچ بولتا ہے جو کچھ اس کے ذہن میں آیا، اس نے بے ساختہ کہہ ڈالا۔“

”حیرت ہے۔ ایک بات میں نے تمہیں خود ہی بتائی اور وہ میرے دماغ سے نکل گئی مگر تم اسے نہیں بھولے۔“

”یہ بھولنے والی بات ہی نہیں تھی۔ صحیح فیصلے پر پہنچنے کے لیے حاضر دماغی بہت ضروری ہوتی ہے۔“

”شاید تمہارا فارمولا درست ہے۔“ اس نے سوچتے ہوئے کہا ”وہ سمجھا ہوگا کہ میں اس کو بھروسہ کر کے اس کی جیبیں خالی کرانا چاہتا ہوں۔ وہ فٹ پاتھ سے اٹھا اور غصے میں مجھ پر ٹوٹ پڑا۔“

”اگر تم باقاعدہ اس کا مقابلہ کرنے پر نہ قائل ہو تو شاید وہ تم کو دو چار ہاتھ مار کر اپنی راہ بولیتا۔“

”بالکل یہی ہوا ہے۔“ سلطان شاہ نے اعتراض کیا ”اپنے پہلے حملے میں اس کے تیور بہت اچھے ڈھالے تھے اسی لیے میں اس کی حرمت کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ میرے ہاتھوں سے پٹنے کے بعد اس نے خطرناک تیوروں کے ساتھ سنبھال لیا اور میرے اوسان خطا کر دیے۔“

”اس کے حساب سے ساری گزربوہ ہوئی کہ تمہارا اور اس کا جھگڑا طویل پکڑ گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تماشائی تمہاری حمایت میں اسے مارنے پر کمر بستہ ہو گئے۔“

”اس جھگڑے کا اہم ترین موڑ یہی تھا۔“ سلطان شاہ بول پڑا ”وہ نوبت نہ آئی تو وہ ہم گن نہ نکالتا۔ یہ پتا چلنا مشکل ہو جاتا کہ وہ آئی مین تھا یا اس کا آدمی۔“

سلطان شاہ کی اس دلیل میں خاماوازن تھا۔ ظاہری طور پر اسے آئی مین ہی ہونا چاہیے تھا۔ وہ جس قدر رازدارانہ

تھے۔ جمائگیر بس آکر اپنی جگہ سنبھال لیتا تھا۔ مقررہ اوقات کے بعد دکان بند کرنے کی ذمہ داری ان دونوں کی تھی۔ فارسی کا زیادہ بکھیرا نہیں تھا۔ فٹ پاتھ پر رکھے ہوئے ایک دو بورڈ اندر اٹھا کر شہر پر تالے ڈالنے تھے۔ میں نے رواجی کا ارادہ ظاہر کیا تو منیر نے چند دواؤں کی تحویل مجھے تمھادی۔ بیوی علاج کے ساتھ وہ دوا میں سلطان شاہ کو تیزی سے صحت یاب کر سکتی تھیں۔

منیر اور اس کے ساتھی سے رخصت ہو کر ہم تیزی سے اس گلی کی طرف چل دیے جہاں جمائگیر کی گاڑی پارک تھی۔ جمائگیر کے فلیٹ کا رخ کرنا بے سود تھا۔ میں فون پر اسے پوری روداد سنا سکتا تھا۔ ہم کی مارکیٹ سے براہ راست گلشن اقبال کے لیے روانہ ہو گئے۔

ہم گھر پہنچے تو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ دونوں عورتیں تشویش، تپش اور پریشانی کے عالم میں ہماری منتظر تھیں۔ رہ گئیں۔ سلطان شاہ کو دیکھتے ہی وہ دونوں صدمے سے بیچنی پھلائی رہ گئیں۔ ”تم کہاں مر گئے تھے۔ کس حال میں گھر واپس آئے ہو!“ ویرانے ملامت بھرے لہجے میں پوچھا۔

”شامت نے دھکا دیا تھا۔ میں نے خاموشی سے ڈینی کی دیکھ بھال کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ آج اس کا تمیازہ بھگتا پڑا۔“ سلطان شاہ نے سر جھکا کر کہا۔

”میں اسی لیے کہتی ہوں کہ ڈینی کی بات مت ٹالا کرو۔ اس کی زبان کالی ہے۔“

”لیکن آج مجھے جھاڑ نہیں پڑی۔ میری مداخلت کے نتیجے میں ہمارا دشمن کھل کر سامنے آ گیا ہے۔“

انہیں باتوں میں مصروف چھوڑ کر میں اپنی خواب گاہ کی طرف بڑھ گیا۔ اس وقت ان لوگوں سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ خاموش رہ کر مجھے فون کرنے دیں۔

میں نے اول خان کا نمبر ملایا تو وہ اسٹیشن فور پر موجود نہیں تھا۔ موبائل فون پر اس سے رابطہ ہو گیا۔ اس وقت وہ اپنی گاڑی میں محو سفر تھا۔

میں نے اختصار کے ساتھ اسے پوری کہانی سنا دی۔ اس وقت تک اسے اپنے ذرائع سے کوئی اطلاع نہیں ملی تھی۔ وہ نہایت جوش و خروش سے ہنکارے بھر کر میری بات سن رہا اور میرے خاموش ہوتے ہی مسرت آمیز آواز میں بول پڑا ”آج تمھاری بہت بڑی مشکل آسان ہو گئی۔“

”میرا خیال ہے کہ میری ایک نہیں، کئی مشکلیں آسان ہوئی ہیں۔ تم کس مشکل کی بات کر رہے ہو۔“ میں نے ایک گہرا سانس لے کر پوچھا۔

”تمھارے لیے بیم گن شجر منوعہ بنی ہوئی تھی۔ اس کا

انداز میں کراچی میں کام کر رہا تھا اس کی بنا پر یہ باور کیا جاسکتا تھا کہ جمائگیر کی تلاش کے لیے اس نے کسی پر اعتماد نہ کیا ہو اور کمر کس کے خود میدان میں کود پڑا ہو۔ اس نظریے کو اہمیت دینے کے ساتھ میں نے دوسرا امکان بھی نظر انداز نہیں کیا تھا کہ آئی مین کے بجائے اس کا کوئی متمدن معاون تھا جسے اس نے اپنی بیم گن بھی سونپ دی تھی۔

وہ کالا مشتعل تماشا نیوں کے جھوم میں پستول باریو اور جیسا کوئی روایتی ہتھیار استعمال کرتا تو یہ ممکن تھا کہ لوگ اس سے مرعوب ہونے کے بجائے زیادہ مشتعل ہو کر اس پر ٹوٹ پڑتے اور اس کی ناکا بونی کر ڈالتے۔

یہ بیم گن کے استعمال کا کمال تھا کہ ایک شخص کا ہاتھ لٹکتے ہی سب دہشت زدہ ہو کر بھاگ گئے۔

ہمارے لیے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ خود آئی مین تھا یا اس کا کوئی ساتھی تھا۔ اس واقعے میں بیم گن کے استعمال سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح ثابت ہو گئی تھی کہ ہمارا واسطہ شی کی کسی آئی مین سے ہی پڑا تھا۔

”میری بات مانو اور دکان بند کر کے گھر چلو۔ مجھے بھی آرام کی ضرورت ہے۔ آج یہاں کوئی نہیں آئے گا۔“ سلطان شاہ نے پھر اصرار کیا۔

میں اس کی بات سے متفق نہیں تھا لیکن مجھے بازار بند ہونے کے آثار نظر آرہے تھے۔ میں اسے کہیں میں آرام کرنے کی تاکید کر کے باہر نکل گیا۔

دکان کا آدھا شہر بدستور گرا ہوا تھا۔ اندر بتیاں جل رہی تھیں۔ میں دکان سے باہر فٹ پاتھ پر نکل گیا۔

افرا تفری ختم ہونے کے بعد وہاں خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ ہماری فٹ پاتھ ویران پڑی ہوئی تھی۔ میرا یہ خیال درست ثابت ہوا تھا کہ دکان دار طبقہ تھا نے پولیس سے گھبراتا تھا۔ ہمارے آس پاس کی بیشتر دکانوں پر تالے پڑ چکے تھے جو لوگ موجود تھے وہ تیزی سے اپنا سامان سمیٹ رہے تھے۔

وقت گزرنے کے ساتھ اصل واقعے کی تفصیل جنگل کی آگ کی طرح پھیلی تھی۔ دکان داروں کو خوف تھا کہ جو بھی دو پیسے کے لالچ میں بھڑا رہا، وہ پولیس کی تفتیش کے نرغے میں آجائے گا پھر دکان داری کرنے کے بجائے روزانہ تھانے میں پیشیاں بھگتانی ہوں گی۔

میں نے کچھ دور جا کر حالات کا گہرا جائزہ لیا اور واپس لوٹ کر فارمیسی بند کرنے کا اعلان کر دیا۔

اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ جمائگیر کسی بڑے سیٹھ کے انداز میں اپنی دکان چلا رہا تھا۔ چابیاں منیر کے پاس ہوتی تھیں۔ وہ دونوں اگر دکان کھولتے اور اندر کی صفائی کرتے

میں نے وضاحت کی۔

”میں کب کہہ رہا ہوں کہ تم نے مجھے اندھیرے میں رکھا تھا۔“ اس کی طرف سے بلا توقف جواب آیا ”یہ بتاؤ کہ بلوہ کیوں ہوا؟“

”ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“ میں نے دروغ مصلحت آمیز سے کام لیتے ہوئے کہا مگر میری چھٹی حس بتا رہی ہے کہ میں نے تمہیں بروقت دکان کا رخ کرنے سے روک لیا۔ آج کے حالات میں تمہارا وہاں ہونا مخدوش ثابت ہو سکتا تھا۔“

”میرے ہونے یا نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ کون سی میری تصویریں لیے گھوم رہے ہوں گے۔ میری جگہ تم نے لے لی ہے۔ وہ میرے دھوکے میں تیرے ہاتھ ڈال دیں گے۔“ مجھے خوشی ہوئی کہ وہ نشے کی ترک میں نہیں تھا۔ اس کا ذہن پوری طرح کام کر رہا تھا۔ میں نے کہا ”آج گزری وجہ سے پورا بازار بند ہو گیا۔ آثار ہمارے ہیں کہ شے کے کسی بڑے نے اپنی لیئر گن استعمال کر کے ایک آدمی کا ہاتھ کاٹ دیا۔ اگر وہ ان اطراف میں موجود تھے تو خطرہ ہمارے سروں پر منڈلا رہا ہے۔“

”ایسی بات ہے تو تم کیوں اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھر رہے ہو۔“ ریسپورس اس کی خائفانہ آواز ابھری ”دکان کو بھاڑ میں ڈالو۔ کمانے کے لیے ساری عمر بڑی ہوئی ہے۔ دکان کو آٹے لگا کر تم بھی گھر پر بیٹھ جاؤ۔ جب حالات سازگار ہوں گے تو دکان کھول لی جائے گی۔“

”بیٹے! دکان بند کر کے جان نہیں بچے گی۔ وہ تمہارے گھر کا کھوج لگانا شروع کر دیں گے۔“ میں نے طنز پر لہجے میں کہا ”گھر اور بیوی کو چھوڑ کر تم کہاں جاؤ گے۔“ ”گھر چھوڑ سکتا ہوں مگر آج بیوی کو چھوڑنے کی بات نہ کرو۔ پتا نہیں آج تم نے کیا جادو کیا ہے کہ وہ بات بات پر میرے صدمے واری ہو رہی ہے۔“

”ہم پر بھروسہ کرو گے تو زندگی بھر یوں ہی عیش کرتے رہو گے۔ شاید آج تم نے اسی لیے اس کی بات مان لی ہے۔“ ”میں نے اس کی کون سی بات مانی ہے؟“ جما گئیر کی آواز چونکی ہوئی۔

”دکان پختے ہی مجھے خوش خبری ملی تھی کہ آج تم اچانک جعلی دواؤں کے کاروبار سے تائب ہو گئے ہو۔“

”ہاں.... آں“ اس بارے میں سسلنے نے بھی بات کی تھی مگر اصل راہ تیرے نے بھٹائی تھی۔ اصولی طور پر میں نے تمہاری رائے مانی ہے۔“

”تم نے گھماؤ ہو۔ عورت کی بات مان لینے سے مرد کی شان میں کمی نہیں آتی۔“ میں نے اسے ملامت کی۔

اس کے کھکھلا کر ہنسنے کی آواز آئی پھر وہ بولا ”تم اس

استعمال جانے والی دواؤں پر تمہاری موجودگی کا کھلا ثبوت سمجھا جاتا تھا۔ آج اس کالے نے برسرعام تیم گن چلا کر اپنے پاؤں پر کھماڑی ماری ہے۔ تمہیں تیم گن کے آزادانہ استعمال کا پروانہ مل گیا ہے۔“

”یہ پروانہ بہت مہنگا پڑا ہے۔ اس کے لیے ایک بے گناہ شہری کو اپنے ہاتھوں سے محروم ہونا پڑا ہے۔“ ”بعض بڑے کاموں کے لیے اس سے زیادہ قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ تم اس کی پروانہ کرو۔“

”آج اس نے دوسری بار تیم گن استعمال کی ہے۔ پچھلی رات اس نے کلفٹن کے ساحل پر نادر کو اسی سے مارا تھا۔“ ”وہ دیران ساحل پر پیش آنے والا واقعہ تھا۔ ہمیں اس پر بہت سخت کرنی پڑتی۔ آج کا واقعہ خود بہ خود اچھے لگے۔“ اول خان اپنی آواز سے مگن لگ رہا تھا۔

”وہ کالا بھی سلطان شاہ کے ہاتھوں کافی بری طرح پٹا ہے۔ ہو سکے تو اس کا کھوج لگانے کی کوشش کرو۔“ میں نے اسے مشورہ دیا ”وہ جو کوئی بھی ہے، کراچی میں مامور امریکی سفارت کاروں سے رابطے میں ضرور ہوگا۔“ میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

”تم فکر نہ کرو۔ آج کل امریکی اپنے سائے سے بھی خوف زدہ ہیں اور پاکستانی ایجنسیوں کی مدد لینے پر مجبور ہیں۔ ان کی حفاظت پر میری کچھ نفرت بھی مامور ہے۔ میں تمہاری خواہش کے مطابق اسے بریف کر دوں گا۔ وہ زیادہ دیر تک ہماری نظروں سے روپوش نہیں رہ سکے گا۔“

اس وقت اول خان کسی ضروری کام سے جا رہا تھا۔ اپنی باتوں سے بے پروائی کا اظہار کرنے کے باوجود وہ یہ بات چھپانے میں ناکام رہا تھا کہ اس وقت اس کی توجہ کسی اور سکتے پر مرکوز تھی۔ میں نے بات وہیں ختم کر دی اور فون بند کر کے جما گئیر کے گھر کا نمبر ملا لیا۔

”دکان سے بول رہے ہو۔ سیل کیسی جا رہی ہے؟“ میری آواز پہنچانے ہی اس نے چمکانا شروع کر دیا۔

”سیل ٹھپ ہو گئی ہے۔ دکان میں آٹے ڈالنے پڑے۔“

”میں نے اسی کے انداز میں جواب دیا۔“

”خدا ابھہر رحم کرے۔ مجھے معلوم تھا کہ تمہارے قدم جہاں جاتے ہیں وہاں کوئی نہ کوئی فتنہ ضرور سر اٹھاتا ہے۔“

اب وہاں کیا ہوا ہے؟“

”منیر اور دوسرے ملازم سے تصدیق کر لینا۔ وہاں ہونے والے خون ریز بلوے میں میرا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔“

”تم نے کسی نہ کسی فساد کی بو سونگھ کر ہی مجھے دکان جانے سے روکا تھا۔“

”میں نے تمہیں اس فساد کے بارے میں بتا دیا تھا۔“

کی یوں وکالت کر رہے ہو جیسے وہ میری نہیں تمہاری بیوی ہو۔“

اس نے وہ فقرہ مذاق میں کہا تھا لیکن میں چند ثانیوں کے لیے سناٹے میں آگیا پھر میں نے کہا ”بے ہودہ باتیں مت کرو۔“

”ان فضول باتوں کو چھوڑو اور کان کھول کر میری ایک بات سن لو۔“ اس نے میری بات کاٹ کر کہا ”سلمی کا موڈ اچھا ہے تو اب گھر پر رہنے کا لطف آ رہا ہے۔ جب تک تم خطرہ بالکل نل جانے کی خبر نہیں سناؤ گے، میں دکان کا رخ نہیں کروں گا۔“

”یہ تمہارا مناسب فیصلہ ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ میدان صاف ہونے میں زیادہ سے زیادہ تین چار دن لگیں گے۔“

”یار، تم نے اس کے ماموں کو پکڑوا کر مجھ پر اتنا بڑا احسان کیا ہے کہ میں زندگی بھر تمہاری غلامی کرتا رہوں تو تمہارے اس احسان کا بدلہ نہیں آتا رہ سکتا۔“ یکایک اس کی ذہنی رد ہو چک گئی اور اس نے رازدارانہ آواز میں وہ بھولا ہوا ذکر دوبارہ چھیڑ دیا۔

”جناگیر! خدا کا خوف کرو۔ چوہدری عظمت اپنی حرکتوں سے پھنسا تھا۔ میں نے اسے نہیں پکڑوایا۔ سلمیٰ نے تمہاری الزام تراشی سن لی تو وہ ہمیشہ کے لیے مجھ سے بدظن ہو جائے گی۔ میرا اس معاملے سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔“

”مجھے معلوم ہے کہ تم بہت مسکین بنتے پھرتے ہو مگر تمہاری پہنچ بہت دور تک ہے۔ پتا نہیں ماموں عظمت نے کب سے اپنی این سی او کا چکر چلایا ہوا تھا اور بے حساب مال ہیٹ رہا تھا۔ تمہارے لاہور پہنچتے ہی اس کے ستارے گردش میں آئے اور وہ مارا گیا۔ میں دودھ پیتا پتہ نہیں ہوں کہ تمہارے یہ چکر نہ سمجھ سکوں۔“

”تمہارے دماغ میں بھس بھرا ہوا ہے۔ اس میں جو بات بیٹھ جاتی ہے، آسانی سے نہیں نکلتی۔ تم جو چاہو سمجھتے رہو، میرے ہاتھ صاف تھے۔“

”وہ پکڑا اس لیے گیا کہ تمہارے ہاتھ صاف تھے۔ تمہاری جگہ کوئی کب مڑا کرنے والا ہوتا تو دس بیس لاکھ لے کر اس کی جان چھوڑ دیتا۔“ جناگیر اسی لکیر کو پیٹے جا رہا تھا۔

”معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت سلمیٰ موجود نہیں ہے اس لیے تم اپنے دل کی بھڑاس نکال رہے ہو؟“

”غسل فرما رہی ہے۔“ جناگیر نے شہدے پن سے اعلان کیا۔

”تمہارا ذہن آوارہ ہو رہا ہے۔ اس وقت تم مزید بات کرنے کے قابل نہیں رہے ہو۔“ میں نے اس کی مزید

خرافات سے بچنے کے لیے فون بند کر دیا۔

میں دوبارہ ڈرائنگ روم میں پہنچا تو ویرا بہت اٹھماک اور درد مندی سے سلطان شاہ کے زخموں کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔

”تم تو اس کے خون کی پیاسی ہو۔ اس وقت اس پر اتنی مہربان کیوں ہو؟“ میں نے اپنی نشست سنبھالتے ہوئے طنز سے پوچھا۔

”یہ اپنی حماقت اور خوش قسمی کی وجہ سے مارا گیا۔ اگر اسے اپنی طاقت کا زعم نہ ہو تا تو یہ اس کا لیے سے دور رہتا مگر میں نے اس کی یہ خطا معاف کر دی ہے۔“

”اس معافی کا سبب فاصدا دلچسپ ہے۔ ذرا ویرا سے یہ تو پوچھ لیں کہ کیوں معاف کر دیا۔“ غزالہ نے مسکراتے ہوئے مجھے اکسایا۔

”جناؤ بھئی، تم نے اسے کیوں معاف کیا ہے۔“ میں نے ویرا سے کہا۔

”صرف اس لیے کہ اس نے ساری حماقتیں تمہاری خاطر کی ہیں۔ میں اس کے اس جذبے کی قدر کرتی ہوں کہ اس نے کوئی کریڈٹ لینے کے بجائے خاموشی سے تمہاری حفاظت کا فیصلہ کیا اور مارا کھا کر واپس لوٹ آیا۔“ ویرا نے اس کے ابو کے زخم پر مرہم لگاتے ہوئے کہا۔

سلطان شاہ بھڑک اٹھا ”میں مارا کھا کر نہیں آیا۔ میں نے بھی اسے بہت بری طرح مارا ہے۔“

”چلو، تم ٹھیک کہہ رہے ہو گے۔“ ویرا نے بے اعتباری سے اسے پچکارا ”وہ تمہارے ہاتھوں پٹا ہوتا تو بھیڑ میں سے بچ کر بھاگے میں کامیاب نہ ہوتا۔“

”وہ صرف نیگ گن کی وجہ سے بچ گیا۔ لوگوں نے اس ہتھیار کی تباہ کاری پہلی مرتبہ دیکھی تھی۔“ سلطان شاہ نے تللمکا کر جواب دیا۔

”وہ ہمارے سامنے نہیں ہے۔“ ویرا نے اپنے شانے اچکا کے بے بسی سے کہا ”تم جو کچھ کہو گے، وہ ماننا پڑے گا۔ تم چاہو تو یہ دعویٰ بھی کر سکتے ہو کہ تم نے اس کے تین دانت توڑ دیے تھے۔“

”یہ بلا وجہ بکواس کیے جا رہی ہے۔“ سلطان شاہ نے ویرا کا ہاتھ دور جھٹک کر مجھ سے شکایت کی ”میں اس کا ادھار کھاتا ہوں جو اس سے جھوٹ بولوں گا۔“

”اچھا چلو، تم بچ بول رہے ہو۔ اب یہ بتاؤ کہ تم نے اس کے جڑوں پر کتنے کے مارے تھے۔“ ویرا نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے پوچھا۔

سلطان شاہ نے غصے انداز میں دوبارہ اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور بے رخی سے بولا ”سر سلا کر میرا بھیجا کھانے کی

ملی کہ ان ہی اطراف میں ایک کالے غیر ملکی نے اندھا دھند لیزر کا کوئی ہتھیار استعمال کیا ہے۔ میرے لیے نتیجہ اخذ کرنا دشوار نہیں تھا۔“

”اور وہ اطلاع سن کر تم ادھر دوڑے چلے آئے!“
 ”فون پر بات کرنے میں مزہ نہیں آتا۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا تھا کہ لیزر گن کی مارکیٹ کا متنازعہ بازار بند ہو گیا ہے۔ میں نے اسپتال میں لیزر گن کے مجروح کو دیکھا اور یہاں آگیا۔ یہ بتاؤ کہ سلطان کے چہرے کا شریکوں بگڑا ہوا ہے۔“
 اسے وہ کہانی ایک بار پھر سنائی پڑی۔ وہ پورے انہماک اور توجہ سے ایک ایک لفظ سن رہا تھا۔

”تم پتھرے کے قیدی کی طرح گولڈن فارمیسی میں بے بس ہو کر رہ گئے تھے۔“ پوری کہانی سن لینے کے بعد اس نے اعتراف کیا ”اگر سلطان پہلے سے وہاں نہ پہنچا ہوا ہوتا تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ وہ کالا اپنا جائزہ لے کر صاف نکل جاتا۔ اٹھارہ گھنٹے کی قلیل سی مدت میں کراچی میں جیم گن دوسری مرتبہ استعمال ہوئی ہے۔ ہر طرف کھٹکی گج گئی ہے۔ اس وقت سب سے زیادہ پریشانی ذمے دار امریکی افسران کو ہوئی۔ وہ یکایک مدافعتی پوزیشن میں چلے جائیں گے۔“

”تم دعا کرو کہ دو تین روز میں آئی مین ہمارے ہاتھ آجائے تو مزہ آجائے گا۔“
 ”تو کیا تم اس پر اپنا کام جاری رکھو گے؟“ اس نے جبرت سے پوچھا۔

”یہ ابتدا ہے۔ شکار نے چارے پر ایک بار منہ مار دیا ہے۔ اب اسے پھنسنایا جا رہا ہے۔“
 ”اب ہم بھی میدان میں اتر آئیں گے۔ یہ یاد رکھنا کہ وہ پکڑا گیا تو سرکاری قیدی بنے گا۔“

”یہ نہیں ہونا چاہیے۔“ میں نے مابوسی سے احتجاج کیا ”تم نے اسی طرح راجا کو بھی پولیس کے قبضے میں پہنچا دیا ہے۔“

”یہ ابھی تک صرف وعدہ ہے۔ راجا ابھی تک اول خان کے قبضے میں ہے۔ وہ اسے نچوڑ کر پولیس کے سپرد کرے گا۔“

”اپنے قیدیوں کی مدارات کا اسے پورا حق حاصل ہے۔ تم کو راجا پر کٹھنا کرنا چاہیے۔ آئی مین میرے ہاتھ آگیا تو میں جیم گن سے اس کے سارے بدن کو داغ دار کیے بغیر کسی کے حوالے نہیں کروں گا۔ تم کو معلوم ہے کہ شئی اور اس کے بڑوں سے میرا جھگڑا بہت پرانا ہے۔“

”وہ مبارک وقت آئے گا تو دیکھ لیا جائے گا کہ کیا کرنا چاہیے۔“ بات بڑھانے کے بجائے جلال نے وہ قصہ وہیں

کوشش مت کرو۔ مجھے تمہاری کسی ہمدردی کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ کالا ایک مرتبہ ہمارے ہاتھ آجائے تو میں تمہیں بتاؤں گا کہ میں نے اس باکر کو کیسے مارا تھا۔“

”کیوں بلاوجہ چڑے ہو رہے ہو۔“ مجھے سلطان شاہ پر غصہ آگیا ”ویرا جب چاہتی ہے تم کو کھلونا بنا کر کھیلنا شروع کر دیتی ہے اور تم اس کے چکر میں آ جاتے ہو۔“

دور تیل کی آواز نے اس گفتگو کا سلسلہ وہیں منقطع کر دیا۔ سلطان شاہ دروازے تک جانے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ ویرا نے رضا کارانہ طور پر وہ ذمے داری اپنے سر لے لی۔ غزالہ بھی مشینی انداز میں اس کے پیچھے ہوئی۔

تغلبہ میسر آتے ہی سلطان شاہ نے مجروح نظروں سے میری طرف دیکھا اور اپنی آواز میں بولا ”تم اسے اچھی طرح جانتے ہو پھر بھی اس کا ساتھ دیتے ہو۔ جانتے وہ وہ کیا کر رہی تھی؟ ذرخوں پر مرہم وغیرہ لگانے کے بھانے میرا اپنے ہیٹ سے پکائے کھڑی تھی۔ میں اس کی بے عزتی نہیں کرتا۔ سب کے سامنے کیا بتانا کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ اس پر میرا غصہ بلا سبب نہیں تھا۔ تم کو نہیں معلوم کہ وہ میرے ساتھ کیا کیا حرکتیں کرتی رہتی ہے۔“

مجھے اس کے جواب میں کچھ کہنے کا موقع نہیں مل سکا۔ وہ دونوں دروازے سے جلال کو اپنے ساتھ لے کر آئیں۔
 ”تم لاجواب آؤی ہو۔“ جلال نے برجوش انداز میں مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”آخر کار تم نے انہیں کھل کر سامنے آنے پر مجبور کر دیا۔“

”تم کس بات کر رہے ہو؟“ میں نے اس سے اپنے اندازے کی تصدیق چاہی۔

”میں شئی کے آئی مین کی بات کر رہا ہوں۔ تم وہاں جمانگیر کی فارمیسی پر بیٹھنے جانے کیا گل کھلا رہے تھے کہ اسے جیم گن استعمال کرنی پڑ گئی۔“

”اس کا رخیر کا سر سلطان شاہ کے سر جاتا ہے“ یہ آج کا ہیرو ہے۔“ میں نے کہا۔

جلال نے بڑھ کر گرم جوشی سے اسے اپنے سینے سے لپیٹ لیا اور کہا ”اگر یہ کارنامہ تمہارا ہے تو تمہارا منہ چوم لیا جانا چاہیے۔“

”اس سے بس یہی نہ کہنا۔“ ویرا ہلکا سا قہقہہ لگا کر بولی ”ایسی باتوں سے اس لاڈلے کو اختلاف ہونے لگتا ہے۔“

”تمہیں شئی کے آئی مین کے بارے میں کیسے بتا چلا؟“ میں نے جلال سے پوچھا۔

”مواہل پر بات ہونے کے بعد مجھے پتا تھا کہ تم شہر کے کس علاقے میں مصروف ہو۔ تھوڑی دیر پہلے یہ دھماکا خیز خبر

ضرورت پڑنے پر ہم اس پر دوبارہ بات کریں گے۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

”اب تم نے اپنی بات ایک دوسرے پر ایسے میں دہرا دی۔ میں چاہ رہا ہوں کہ کل صبح تم گولڈن فارمیشی کارخ کو تو میرے آدمی تمہارے ارد گرد موجود ہوں۔“

”اس طرح میرے لیے دشواریاں بڑھ جائیں گی۔“ اسے قائل کرنے کے لیے مجھے خوشامدانہ لہجہ اختیار کرنا پڑا۔ ”ہمارا مقابلہ معمولی دشمن سے نہیں ہے۔ ان لوگوں کے اپنے دس کلاں ہیں۔ یہ بھیڑ انہیں چونکا کر دے گی۔ ابھی وہ مجھے جہانگیر سمجھ کر دھوکا دے رہے تھے کہ ان کو کشت کر سکتے ہیں۔ غیر معمولی حفاظتی انتظامات انہیں شک میں ڈال دیں گے۔“

جلال کا خلوص ہر خشک و شبنم سے بالاتر تھا۔ میرے اپنے تحفظات تھے۔ میں نامعلوم آئی مین اور اس کی حکمت عملی کو سمجھ رہا تھا۔ میں وہ باتیں قبل از وقت اپنی زبان پر نہیں لاسکتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس مقابلے میں کسی تیسرے طاقت ور فرقہ کی شمولیت پورا کھیل بگاڑ دے گی۔

ایک ہی بحث کے بعد جلال کو ہتھیار ڈالنے پڑ گئے اور میں دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کر کے رہ گیا ورنہ اس کی ہمدردی کے روپ میں مجھے ایک بڑا مسئلہ کھڑا ہوتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ میرے لیے ایس بی ایف اور آئی بی والوں کی ہمدردیاں یکساں تھیں۔ فرق یہ تھا کہ ایس بی ایف والے قانون اور ضابطوں کی پروا کیے بغیر اپنی بہترین صلاحیت کے مطابق فیصلے کرتے تھے اور پھر بے خوف و خطر ہو کر ان پر عمل کر گزرتے تھے۔ آئی بی وفاقی حکومت کا ایک ذمے دار اور باضابطہ ادارہ تھا اس لیے اس کے اراکین کو ہر ہر قدم پر اپنی حدود و قیود کا خیال رکھنا پڑتا تھا۔ ایمان داری کی بات یہ ہے کہ اگر مجھے اپنے کام میں مدد کے لیے ضرورت پڑی جاتی تو میں بے حساب آزادیوں کی بنا پر ایس بی ایف کے انتخاب کو ترجیح دیتا مگر یہ بات جلال سے کہنے والی نہیں تھی۔ تمام تر زمینی حقائق کے باوجود اسے میرے نظریے سے تکلیف پہنچنے کا امکان تھا۔

ہم اس کے ساتھ چائے نوشی میں مصروف تھے۔ سلطان شاہ نے مشتبہ کالے سے لکھ کر ایسا شان دار کانامہ انجام دیا تھا کہ اس کی ذات اس روز کا موضوع بحث بن گئی تھی۔ جلال بھی اسے پہلی بار بہت زیادہ اہمیت دے رہا تھا۔

اسی دوران میں اول خان بھی آگیا اور ہماری محفل میں ایک نئی جان پڑ گئی۔

اسے بھی سلطان شاہ کی حالت دیکھ کر صدمہ ہوا۔ اس کی آمد پر میں نے پہلی بار یہ بات نوٹ کی کہ نام کی ساخت اور

ختم کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی ”میں نے ایک فیصلہ کیا ہے کہ اب تم لوگوں کو تنہا نہیں چھوڑا جائے گا۔ میرے کمائنڈو یونٹ کے دو چار آدمی ہر وقت تمہاری خفیہ حفاظت کریں گے۔“

”حفاظت یا نگرانی؟“ ویرا نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ پوچھا۔

”میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔“ جلال یک لخت سنجیدہ ہو گیا۔ ”نگرانی مشتبہ لوگوں کی جاتی ہے۔ حفاظت اثاثوں کی ہوتی ہے۔ تم چاروں کی ٹیم ایک قومی اثاثے کی حیثیت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ میں دل سے تم سب کی قدر کرتا ہوں۔ تمہیں کسی غفلت کی بھیئت نہیں چڑھنے دیا جائے گا۔“

”میں تمہارے ان الفاظ کے لیے تمہارا شکر گزار ہوں مگر ہمیں کسی تحفظ کی ضرورت نہیں۔ آج پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ میں نے خود کو تنہا محسوس کیا اور وقت نے دکھا دیا کہ میرا ایک ساتھی اپنی کسی حیوانی جبلت کے تحت پہلے سے میرے نزدیک چھپا ہوا تھا۔“

”نہیں... تم کو میری بات ماننی ہوگی۔“ جلال بضد تھا۔ ”پھر تم ایسا کرو کہ ہمیں قومی اثاثے کے بجائے ورثہ قرار دلا دو۔“ ویرا نے کہا ”اور ہماری میان بنا کر کسی عجائب گھر میں رکھو دو۔“

ویرا نے بے نیکی بات کہہ ڈالی تھی۔ میں نے اس کے الفاظ کی تسلیلی کم کرنے کے لیے زبردستی ایک قہقہہ لگایا اور لاابالی انداز میں کہا ”ویرا صحیح کہہ رہی ہے۔ حفاظتی بیروں میں رہ کر کام کرنے سے بہتر ہوگا کہ ہم گوشہ نشینی اختیار کر لیں۔ ہمیں ہر وقت ایس بی ایف کا بھپور تحفظ حاصل ہے لیکن ہم ناگزیر ضرورت کے بغیر اول خان کے کسی آدمی کو زحمت نہیں دیتے۔ تمہاری تجویز مان لینے کے بعد ہمیں اس سے بھی گارڈ لینے پڑیں گے۔“

”دشمنی والے خونی درندے ہیں۔ جب تک ان کا قہقہہ نہیں ختم جاتا تم کو محتاط رہنا ہوگا۔“

”میں تمہاری اس بات سے متفق ہوں۔ میں نے جھٹ جواب دیا ”محتاط رہنے اور زیر حفاظت آجانے میں بہت فرق ہے۔“

”بعض اوقات تم اپنی بات براڑ جاتے ہو۔“ جلال نے بے بسی سے کہا ”میں تمہارے بھٹکے کی بات کر رہا ہوں۔ میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ میرے آدمی تمہاری آزادانہ نقل و حرکت میں ذرا بھی خارج نہیں ہوں گے اور نہ ہی تمہارے ایما کے بغیر کسی کارروائی میں مل جائیں گے۔“

”میں نے تمہاری یہ پر خلوص تجویز نوٹ کر لی ہے۔“

دی ریکارڈ اجلاس میں شرکت کی تھی جہاں پاکستانی وفد کو امریکی سیٹلائٹ کی بولی وہ تصویریں دکھائی گئی تھیں جس سے پاکستان کی ایٹمی تیاریوں کے سارے راز فاش ہو رہے تھے۔ وہ فلم دکھانے کے بعد وفد سے پوچھا گیا تھا کہ ایسی ناقابل تردید شہادتوں کی روشنی میں پاکستان کیسے دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس نے اپنے خفیہ ایٹمی تجربات پر کام روک دیا ہے۔ وہ بڑی خراب صورت حال بھی مگر ہمارے وفد کے سربراہ نے سرکاری موقف سے ہٹ کر کچھ کہنے سے انکار کر دیا اور ہم لوٹ آئے۔ بعد میں کہیں ان تصویروں کا ذکر آیا نہ اخبارات میں ان کا چرچا ہوا۔ وہ سب آف دی ریکارڈ ہی رہا۔

”یہی حال ہمارا ہے۔ ایس نی ایف اور اس کی سرگرمیوں کے بارے میں امریکی بہت کچھ جانتے ہیں لیکن سرکاری سطح پر ہمارے اس موقف کو مانتے ہیں کہ پاکستان میں آئین اور قانون سے ماوراء کسی ادارے کا کوئی وجود نہیں ہے۔“

”ایسی مفاہمت دو طرفہ ہوتی ہے۔“ میں نے ورا کو سمجھایا ”اگر امریکا والے ہم سے تعاون نہ کریں تو ہمارے دفتر خارجہ کو بھی ان کے خرقے اٹھانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔“ ”جان کھماڑی کے کھارے اور گندے پانی میں ڈبکیاں کھانے بعد بھاگ گیا“ لیری دل کا دورہ پڑنے سے مر گیا تو اب آئی میں کھل کر سامنے آگیا۔“ جلال نے اپنی بات وہیں سے جوڑی جہاں اس نے چھوڑی تھی۔

”آئی میں اچانک سامنے نہیں آیا۔ اسے سامنے آنے پر مجبور کیا گیا ہے۔ اس سے چھپ چھاڑ میں پبل ہماری طرف سے ہوئی تھی۔“ غزالہ بولی۔ اس وقت ہم میں سے ہر ایک کی یادداشت بہت اچھی طرح کام کر رہی تھی۔

”یوں ہی سنی مگر اس کا وجود زیادہ پرانا نہیں ہے۔ چوہڑا کے گھر کا سراغ لگانے کے لیے ورا اپنے طور پر جوش کو فون نہ کرتی تو شاید آئی میں خاموشی سے اپنے کام میں لگا رہتا قابل غور بات یہ ہے کہ اسے ایک خاص وقت پر یہاں بھیجا گیا ہے۔“

”اور اب وہی ہمارے سامنے ہے۔ سی آئی اے اور را کے اہم کارندوں کا صفایا ہو چکا ہے یا انہوں نے فرار کی راہ اختیار کر لی ہے۔“ میں نے کہا۔

”یہ بہت اچھا ہے۔“ اول خان بولا ”ایک وقت میں ایک دشمن سے مقابلہ ہو تو توجہ اسی طرف مرکوز رہتی ہے۔“ ”آئی میں کے جوش میں ہم ونود کو بھول رہے ہیں۔ وہ بھی راکا آؤی ہے۔“ غزالہ نے یاد دلایا۔

”اس کے بارے میں“ میں نے ایک طریقہ سوچ لیا

ترکیب کی وجہ سے ہم سب ہی غیر ارادی طور پر اس کا پورا نام لیا کرتے تھے لیکن جلال نے ہماری روایت کی تقلید نہیں کی تھی۔ وہ بار بار اس کا پہلا نام لے رہا تھا جو میرے کانوں کو کچھ ادھورا اور نامانوس لگ رہا تھا۔

سلطان شاہ سے بھرپور اظہار ہمدردی کے بعد موضوع ختم حالات حاضرہ کی طرف منتقل ہو گیا۔

”اس بار میں ایک نئی بات محسوس کر رہا ہوں۔“ اچانک جلال نے کہا ”جب تک ہمارے دشمنوں کا ایک محاذ گرم رہتا ہے، دوسری سمتوں میں سناٹا چھایا رہتا ہے۔ جونہی وہ محاذ ٹھنڈا پڑتا ہے کوئی نیا فتنہ پوری قوت سے سراٹھانے لگتا ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہوتا۔ پیچھے دنوں را اور سی آئی اے، دونوں ہی حرکت میں آئی ہوئی تھیں۔“ ورا بولی۔

”نہیں، ایسا نہیں تھا۔“ جلال نے وثوق سے اس کی تردید کی ”میرے آدمی دن رات، سائوں کی طرح ان کے منہجوں کا پیچھا کرتے ہیں۔ پیچھے دنوں وہ دیکھے ہوئے تھے کیونکہ ہم را کے خلاف کام کر رہے تھے۔ تم دونوں کی بھارت سے واپسی کے ساتھ ان کی سرگرمیاں دم توڑ چکی تھیں۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ اول خان نے اس کی بات کی تائید کی ”دہلی میں اعلیٰ اور نریش کے انجام نے انہیں خوف زدہ کر دیا تھا۔ یہ ڈبئی کی ذہنی اچھ تھی کہ اس نے فیکس پر اپنی رپورٹ بھیج کر چند گرنانی کے گلے میں طوق ڈالنے کی راہ نکال لی۔ میری اطلاعات یہی ہیں کہ وہ خاموش ہو کر بیٹھ گئے تھے۔“

”میں بتا رہا تھا کہ را والے خوف زدہ ہو کر پسپا ہوئے تو سی آئی اے والوں نے دیدہ دلیری سے سراٹھانا شروع کر دیا۔“

جلال کی بات پوری ہونے سے پہلے ورا بول پڑی ”شاید میری بات تم کو بری لگے لیکن سی آئی اے والوں کو ہم نے خود سر پر چڑھایا ہوا ہے۔ ضابطے کے کاموں میں کسی غیر رسمی اجلاس کی کیا گنجائش تھی۔ ہمیں انکار کر دینا چاہیے تھا کہ انہیں پتا چلنا کہ ہم بھی اپنے قانون کا احترام کرتے ہیں۔ یہاں جو کچھ ہوتا ہے، ریکارڈ پر ہوتا ہے۔ ریکارڈ سے ہٹ کر کوئی کام نہیں کیا جاتا۔“

”زبانی طور پر یہ سب کہنا آسان ہے۔ عملی طور پر مجبوریاں آڑے آنے لگی ہیں۔ ایک مرتبہ میں نے خود واشنگٹن میں پینٹاگون کے انتہائی خفیہ ہال میں ایک آف

نے مجھ سے کہا ”وہ ایک مرتبہ جس شخص کو تاک لیتے ہیں ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔“

”پتا نہیں ایسے اجلاسوں میں تمہیں اپنے فرضی نام کے ساتھ فوجی عہدے لگانے کی کیا ضرورت ہوتی ہے۔ آدمی سیدھا نام استعمال کرے تو ٹالنے کے لیے دس بہانے ہو سکتے ہیں۔“ ویرا نے وہ خبر سن کر اپنی ہلکی سی ناگواری کا اظہار ضروری سمجھا ”ایس بی ایف میں آنے سے پہلے وہ کہیں کلرکی کر رہا تھا۔ ماضی کا ریکارڈ دستیاب نہیں ہے اور بات ختم۔ فوج میں تو دھوپوں تک کا باقاعدہ ریکارڈ رکھا جاتا ہوگا۔ ایک ذمے دار ریکر سے ریشٹر ہونے والے افسر کا سروس ریکارڈ نہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”کسی بہروپ کو معتبر بنانے کے لیے ایسے حربے استعمال کرنے پڑتے ہیں۔“ اول خان نے اس کے اعتراض پر وضاحت کرتے ہوئے کہا ”تم کو اس بارے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ڈینی سے اس بارے میں بات کر چکا ہوں۔“

”یہ ابتدائی اطلاع ہے۔“ جلال بولا ”ایف بی آئی چیف کا فیکس ہمارے دفتر کو ملا ہے۔ ابھی اسے ٹال دیا جائے گا لیکن وہ مصرعے ہو بعد میں کسی نہ کسی مرحلے پر ان کو مطلوبہ معلومات فراہم کرنی پڑیں گی۔“

”اچھا ہوا کہ تم نے بتا دیا۔ میں ڈینی کا ایک فرضی سروس پروفائل تیار کر کے لیتا ہوں۔“ انہوں نے سرکاری طور پر فرمائش کی ہے تو اسے پورا کرنا پڑے گا۔“

”میں نے اپنے انتظامی شعبے کے نگران سے بات کی تھی۔“ جلال بتانے لگا ”اس کا کہنا ہے کہ اس درخواست کو قبول کرنا ضروری نہیں ہے۔“

”ہو سکتا ہے کہ وہ ڈینی بلکہ کرنل داور کو ایف بی آئی یا سی آئی اے کے لیے منتخب کرنا چاہ رہے ہوں۔“ ویرا نے حسب عادت قیاس آرائی شروع کر دی ”ایسا ہے تو ڈینی کے لیے ان کی صفوں میں پہنچنے کا بہت اچھا موقع ہے۔“

”نکلوں کی سطح پر ایسا نہیں ہو سکتا کہ اپنی پسند کے کسی آدمی کو مانگا جائے۔“ جلال نے بتایا ”یہ طریقہ تہذیب‘ رد اداری اور شائستگی کے ہر معیار کے خلاف ہے۔ انہیں اپنے کسی ادارے کے لیے افرادی قوت کی ضرورت ہے تو وہ ہمیں تعداد‘ قابلیت اور اہلیت سے آگاہ کریں۔ آدمی ہم خود نامزد کریں گے۔“

”اس بہانے بات مل جائے تو بہتر ہوگا۔“ میں نے جلال سے اتفاق رائے کرتے ہوئے کہا ”مجھے کسی امریکی ادارے میں جانے کا شوق نہیں ہے۔ میں ان سے دور رہ کر

ہے۔ کچھ دنوں تک اسے ڈھیل دی جائے گی تاکہ وہ پورے اطمینان سے اپنا روزانہ کاروبار بنالے پھر اچانک ہی اسے اٹھا کر کسی ویرانے میں جہنم واصل کر دیا جائے گا۔“ جلال زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

”وہ جو کچھ بھی ہے، بہر حال ایک سفارتی افسر ضرور ہے۔“ اول خان نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

”اسے عبداللہ کے خون کی قیمت چکانی ہے۔“ جلال نے تلخی سے جواب دیا ”میں نے سوچا ہے کہ اس کا انجام نادر جیسا ہو تاکہ اس کے قتل کے بارے میں زیادہ قیاس آرائیاں نہ ہوں۔ اس کے قتل کی گتھی کبھی نہیں سلجھ سکے گی۔“

”اگر آئی مین ان سے ملا ہوا ہے تو وہ انہیں اپنی بے گناہی کا یقین ضرور دلانے گا۔“ اول خان بولا۔

”دلائل تار سے۔ وہ اس بات کا اعلان نہیں کر سکیں گے۔“ جلال اپنی جگہ مطمئن تھا۔

”اس کے قتل کی ذمہ داری آئی مین کے سر کیسے آجائے گی؟“ سلطان شاہ نے الجھ کر سوال کیا۔

”وہ بیم گن سے مارا جائے گا۔“ ویرا نے اسے بتایا ”تم اتنی سی بات بھی نہیں سمجھ سکے۔“

”اور وہ بیم گن میں تمہیں فراہم کروں گا۔“ میں نے جلال سے تصدیق چاہی۔

”دعا کرو کہ اس وقت تک میرے آدمی آئی مین کو پکڑیں تو میں تم سے ادھار لینے کی خفت سے بچ جاؤں گا۔ اسی کی بیم گن میرے کام آجائے گی۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

”یہ ادھار نہیں، تمہارا احسان ہوگا کہ تم راکے ایک موزی کو مارنے کے لیے میری بیم گن استعمال کرو گے۔“ میں نے اپنے دل کی بات کہہ ڈالی۔

”وہ ہمارے مشترکہ دشمن ہیں۔ ان کو سکیلنے کے لیے ہم سب کو دامنے، درمے، خنجر مدد کرنی چاہیے۔“ ویرا نے روایتی سی بات کہہ دی جو اس کے منہ سے بھلی معلوم ہوئی۔

”ان باتوں میں الجھ کر میں ایک اہم بات ابھی تک بھولا ہوا تھا۔“ جلال نے چونکتے ہوئے کہا ”میں نے بتایا تھا کہ سی آئی اے کے دونوں آدمی نے ہمارے غیر رسمی اجلاس میں تمہاری ذات کو مارک کر لیا تھا۔ اب واشنگٹن سے ایک فیکس موصول ہوا ہے۔ امریکا کے فیڈرل پیورڈ آف انوشٹیشن کے چیف نے باضابطہ طور پر کرنل داور کا سروس پروفائل مانگا ہے۔“

”یہ خدشہ میں نے ابتدا میں ہی ظاہر کیا تھا۔“ اول خان

اپنا کام زیادہ بہتر انداز میں سرانجام دے سکتا ہوں۔“

○۵۵○

اگلی صبح کے اخبار کا پہلا صفحہ کئی سنسنی خیز خبریں لیے ہوئے تھا جو میرے لیے پرانی ہو چکی تھیں۔

خبروں میں واضح طور پر لکھ دیا گیا تھا کہ ایک بین الاقوامی زیر زمین تنظیم کے کچھ بڑے اپنے جدید ترین ہتھیاروں کے ساتھ پاکستان میں فعال ہو چکے تھے اور انہوں نے اپنی روپوشی کے لیے سب گناہ پاکستانیوں کے لمبے ہونے کھیلنے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔

نادر کے قتل کے بارے میں میں کم لیکن بہت ٹھوس مواد شائع ہوا تھا جس میں ایٹھ ایجنٹ کا تصویری بیان کلیدی اہمیت کا حامل تھا۔ ایٹھ ایجنٹ نے اعتراف کیا تھا کہ اس نے ایک بڑی رقم کے لالچ میں کوئی چھان بین کے بغیر اپنا مکان نادر کو کرائے پر دے دیا تھا جس میں نامعلوم لوگوں نے خفیہ طور پر رہائش اختیار کر لی تھی۔ خبر میں میرے اس تجربے کا کوئی ذکر نہیں تھا کہ اس گھر میں رہنے والے مشتبہ افراد میں کوئی عورت بھی شامل تھی۔

اس خبر کے ساتھ ہی شہر کے بدنام جرائم پیشہ شخص، راجا کی گرفتاری کی خبر بھی۔ شاید اول خان نے ہم سے رخصت ہونے کے بعد اسے پولیس کے حوالے کر دیا تھا۔ راجا پر جوشی کے قتل کا الزام عائد کیا گیا تھا۔ راجا کے اس بیان کو سرنی کی زینت بنایا گیا تھا کہ وہ شہر میں ہیروئن کے فروغ کے لیے ایک نامعلوم غیر ملکی کے لیے کام کر رہا تھا۔ راجا نے اس کی صورت نہیں دیکھی تھی لیکن اس نے اپنے غیر ملکی آقا کا جو فون نمبر پولیس کو بتایا، وہ وہی تھا جو نادر کے کرائے پر لیے ہوئے مکان میں نصب تھا۔

لی مارکیٹ میں ایک سیاہ فام غیر ملکی کی اندھا دھند لیزر فائرنگ کی خبر بہت بڑی اور نمایاں تھی۔ وہ ایک مصروف علاقے میں رونما ہونے والی بڑی واردات تھی جس کے متعدد چشم دید گواہ تھے۔ وہ گواہ پولیس کی دسترس میں آئے ہوں یا نہ آئے ہوں، اخباری نمائندوں نے اپنے ذرائع سے ان تک رسائی حاصل کر لی تھی۔ ان گواہوں کی کہانیاں لرزہ خیز تھیں۔

نادر کے قتل کی واردات کا سراغ رات گئے اتنی تاخیر سے ملا تھا کہ اس کے بارے میں پچھلے روز کے صبح کے اخبارات میں ایک لفظ بھی نہیں چھپ سکا تھا۔ فوری طور پر وہ تاخیر مجھے گراں گزری تھی لیکن اخبار میں بیک وقت دو واقعات کی خبریں پڑھ کر میرا وہ شکوہ دور ہو گیا تھا۔

رہی سسی کسر ملٹی ماہرین کی رپورٹوں نے پوری کردی

تھی۔ مقامی سرکاری اسپتالوں میں ایسے آلات دستیاب نہیں تھے جو دونوں واقعات کے متاثرین کا صحیح تجزیہ کر کے کوئی حتمی نتیجہ اخذ کر سکیں لیکن انہوں نے یہ بتا دیا تھا کہ دونوں واقعات میں بارود کا ایک ذرہ بھی استعمال نہیں کیا گیا تھا۔ نادر کی کھوپڑی میں سوراخ کرنے اور دوسرے شخص کا بازو کاٹنے میں انتہائی شدید درجہ حرارت رکھنے والی تیز ترین شعاؤں کی کوئی نیکی سی دھار استعمال کی گئی تھی۔ جس نے گوشت کو جلانے یا چربی کو پگھلانے کے بجائے پٹم ذرن میں بخارات میں تحلیل کر دیا تھا۔ مقامی ماہرین نظریاتی طور پر ایسے ہتھیاروں کی تیاری کے قائل تھے مگر ان کے وجود سے بے خبر تھے۔

میں ان خبروں کے مطالعے میں ڈوبا ہوا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی اور میں چونک کر انسٹرومنٹ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ گھنٹی دوبارہ نہیں بجی جس کا مطلب تھا کہ کاؤنٹر فون اٹھالیا گیا تھا۔ چند ثانیوں بعد دوسرے ملازم نے کبسن میں آکر رازدارانہ لہجے میں بتایا کہ وہ جمائیکہ کی کال تھی۔

میں نے فوراً ریسیور اٹھالیا۔ میری ہیلو کے جواب میں ریسیور پر جمائیکہ کی گھبراہٹی ہوئی آواز ابھری ”یار! میں تو سمجھ رہا تھا کہ کوئی پھوٹی موٹی گڑبڑ ہوئی ہوگی مگر اخبار سے پتا چل رہا ہے کہ کل ادھر کوئی بہت بڑی مصیبت نازل ہوئی تھی۔ منیر بتا رہا تھا کہ میری دکان میں کچھ نہیں ہوا تھا۔ وہ واقعہ کافی دور پیش آیا تھا۔“

”منیر نے تم سے جھوٹ نہیں بولا۔ اب تم کیوں پریشان ہو۔“

”اتنی دوز ہونے والے واقعے سے تم نے کیسے اندازہ لگالیا کہ تمہارا متوقع چکر چل پڑا ہے۔“ اس نے مختاط لہجے میں پوچھا۔

”اس واقعے میں نیم گن استعمال کی گئی تھی جو عام طور پر نہیں ملتی۔“ میں نے زور دے کر کہا۔

”شاید تم مجھے بتا چکے ہو کہ نیم گن ہر آئی میں کا خصوصی ہتھیار ہوتی ہے مگر یہ بھی تو فرض کیا جاسکتا ہے کہ کسی اور نے کہیں سے وہ گن حاصل کر لی ہو۔ آج کل جدید اور حساس ہتھیاروں کا حصول کوئی بڑا مسئلہ نہیں رہا ہے۔“ وہ شتر مرغ کی طرح اصل خطرے سے بے خبر رہنا چاہ رہا تھا۔

”میں ضرور فرض کر لیتا لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ جس شخص نے نیم گن استعمال کی وہ کچھ دیر پہلے گولڈن فارمیسی سے ایک دوا خرید کر نکلا تھا۔“

”اے باپ رے!“ جمائیکہ کی بوکھلائی ہوئی اور بے ساختہ آواز ابھری ”تم میری دکان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ

چاہیے۔

غزالہ اپنی ساری ذہانت اور دلیری کے باوجود ایک خانہ دار عورت تھی۔ ویسے بھی کسی علاقے میں کسی عورت کا دیر تک منزلانا ہمارے معاشرے میں معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اس کام کے لیے دونوں میں سے کسی عورت کو باہر لانا ممکن نہیں تھا۔ لے دے کر اہل خانہ اور اس کے آدمی رہ جاتے تھے۔ اس سے گفتگو کے بعد ہی طے ہو گیا تھا کہ اس کے دو آدمی دکان کھلنے سے بند ہونے تک مسلسل باہر موجود رہیں گے۔ ان سے رابطے کے لیے مجھے ایک اپریٹس دے دیا گیا تھا۔

بازار کی بھیڑ بھاڑ میں ان دونوں کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ ٹرانسپیر بٹھ سے بات کرتے اس لیے ایمرضی کی صورت میں مجھے صرف بٹن دینا ہوتا۔ اپنے اپنے اپریٹس پر اشارہ پاکر وہ دکان کے سامنے پہنچ جاتے اور میرے اشارے کے مطابق اپنی کارروائی کا آغاز کر دیتے۔ اگر اشارہ ملنے کے بعد وہ مجھے کاؤنٹر کے پیچھے موجود نہ پاتے تو ان کو یہ اختیار دے دیا گیا تھا کہ وہ دکان میں گھس آئیں اور ہر قیمت پر مجھ تک پہنچنے کی کوشش کریں۔

اس بندوبست کے بعد مجھے پورا یقین تھا کہ مجھے کوئی بھی میری مرضی کے خلاف کہیں نہیں لے جاسکے گا۔

میں ان خیالات کی رو میں اخبار کا سرسری جائزہ لے رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ معمول کے مطابق میرے باہر فون اٹھایا اور کچھ وقفے کے بعد اندر آکر مجھے اطلاع دی کہ اس بار کوئی انگریزی بولی رہا تھا اور دکان کے مالک سے بات کرنے کا خواہاں تھا۔

میرا ہاتھ ٹھنک گیا۔ وہ کال میرے سننے دشمن کی بھی ہو سکتی تھی۔ اگر میرے خلاف اس کے تیور زیادہ نہیں بگڑے تھے تو سیاہ فام کے ابتدائی جائزے کے بعد ٹیلی فون ہی رابطے کا بہتر ذریعہ تھا۔

میرا اشارہ پاکر میرے کبین سے چلا گیا۔ قدرے توقف کے بعد میں نے رسیور اٹھایا تو منیر نے فوراً اپنا فون بند کر دیا۔

”ہیلو...! کون بول رہا ہے۔“ میرے کانوں میں ایک مردانہ آواز گونجی۔

منیر ایک مقامی سیلزن تھا اور اس کا ہر وقت مقامیوں سے رابطہ رہتا تھا۔ وہ زیادہ پڑھا لکھا بھی نہیں تھا۔ یہ غنیمت تھا کہ وہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی بول اور سمجھ لیتا تھا۔ اس کے لیے اتنا کافی تھا کہ اس نے اپنے مخاطب کی زبان پہچان کر مجھے بلا تاخیر اطلاع دے دی تھی۔ اس کے لیے بولنے والے کالب دلچہ غیر اہم تھا۔

میرے لیے ساری اہمیت لمحے کی تھی۔ وہ واضح طور پر

واقعہ اتنی دور پیش آیا۔ تم کو کیسے بتا چلا کہ نیم گن چلانے والا آدمی کون تھا اور کہاں سے آیا تھا۔“

”اب تم بلا وجہ پال کی کھال نکال رہے ہو۔ میں نے کوئی بات بلا وجہ نہیں کی تھی۔ اس شخص کا سلطان شاہ سے کراؤ ہوا تھا۔“

”میں پھر کہہ رہا ہوں کہ آثار اچھے نہیں ہیں۔ تم بھی پیچھے ہٹ جاؤ۔“

”میری فکر چھوڑ دو اور اپنا دل مضبوط رکھو۔ میں جبران ہوں کہ تم کچھ عرصے تک بکا رہ کر اتنے ڈر پوک ہو گئے ہو۔ پہلے تم بہت شہر دل ہوا کرتے تھے۔“

”میں اب بھی وہی آدمی ہوں۔“ اس نے دعویٰ کیا ”بے خبری میں آنے والی ناگہانی موت سے ڈرنا بزدلی نہیں ہے۔ آدمی کو اپنا دامن بچا کر چلنا چاہیے۔“

”شائاش!“ میں نے اس کا حوصلہ بڑھایا ”کوئی برا وقت آیا تو تم کو پہلے کی طرح مردانہ وار لڑنا ہو گا۔“

”اس کی تم پر وا نہ کرو۔ میں تم سے آگے ہی رہوں گا۔“ اس نے مجھے یقین دلایا اور پوچھا ”تم دکان کھلی رکھنے کے بارے میں سنجیدہ ہو۔“

”میری سنجیدگی کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہو گا کہ میں اس وقت یہیں موجود ہوں۔“

”مجھے اپنے اوپر شرم آ رہی ہے۔ تم میری جگہ لیے بیٹھے ہو اور میں گھر میں چھپا ہوا ہوں۔“

”میرے لیے یہی کافی ہے کہ تم اس طرح سوچ رہے ہو۔ اس وقت مصلحت کا یہی تقاضا ہے۔ میں تم پر کوئی احسان

نہیں کر رہا۔ میرا خیال ہے کہ تمہاری دکان پر بیٹھ کر میں اپنے دشمنوں کے لیے زیادہ مضبوط چوہے دان تیار کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔“

”تم سے بات کر کے میری الجھن دور ہو گئی ہے۔ میں تمہاری کامیابی کے لیے دعا کرتا رہوں گا۔“

”بی کر دغا نہ کرنا۔ ایسے دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔“ اس سے گفتگو ختم کرنے کے بعد میرے پاس پھر فرصت

ہی فرصت تھی۔ میں نے دوبارہ اشارہ سنبھال لیا۔

پچھلے روز سلطان شاہ نے دکان سے باہر ہر کر ایک نمایاں کارنامہ انجام دیا تھا۔ چرے کے ورم اور زخموں کی وجہ سے وہ اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ وہ ذمے داری انجام دے سکے۔ میں نے مدد کے لیے جلال کی پیشکش کو خاصی دشواری کے بعد ٹال دیا تھا لیکن وہ محفل برخاست ہونے کے بعد میں نے پوری سنجیدگی سے یہ ضرورت محسوس کی تھی کہ گولڈن فارمیشی سے باہر بھی کسی نہ کسی کو موجود رہنا

امریکی لب و لہجے میں بول رہا تھا۔ اس کی آواز پر غور کرتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ میرے کان اس کی آواز سے آشنا تھے۔ میں وہی یا اس سے ملتی جلتی آواز اپنے گھر کے اسپیکر فون پر سن چکا تھا۔

”میں اس دکان کا مالک بول رہا ہوں۔ کیا بات ہے؟ تم کون ہو؟“ وہ آواز پہچان لینے کے باوجود میں نے اپنے پہچان پر قابو پائے رکھا اور فون پر آواز بدل لی۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“ اس نے میرے سوال کو نظر انداز کر کے اپنا اگلا سوال داغ دیا۔

”جنگلیرا!“ میں نے اپنے دل کی تیز دھڑکنوں کے ساتھ جواب دیا۔ میں اس مرحلے پر اس سے الجھ کر فضا ملدہ نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔

میں اس کی پہلے سے سنی ہوئی آواز پہچان چکا تھا مگر وہ میری بدلی ہوئی آواز نہیں پہچان سکا۔ وہ اپنی دانست میں ایک نئے آدمی سے مخاطب تھا اس لیے اس نے اپنی آواز بدلنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

اپنے کسی ان دیکھے دوست یا دشمن کو پہچاننے کے لیے اس کی آواز سب سے زیادہ اہم ہوتی ہے۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ کاش پچھلے روز دکان میں آنے والے سیاہ فام نے گونگے پن کی ادکاری نہ کی ہوتی تو میں اس کی آواز سننے ہی سمجھ لیتا کہ وہ خود آئی مین تھا یا اس کا کوئی کارندہ تھا۔

دواؤں کی اس دکان میں گونگا بن جانا اس کی مجبوری تھی۔ وہ مقامیوں کی وضع قطع اختیار کر کے جاسوسی کرنے کے ارادے سے فارسی میں داخل ہوا تھا۔ دکان میں اپنی موجودگی کے جواز کے لیے اس نے ایک دوا کا قعدہ تھا ہوا تھا۔ اس کا خیال رہا ہو گا کہ دوا دے کر اس سے خاموشی سے دام وصول کر لیے جائیں گے۔ وہ بولنے کی زحمت سے دوچار ہوئے بغیر اپنا جائزہ مکمل کر کے واپس لوٹ جائے گا۔ یہ اس کی بد قسمتی تھی کہ اس کے ملنے کے تضاد کی وجہ سے میں اس کی طرف سے شک میں پڑ گیا اور اس سے گفتگو کا آغاز کر بیٹھا۔

میری وہ حرکت غیر متوقع تھی۔ وہ میری بات پر انگریزی میں کچھ کہتا تو اسی لمحے سب کی توجہ کا مرکز بن جاتا۔ ہم میں سے ہر ایک کے ذہن میں خیال ابھرتا کہ وہ غیر ملکی تھا تو ایک مقامی کاروبار دھار کر وہاں کیا کر رہا تھا۔

اس نے کوئی بھی خطرہ مول لیے بغیر بر جسگی سے خود کو گونگا اور بہرا ظاہر کیا اور بظاہر ہر کسی مشکل سے دوچار ہوئے بغیر دکان سے واپس لوٹنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ بعد کی بات تھی کہ اس نے اڑنگا کھانے کے بعد سلطان شاہ پر انگریزی

میں گرجنا پر سنا شروع کر دیا۔

”جنگلیرا! میں تم کو یہ بتانا چاہ رہا ہوں کہ تمہاری دکان میں بے ایمانی ہوتی ہے۔“ ریسپورپر اس کی آواز ابھری۔

مجھے گمان ہوا کہ اب وہ پچھلے روز زیادہ بیسوں کی وصولی کی شکایت کرے گا۔ میں نے اس کی آواز سے مرعوب ہوئے بغیر خشک لہجے میں کہا ”آواز سے تم غیر ملکی معلوم ہو رہے ہو۔ میرا خیال ہے کہ پچھلے کئی مہینوں سے ہم نے کسی انگریز یا امریکی کے ہاتھوں کوئی دوا نہیں بیچی۔ جب تم ہمارے خریدار نہیں ہو تو شکایت کس بات کی کر رہے ہو؟“

”چلو“ میں شکایت کی نہیں کرتا۔ ”اس نے یوں کہا جیسے میرا دل رکھنے کے لیے میری بات مان رہا ہو پھر بولا ”لیکن میں یہ کہوں کہ تم ہیروئن بیچتے ہو تو تمہارا جواب کیا ہو گا۔“

”تمہارا دماغ چل گیا ہے۔“ میں نے برہنہ سے کہا۔

”میری باتوں پر چراغ پا ہونے کی ضرورت نہیں۔ ٹھنڈے دل سے ان پر غور کرنے کی کوشش کرو۔ میں تمہارا دشمن نہیں دوست ہوں۔“

”دوست ایسی بے سرو پا شہزادی نہیں کیا کرتے جیسی تم کر رہے ہو۔“

”تم میری باتوں کو بے سرو پا قرار دے رہے ہو؟“ اس کی آواز اس بار حیرانہ سی تھی۔

”اور کیا قرار دوں؟“ میں نے بے ساختہ پوچھا ”تم کو دواؤں کی ایک صاف ستھری اور لائسنس یافتہ دکان میں ہیروئن کی نظر آ رہی ہے۔“

”اب نہیں تو نہ سہی۔ کبھی تو ہیروئن بھی بیچتے تھے۔“ وہ آہستہ آہستہ اپنے مطلب کی طرف آ رہا تھا۔

”میرے یا اپنے ماضی کو کریدنے کے بجائے یہ بتاؤ کہ اس وقت تم کیا چاہ رہے ہو۔“ میں نے سختی سے کہا۔

”میں نے کمانا کہ میں تمہارا دوست اور ہی خواہ ہوں۔ میں تمہارا برا نہیں چاہ سکتا۔“

”میرا خیال ہے کہ تم بالکل نارغ آدمی ہو اسی لیے گھما پھرا کر باتیں کر رہے ہو۔“

”تم ہیروئن فروشی سے اپنا تعلق تسلیم کرو، میں اپنے مطلب کی بات پر اجازت گا۔“

”میرا ہیروئن فروشی سے کبھی تعلق نہیں رہا۔ تم غیر ضروری باتیں کر کے میرا اور اپنا وقت برباد کر رہے ہو۔“

”یہ سفید جھوٹ مجھ سے نہیں چلے گا۔ میں تمہارے ماضی سے اچھی طرح واقف ہوں۔“

”واقف ہو تو ماننے انگریز بات کرو۔ فون پر کوئی اور بھی ہماری گفتگو سن سکتا ہے۔“ میں نے یوں ظاہر کیا جیسے میں

اپنے ماضی کے بارے میں اس کی دھمکی سے ڈر گیا ہوں۔

وہ میری بات سے محفوظ ہو کر دھیرے سے ہنسا پھر بولا ”تم کو اس بات پر یقین کر لینا چاہیے کہ میں تم سے زیادہ معزز اور معتبر ہوں۔ مجھے اپنی سلامتی بھی عزیز ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ میری اور تمہاری گفتگو کوئی تیسرا نہیں سن سکے گا۔“

”کیا تم نے ٹیلی فون پر کوئی آلہ لگایا ہوا ہے۔“ میں نے اپنے ذہن میں ابھرنے والے خیال کو ایک طنزیہ سوال کا روپ دے دیا۔

”یہ بہت حساس اور جدید آلہ ہے جسے سی ایس ڈی کہتے ہیں۔ اس کی بے مثال کارکردگی تمہاری کچھ میں نہیں آسکے گی۔“ اس نے مجھے مطمئن کرنے کے لیے راز کی ایک بات بہت آسانی سے اگل دی ”بس یہ سمجھ لو کہ کسی نے بھی ہماری باتیں سننے کی کوشش کی تو لائن خود بہ خود ڈراپ ہو جائے گی۔“

میں ایک گہرا سانس لے کر بولا ”یہ کہو کہ تم نے کچھ ناگفتہ موضوعات پر گفتگو کرنے کی پوری تیاری کر کے مجھے فون کیا ہے۔“

یہ سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے تھے کہ میری طرح وہ بھی ایک عدد سی ایس ڈی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ میں نے مختصر سا وہ آلہ ایک خزانہ بھارتی ایجنٹ سے حاصل کیا تھا۔ غالب امکان یہ تھا کہ اسے بھی وہ آلہ را کے کسی سینئر افسر نے تحفے میں دیا ہو تاکہ وہ پوری بے خوفی سے فون کو اپنے مذموم عزائم کے لیے استعمال کر سکے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ کراچی میں راجا کے سامنے آئے بغیر فون پر پورے اعتماد سے اپنا کام چلا آ رہا تھا۔

”کوئی بات ناگفتہ نہیں ہوئی۔“ اس کا لہجہ ناصحانہ ہو گیا ”ابھی میں صرف تمہاری بات کر رہا ہوں۔ میرے ماضی کے بارے میں سونگے تو تمہیں اپنے اوپر شرم آنے لگے گی۔ تم خود کو بہت بنایا پھر شاید فرشتہ سمجھنے لگو گے۔“

”شاید تم مجھے یہ جتنا چاہ رہے ہو کہ تم کوئی بدنام فونی ورتاقتل ہو۔“ میں نے کہا۔

”ضروری نہیں کہ ایک ہیروئن فروش سے برا آدمی قاتل ہی ہو۔ میں بادشاہ کبھی نہیں بنا مگر بادشاہ گر ضرور رہا ہوں۔ یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ ابھی تم میرے بارے میں پوچھنے کے بجائے اپنے بارے میں پوچھتے جانے والے سوالوں کے جواب دو۔ میں نے تمہیں پرکھ لیا تو پھر میں بھی کھل کر بات کروں گا۔“

”جب تک تم اپنے بارے میں کوئی اشارہ نہیں دو گے ات آگے نہیں بڑھے گی۔ میں اب جرم نہیں مٹانا چاہتا۔“

میں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

”تم مجھے جی لانڈ کا جانشین سمجھ سکتے ہو۔“ اس نے مجھ سے طویل تر سکوت کے بعد جواب دیا ”اب بتاؤ کہ تمہارا ہیروئن سے تعلق رہا ہے یا نہیں؟“

”تم نے سوال بدل دیا۔ ہیروئن فروش میں، میں کبھی ملوث نہیں ہوا۔ ہیروئن سے میرا تعلق ضرور تھا۔ تم نے جی کا نام لیا ہے تو تم کو میرے اس اقرار کا پس منظر بھی معلوم ہو گا۔“

”پس منظر سے آگاہ ہونے کے بعد ہی میں نے تم سے بات کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ مجھے اپنے اعتماد کے پرانے ساتھیوں کی تلاش ہے۔“

”میں جس دلدل سے بہت مشکل سے نکلا ہوں اس میں دوبارہ گرنا نہیں چاہتا۔“

”یہ فیصلہ میں خود کروں گا کہ تم خود دلدل سے نکلے تھے یا تمہیں نکال پھینکا گیا تھا۔ تم بس جواب دیتے رہو۔ نتیجہ میں خود اخذ کروں گا۔ یہ بتاؤ کہ تم کسی فرد کے وفادار تھے یا تنظیم کے!“

”فرد آتے جاتے رہتے ہیں۔ تنظیمیں مدتوں چلتی ہیں۔“ میں نے کہا ”میرا بعد تنظیم کے ساتھ تھا۔“

”پھر تم نے جی کے بعد تنظیم کو کیوں چھوڑ دیا؟“ اس نے سوال کیا۔

”تم گڑے مروے کیوں اکھاڑ رہے ہو؟“ میں نے ہلکی سی ناگوار سی کہا ”اپنی بات اپنے مطالب تک محدود رکھو۔“ میں اس سے تاثر دینا چاہ رہا تھا کہ ماضی کے حوالے سے میں اس سے بات کرنے پر آمادہ ضرور ہو گیا تھا مگر اس سے مرعوب نہیں تھا۔

اس نے خود کو جی کا جانشین قرار دے کر مجھے اپنا منصب سمجھانے کی کوشش کی تھی مگر میں اس کی طرف سے انجان بنا رہا۔ میں دلی دلی میں فیصلہ کر چکا تھا کہ جب تک وہ خطرہ کرشی اور آئی مین کے الفاظ استعمال نہیں کرے گا، میں اس سے برابری کا رویہ اختیار کیے رہوں گا۔

”یہ گڑے مروے نہیں ہیں بہت اہم اور کلیدی سوال ہیں۔“ اس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا ”تم میرے سوالات کا تسلسل بگاڑ رہے ہو۔“

”میں رپوٹ نہیں ہوں جو تمہاری مرضی کے مطابق چلتا رہوں۔ میرے اپنے تحتفظات ہیں۔ میں ان کے منافی نہیں جاسکتا۔ اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ تم مجھے بلیک میل کر کے اپنا ساتھ دینے پر آمادہ کر لو گے تو یہ تمہاری سنگین بھول ہے۔ میں جیلے اور بھٹنے والے لوگوں میں سے نہیں

ہوں۔“

”میں پوچھ رہا تھا کہ تم تنظیم کے وفادار تھے تو پھر اسے کیوں چھوڑ دیا؟“

”میں دلہل میں گردن تک غرق ہوتا چلا گیا مگر ساتھ دیتا رہا۔ جی کے بعد آنے والوں کا ساتھ دیا مگر وہ ایک ایک کر کے مارے گئے اور پھر میں اکیلا رہ گیا۔“

”آئی مین مارے گئے مگر تم بھی بڑے تھے۔ تم نے میدان کیوں چھوڑ دیا؟“ اس نے مجھے اُسکیا۔
”میں کبھی بھی ڈوبنے والے جہاز کا سوار نہیں رہا اس لیے آج زندہ ہوں۔“

میرے دروازے پر آکر حیرت سے اندر جھانکا اور خاموشی سے واپس چلا گیا۔ اسے امید نہیں رہی ہوگی کہ میرے لیے آنے والی وہ کال اتنی طویل ہوگی۔
”تم چاہتے تو اس شہر میں شی کا وجود پاتی رکھ سکتے تھے۔“
آخر کار وہ حسرت کے ساتھ شی کا نام لینے پر مجبور ہو گیا۔

”میں یہاں خود مختار نہیں تھا۔ بڑوں سے ہدایات لیتا تھا۔ بڑوں پر زوال آیا تو چھوٹوں نے مال کی آس میں میرا پیچھا لے لیا۔ میں مجبور ہو کر روپوش ہوا تھا۔“
”شی کے اس زوال کا ذمے دار تمہارا دوست ڈینی تھا۔“ اس کی آواز بچ ہو گئی۔

”کچھ نہ کچھ ذمے دار وہ بھی تھا مگر وہ اتنا طاقت ور نہیں تھا کہ شی کو ڈوب دیتا۔ شی کے بڑوں نے اپنی ناکامیوں کی پردہ پوشی کے لیے اسے ایک ہوا بنا دیا۔ وہ میرا سہاٹی تھا۔ میں نے بہت قریب سے اس کے کس بل دیکھے ہیں۔ وہ چھپ کر وار کرنے والوں میں سے ہے۔“ اس نے سامنے جم کر مقابلہ کرنا اس کے بس سے باہر ہے۔“

”تم اس کے دوست ہو کر ایسا کہہ رہے ہو۔“ دوسری طرف سے تھیرزدہ آواز آئی۔ اس نے اپنے ذرائع سے جھانگیر کے بارے میں جو معلومات یک جا کی ہوں گی ان کی روشنی میں اسے میرا وہ تبصرہ بہت بے جوڑ اور چونکا دینے والا محسوس ہوا ہوگا۔

”میں اسے آج بھی اپنا دوست کہتا ہوں مگر اس سے الگ اور ہوشیار رہتا ہوں۔“

”تم اس کے بارے میں عجیب باتیں کر رہے ہو۔ میں تمہارے اس رویے کا سبب جان سکتا ہوں۔“
”وہ کیا انا پرست ہے۔ اپنے سامنے کسی کو کچھ نہیں گردانتا۔ شی کو عادی دوستوں سے وفا نہیں کی۔“
”تمہارے ساتھ اس نے کیا زیادتی کی؟“ اس نے جتنی آہستہ ہمدردی کے ساتھ سوال کیا۔

وہ موقع غنیمت تھا۔ لوہا گرم تھا۔ میں مناسب ضرب لگا کر اسے اپنی مرضی کے مطابق ڈھال سکتا تھا۔ میں نے آزر دگی سے جواب دیا ”یہ پوچھو کہ کیا رہ گیا۔ اس کی زیادتی کا بدلہ میں اس کی عورت سے ضرور لوں گا۔ وہ شی کا بھائی میرا ہو سکا۔ اس کا وقت جلد ہی پورا ہونے والا ہے۔“

میں نے کچھ نہ کہتے ہوئے بھی اسے بہت کچھ بتا دیا تھا۔ میرے الفاظ سے اس نے ایک ہی نتیجہ اخذ کیا ہوگا کہ ڈینی نے جھانگیر کی بیوی کو اور غلانے کی کوشش کی ہوگی۔ یہ زخم ایسا ہوتا ہے جو کبھی مندمل نہیں ہوتا۔ زخم کھانے والا کچھ کر سکتا ہے نہ کسی سے کہہ سکتا ہے۔ سارا دکھ اپنی ذات میں جھپکتا ہے۔ اس کا دماغ ایک ہی ہوتا ہے کہ کبھی مقدر یاوری کرے اور داؤ چل جائے تو وہ بھی وہی کچھ کر گزرے جو اس کے ساتھ کیا گیا تھا۔ وہ جھانگیر اور ڈینی کی ظاہری دوستی اور پس پردہ پر خاش کا مضبوط ترین جواز تھا جس پر وہ شبہ نہیں کر سکتا تھا۔

”میں تمہارا زخم نہیں کر دیتا۔“ اس نے جتنی اس کا جواب حاصل کرتے ہی اس نے گفتگو کا رخ یکایک موڑ دیا ”تم بتا رہے تھے کہ تم نے لیروں سے محفوظ رہنے کے لیے مجبوراً روپوشی اختیار کی تھی۔“

”شی کا سفینہ ڈوب رہا تھا۔ ہوا خیزی کے اس دور میں لوٹ مار شروع ہو گئی جس کے ہاتھ جو لگاؤ لے لے گا۔“
”کروڑوں کا دھندا یکایک ڈوبتا ہے تو یہی افراطی تقریر دیکھنے میں آتی ہے۔“ اس کی آواز متاثرانہ ہو گئی ”کچھ نہ کچھ تمہارے ہاتھ بھی لگا ہوگا۔“

”بس پارسانی کی قسم نہیں کھا سکتا۔ لوٹ کے مال میں حصہ بنایا ہوا تو آج گزارے کے لیے میڈیکل اسٹور نہ چلا رہا ہوتا۔ میں آخر تک شی کا وفادار رہا تھا۔“

”اور اب شی کے لیے تمہاری سوچ کیا ہے؟“
”جب شی کا وجود ختم ہو گیا تو میری سوچ بھی ختم ہو گئی۔ میں نے اپنی نئی زندگی سے کچھ نہ کیا ہے۔“

”تم بھول رہے ہو کہ شی ایک عالم گیر تحریک ہے۔ یہاں اس کی سرگرمیاں ختم ہو گئیں مگر دوسرے ملکوں میں وہ آج بھی کام کر رہی ہے۔“

”میں یہاں رہتا ہوں۔ یہاں کی بات جانتا ہوں۔ جی امریکا میں نقل ہوا۔ اس کے جانشین یہاں مارے گئے۔“ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ مجھے گھیر کر کہاں لانا چاہا رہا تھا۔ شاید ان ہی حیلوں سے اس نے جوشی کو رام کیا تھا۔ وہ یہ جاننے کا خواہاں تھا کہ شی دوبارہ ابھری تو میرا کوار کیا ہوگا۔ اسے اپنے چال میں پھانسنے کے لیے ضروری تھا کہ میں اسے اپنی حمایت کا

یقین دلاتا مگر اس کا اضطراب محسوس کر لینے کے بعد مجھے اس یقین دہانی کی غلت نہیں تھی۔

”تمہاری ہر بات درست ہے مگر پھر بھی میں جانا چاہتا ہوں کہ شی کو دوبارہ زندگی دینے کے لیے تم کیا کر سکتے ہو؟“

”میں ایک کارکن تھا۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔ اس بڑے کام کا بیڑا کوئی آئی مین ہی اٹھا سکتا ہے۔“

”تم کو اندازہ نہیں ہے کہ اس وقت تم کس سے بات کر رہے ہو۔“ وہ کھلے پر مجبور ہو گیا ”یہاں شی کا نام دوبارہ چمکے گا۔ میں سلور آئی کے ساتھ یہی قصد لے کر یہاں آیا ہوں۔“

”اوہ! تو تم آئی مین ہو!“ میں نے تحیر اور خوف سے دہرایا۔

”میں نے تم سے بلاوجہ اتنی لمبی جرح نہیں کی۔ تمہارے جواب سن کر میں نے تمہارا دماغ بڑھ لیا ہے۔ اندر سے تم آج بھی شی کے وفادار کارندے ہو۔ مجھے اپنا کام آگے بڑھانے کے لیے تمہاری اور تم جیسے دوسرے ساتھیوں کی اشد ضرورت ہے۔ میری ٹیم بن جائے تو پھر میں تمہیں اپنے کمال دکھاؤں گا۔“

”اس کے ساتھ تمہیں ڈینی کو اپنے راستے سے ہٹانا ہوگا۔“ میں نے پر خیال لہجے میں کہا۔ اس بار میری آواز احترام آمیز تھی۔

”اس کے بارے میں تمہارا تجربہ سو فیصد درست ہے۔“ اس نے منافقت سے کام لیتے ہوئے کہا ”اسے کوئی دل بلا خود ٹھکانے لگا دے گا۔ ہمیں اس پر اپنی توانائیاں برباد کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کسی وقت تم ہی یہ کام کر گزرو۔“

اس کی خوش فہمی پر میں دل ہی دل میں ہنس کر رہ گیا۔ میں نے سنجیدگی سے پوچھا ”کیا تم نے ہیروئن کی بات اسی لیے چھٹی تھی۔“

”وہ ہماری شہ رگ ہے۔ وسائل کے بغیر کوئی تنظیم زندہ نہیں رہ سکتی۔“ اس نے کھل کر جواب دیا۔

”اس بارے میں تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“ میں نے عاجزانہ لہجے میں پوچھا۔

”میں تمہاری تعاون کی یقین دہانی درکار ہے۔ تمہاری آواز سے اندازہ ہو رہا ہے کہ تم اپنے آئی مین کو کبھی مایوس نہیں کرو گے۔“

”جی پوچھو تو یہ میرے لیے بہت بڑا اعزاز ہے کہ میں ایک آئی مین سے ہم کلام ہوں۔ میں اپنی ان سچ کلامیوں پر تم سے معافی چاہتا ہوں جو تمہارے تعارف سے پہلے میں کر گزرا

ہوں۔“

”بس آئندہ شکایت کا موقع نہیں دینا۔ وفا کرو گے تو سرا سرفاندے میں رہو گے۔“

”مگر میری ایک التجا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ تم اسے نظر انداز نہیں کرو گے۔“ میں نے لججائی ہوئی آواز میں کہا۔

”کہہ ڈالو۔ میں سن رہا ہوں۔“ اس کی آواز نخوت آمیز ہو گئی۔

”میں یہ یقین کرنا چاہتا ہوں کہ میں دھوکا نہیں کھا رہا۔ صحیح آدمی سے وفاداری کا اظہار کر رہا ہوں۔“

”کیا یہ کافی نہیں ہے کہ میں خود تم سے باتیں کر رہا ہوں۔“ اس نے ہلکی سی تیزی کے ساتھ پوچھا۔

”شی کے اندرونی حالات سے واقفیت رکھنے والا کوئی بھی آدمی یہ سب باتیں کر سکتا ہے۔“ میں نے عاجزی سے کہا

”میں زخم خوردہ ہوں۔ برے دنوں میں شی کے نام پر میں نے بہت کچھ کھویا ہے۔ میرے بارے میں بیسیوں سوال کر کے تم نے اپنا اطمینان کر لیا۔ اب میری تسلی بھی کرا دو۔ میں شی کے نام پر دوبارہ دھوکا نہیں کھانا چاہتا۔“

”میرے سوا یہ باتیں اور ان میں نہاں سچ جھوٹ کون بول سکتا ہے۔“ اس کی آواز میں مزید تیزی آئی۔

”دیکھو، تم ناراض ہو رہے ہو۔“ میں گڑ گڑایا ”ڈینی بد معاش ہے۔ وہ بھی میرے ساتھ ایسی باتیں کر سکتا ہے۔“

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم کیا کہنا چاہ رہے ہو۔“ اس کا پارا بتر توجہ ہٹا جا رہا تھا۔

”میں اپنا اطمینان کرنا چاہتا ہوں کہ میری منافقت شی کے حقیقی آئی مین سے ہوئی ہے۔“ میں نے اس کے چڑھتے ہوئے پارے کو کیلر نظر انداز کر کے اپنا التجائیہ لہجہ برقرار رکھا۔ ابتدا میں وہ میرے ساتھ کھیل رہا تھا۔ اس وقت میں نے اس کے ساتھ کھیلنا شروع کر دیا تھا۔

”میں اب بھی یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ تمہارا اطمینان کیسے ہوگا۔“ اس بار وہ باقاعدہ غرایا تھا۔

”مجھے اپنی قدم بوسی کا ایک موقع دے دو۔۔۔“

اس نے میری بات درمیان سے اچک لی ”یہ نہیں ہو سکتا۔ ابھی ابتدا ہے۔ حالات غیر یقینی ہیں۔ میں کسی سے نہیں مل سکتا۔“

”تم بلیک کوئین کی طرح نقاب پہن کر اپنا چہرہ چھپا سکتے ہو۔ میں صرف سلور آئی دیکھنا چاہتا ہوں۔ تمہاری ہٹیل پر

سلور آئی دیکھ کر میں اپنے کانوں سے ایک بار تمہاری آواز سن لوں گا تو پھر عمر بھر تمہارا غلام رہوں گا۔ مجھ سے لغزش یا خطا ہو تو مجھے گولی مار دینا۔“

ہوئے کہا ”مگر کبھی اس سے ملنے یا اسے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ اخباروں میں اس کی اشتہاری تصویریں دیکھی ہیں۔“ میں نے اس کے اندازے کی تصدیق یا تردید کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

”ذہنی تمہارا غدار دوست ہے تو تم اس کی خبری کیوں نہیں کر دیتے۔“ یکایک اس نے سوال کر دیا ”ان دونوں کی گرفتاری یا کامیاب خبری پر بڑے بڑے انعام مقرر ہیں۔ تمہیں ڈسے جانے کی غلط سبب ہمیشہ کے لیے نجات مل جائے گی۔“

وہ اپنا دامن بجا کر نہایت بالواسطہ طور پر مجھے اس کام کے لیے اکسارہا تھا جس کے لیے اس نے ساری خواری مول لی ہوئی تھی۔

”میں نے اس بارے میں کئی بار سوچا ہے مگر میں اپنے اندر اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے کی ہمت نہیں پاتا۔“ میں نے سمجھتے ہوئے اسے آگاہ کیا ”ذہنی بہت چالاک اور مکار ہے۔ وہ کسی کو اپنے ٹھکانے کی ہوا نہیں لگنے دیتا۔ ذرا بھی شبہ ہو جائے تو جگہ بدل لیتا ہے۔ اس پر میرا وار اوچھا پڑا تو وہ مجھے پیس کر رکھ دے گا۔“

”میں تمہارے دل میں بھڑکتی ہوئی انتقام کی آگ کی پیش اپنے سینے میں محسوس کر رہا ہوں۔ ضروری نہیں کہ تم اس کا چھپا کر۔ اسے دھوکے سے اپنے گھر بلاؤ اور مجھے خبر دے دو۔ میں اس کا ایسا بندوبست کروں گا کہ وہ زندہ نہیں نکل سکے گا۔“

”بلانے سے وہ کبھی نہیں آتا۔“ میں نے مایوسانہ لہجے میں جواب دیا ”توقع کے خلاف اپنی مرضی سے آجاتا ہے اور پھر اچانک ہی جیل دیتا ہے۔“

”وہ تمہاری غیر حاضری میں بھی تمہارے گھر آتا ہوگا۔“ اس موضوع میں اس کی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔

”مجھے اس کا علم نہیں ہے۔“ میں نے مبہم سا جواب دے کر اسے بولنے کا مزید موقع فراہم کر دیا۔

”اس پر نگاہ رکھو اپنی بیوی کو اعتماد میں لو۔ اسے گھر کی تباہی سے ڈراؤ، دھمکاؤ۔ تمہاری زندگی سے اس فتنے کا خاتمہ لازماً ضروری ہے۔“ اس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر پر جوش لہجے میں کہا ”تم میرے ساتھ ہو اور اب میں تمہارے ساتھ ہوں۔“

”کاش ہماری یہ امیدیں پوری ہو سکیں۔“ میں نے حسرت سے کہا ”بس تم میری التجا قبول کرلو۔ میں بے چوں و چرا تمہاری ہر بات مان لوں گا۔“

”اس پر میں غور کروں گا اور تمہیں بتاؤں گا۔“ اس کی

”بہت عجیب مطالبہ ہے تمہارا۔ مجھ سے آج تک کسی نے ایسی بات نہیں کی۔“ اس کی آواز کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ ”کتنی میں اختیار کسی فرد کی ذات میں نہیں، سطور آئی ہیں ہوتا ہے۔ اس سے ابھی چہوں کو نئی پہچان ملتی ہے۔ گئے دنوں میں مجھے یہی کچھ بتایا گیا تھا اور اب میں اسی پر عمل کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے تم پر بے اعتمادی نہیں ہے اپنے اوپر یقین نہیں ہے کہ میں کہیں فریب نہ کھا جاؤں۔“

میری عاجزانہ بات بہت اصولی تھی۔ محض آواز اور دنگ لہجے کی بنا پر کسی پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ایک بار اس کی شناخت بہت ضروری بلکہ ناگزیر تھی۔ میں اپنے حریف کے ان ہی کمزور ترین لحاظ کے انتظار میں جمائیکرتی تھیں۔ سنبھالے بیٹھا تھا۔ اگر وہ مجھے اپنے ساتھ ملانے کے بارے میں سنجیدہ تھا تو وہ میرا مطالبہ پورا کرنے پر مجبور تھا۔ ایک بار وہ مجھ سے ملنے پر رضامندی ظاہر کر دیتا تو پھر میں اس کی کھال میں ٹھس بھروانے کا معقول بندوبست کر سکتا تھا۔ جب تک اس نے ایک سائے اور آواز کا روپ دھارا ہوا تھا، سب مل کر بھی اس کا کچھ نہیں لگاؤ سکتے تھے۔

”تم نے کبھی بلیک کوئین کو دیکھا تھا۔“ طویل اور معنی فرسکوت کے بعد اس کی آواز ابھری۔

”وہ جب چاہتی تھی اچانک کہیں بھی ہمارے سامنے نمودار ہوتی تھی اور اپنا فریاد سنا کر کسی چھلاوے کی طرح گڑبڑوں میں مدغم ہو جاتی تھی۔“

”مجھے اس کی مدح سرائی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں پوچھ رہا تھا کہ تم نے بھی اس کا چہرہ بھی دیکھا ہے۔“ ”کبھی نہیں۔“ میں نے سفید جھوٹ بولا ”وہ ہمیشہ سر سے بلیک سیاہ نقاب اور چست کپڑوں میں غرق ہوتی تھی۔“

”تمہیں معلوم ہے کہ وہ کون تھی؟“ اس نے تحقیر آمیز لہجے میں سوال کیا تھا۔

”کہا جاتا ہے کہ وہ جی لائٹنگ کی ناجائز اولاد تھی۔ ذہنی نے ساتھ اس کا نام اکثر سننے میں آتا رہا ہے مگر ذہنی نے کبھی اسے اس سے نہیں ملوایا۔“

”وہ بد نیت آدمی ہے۔“ آئی مین نے میرا شکوہ سن کر کہا ”مگر میرا اندازہ غلط نہیں تو اس نے تمہاری عورت کو بہکایا یا غلامی ہوگا۔ ایسے گمراہ لوگوں کی نیت میں کھوٹ ہوتا ہے۔ دوسروں پر اعتبار نہیں کرتے۔ اپنی عورتوں کو دوسرے دلوں کی نگاہوں سے دور رکھتے ہیں۔ ویرا صرف عورت بس ایک فتنہ ہے اور ذہنی کی داستانہ بنی ہوئی ہے۔“ ”میں یہ سب سنتا رہا ہوں۔“ میں نے اقرار کرتے

آواز میں ایک بار پھر واضح تبدیلی رونما ہو گئی۔

”میں تم سے کہاں مل سکوں گا؟“ میں نے پر اشتیاق لہجے میں کہا۔

”میرا رتبہ ڈینی سے بہت بلند ہے۔ اپنے ٹھکانے سے بس میں خود واقف ہوتا ہوں۔“ اس کی پر غور آواز میرے پردہ سماعت سے نکلائی ”ابھی میں نے تم سے ملنے یا نہ ملنے کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے اس لیے تمہارا سوال قبل از وقت ہے۔“

”اگر تمہارا فیصلہ مثبت ہوا تو مجھے کچھ نہ کچھ جاننے کا شرف ضرور حاصل ہو جائے گا۔“

”آئی مین پہاڑی عقاب ہوتے ہیں جو اونچی اور کھلی چٹانوں پر بسیرا کرتے ہیں جہاں دور دور تک کچھ نہیں ہوتا۔

میں چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر تمہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کر دوں گا۔ مانا ہوا تو دن، وقت، جگہ اور طریقے کے بارے میں تمہیں پہلے سے کچھ نہیں بتایا جائے گا مگر ملاقات ہو جائے گی۔“

”میں سچے دل سے اس مبارک وقت کا انتظار کروں گا۔“ میں نے پتلی بار پورے خلوص سے کہا۔

دوسری طرف سے بائیں کمرہ کراچانک فون بند کر دیا گیا۔

میں نے خالی الذہنی کے سے عالم میں فون کارمیوور کریڈل پر رکھ دیا۔

اس وقت جو کچھ ہوا، وہ میری توقعات اور اندازوں کے بالکل برعکس تھا۔ میں نے یہ سوچ کر گولڈن فارمیسی میں جہانگیر کی جگہ لی تھی کہ آئی مین میرا سراغ لگانے کے لیے جہانگیر کو اغوا کرنے یا دہشت زدہ کرنے کی کوشش کرے گا جس میں تشدد کے عنصر کا شامل ہونا یقینی تھا۔ یہ کام وہ مصروف بازار میں دکان پر نہیں کر سکتے تھے۔ اپنے مطلوبہ نتائج کے حصول کے لیے انہیں جہانگیر کو ہلا پھسلا کر دکان سے ہٹانا اور کہیں لے جانا پڑتا۔

جہانگیر کی جگہ لینے کے بعد میں اسی نوعیت کے کسی واقعے کے انتظار میں تھا لیکن آئی مین کی اس لمبی کال نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ اپنی سطحی سوچ کے ذریعے عارضی نتائج حاصل کرنے والوں میں سے نہیں تھا۔ اس نے بیدار مغزئی کے ساتھ لمبی مدت کی منصوبہ بندی کی ہوئی تھی۔

اس کا اصل ہدف جہانگیر کی ذات تھی۔ اس نے مارپیٹ اور تشدد سے اسے مجبور کرنے کے بجائے مکاری سے اس کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اپنی پوری

گفتگو میں اس نے شی کے احیا کو موضوع بحث بنائے رکھا تھا۔ میری یعنی ڈینی والی بات کو ضمنی حیثیت دے دی تھی۔

اس سے گفتگو کو آگے بڑھانے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی۔ میں نے ابتدا میں ہی اندازہ لگایا تھا کہ جہانگیر اور اس کی مصروفیات کے بارے میں آئی مین کی معلومات کتابی حد تک محدود تھیں۔ وہ پاکستان میں نووارد تھا اور وہی کچھ جانتا تھا جو اسے شی کے ریکارڈ سے دستیاب ہو سکا تھا یا پھر اسے جوشی نے بتایا ہو گا۔

جوشی خود گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہا تھا اور باہر کے حالات سے زیادہ باخبر نہیں تھا۔ ویسے بھی ہم لوگوں میں سے کوئی شہر کے ہٹلوں اور تقریح گاہوں میں جانے کا عادی نہیں تھا۔ اس وجہ سے ہمارے حلقے سے باہر کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ ہمارے مراسم کس نوعیت کے ہوں گے۔

میں نے آئی مین کی ناقص معلومات سے پورا پورا فائدہ اٹھایا تھا۔ گفتگو کے دوران جہاں بھی موقع ملا، میں نے اپنے فرضی واقعات شامل داستان کر دیے جو میرے اور جہانگیر کے درمیان وسیع ذہنی سطح بلکہ کینے کی نشان دہی کر رہے تھے۔ آئی مین میری ان باتوں کے چکر میں آ گیا تھا۔ کم از کم اس وقت اسے یقین آ گیا تھا کہ جہانگیر ڈینی کا بہرہ ور نہیں تھا۔ اسے ذرا سی مضبوط پشت پناہی میسر آ جاتی تو وہ میرے یعنی ڈینی کے دشمنوں سے مل کر اس کے کریا کرم کا بندوبست کر سکتا تھا۔

آئی مین واقعی تیزی و کھارہا تھا۔ پچھلے روز اس کے بھیجے ہوئے آدمی نے ذاتی طور پر گولڈن فارمیسی کا جائزہ لیا تھا اور چوبیس گھنٹوں سے کم مدت میں آئی مین نے مجھ سے فون پر رابطہ کر لیا تھا۔ مجھے توئی امید تھی کہ وہ ملاقات کے لیے مجھے زیادہ انتظار میں مبتلا نہیں کرے گا۔ چوبیس گھنٹوں سے بھی کم مدت میں اس کی اگلی فون کال متوقع تھی۔

میں نے کرسی چھوڑی اور کہیں سے نکل کر شلتا ہوا دکان کے دروازے پر آکر کھڑا ہوا۔ میری نگاہیں فٹ پاتھ پر رواں انسانی بھیڑ میں سیاہ فام غیر ملکی کی تلاش میں بھٹک رہی تھیں۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ آئی مین نے کسی نہ کسی کو دکان کی نگرانی پر مامور کیا ہوا ہو گا۔ اس کی طرف سے دکان میں میری آمد اور موجودگی کی تصدیق ہونے کے بعد ہی اس نے گولڈن فارمیسی فون کیا ہو گا۔

انسانیت کے دشمنوں کے خلاف جاری اس جنگ کے باقی واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں

کے گاہک آکر اپنی بولیاں بولتے ہیں۔ ہر گاہک سے مختلف انداز میں، اس کی طلب یا ضرورت کے بارے میں بات کرنے سے دکان میں کام کرنے والوں کا دل بہلتا رہتا ہے۔ بازار میں مندی کا رجحان ہو تو دلچسپی مفقود ہو جاتی ہے۔ دکانوں والے اپنا دل بہلانے اور وقت گزارنے کے لیے اپنے پڑوسیوں سے گپ شپ اور چٹخ شروع کر دیتے ہیں۔ ایک دوسرے کی ٹانگ بھینچتے ہیں اور خوش رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی لیے کسی لفظاً نہ کہا ہے کہ ہر اچھا دکان دار ایک اچھا فقیر ہے باز ہوتا ہے۔ وہ کوئی تنگن دل آزاری کے بغیر اپنے مخاطب کو پسپائی پر مجبور کرنے کے فن میں طاق ہوتے ہیں۔ گاہک کی جھلک نظر آتے ہی وہ اپنی ان خوش گہیوں کا سلسلہ یک لخت موقوف کر کے، پوری شبیدگی سے اپنے دھندے کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔

گولڈن فارمیسی جیسی اوسط درجے کی دکانوں میں پڑوسیوں سے آزادانہ اختلاط کا موقع نہیں ہوتا۔ دکان دار اپنے ملازمین پر پھبتیاں کس کر اپنا دل بہلاتا رہتا ہے۔ بے چارے ملازمین نظریۂ ضرورت کے تحت کھسیں نکالنے اور ہر دوسرے جانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ جب اس شغل میں جان میں رہتی تو دکان دار اپنا ٹھٹھا چھوڑ کر، کسل مندانہ انداز میں چل کر ادھر ادھر نظر میں دوڑاتے ہوئے خود کو نازہ دم کر لیتا ہے۔

اس وقت میرا انداز ایسے ہی کسی تھکے اور اکتائے ہوئے دکان دار جیسا تھا۔ باہر سے دیکھنے والا کوئی اجنبی یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ میں فارمسی کے دروازے پر کھڑا کر رہا کیوں کے نجوم میں کسی مشتبہ شخص کو تلاش کر رہا تھا۔

اپنی اداکاری میں حقیقت کا مزید رنگ بھرنے کے لیے میں نے اپنے بچوں کے بل اچک کر دونوں ہاتھ سر سے اوپر اٹھائی لی۔ میری اس حرکت کو بینک کی تحسین دینے کا ایک بھونڈا انداز سمجھا جاسکتا تھا لیکن بچوں کے اچکتے ہی یکایک میری نگاہوں کی رسائی میں کچھ اضافہ کیا۔ مجھے فٹ ہاتھ پر رواں بھیر میں چند ٹانیوں کے لیے شاسا اور سیاہ فام چہرہ نظر آیا۔ وہ مجھ سے کافی دور تھا اور میں اس کی طرف ہی نظر کرتا تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ میں نے بے ہوش و حواس کے ساتھ اسے دیکھا تھا لیکن وہ چند یوں سے زیادہ میری نگاہوں کی گرفت میں نہیں رہ سکا۔ اسی اور طے چلے چروں کی بھیر میں یکایک ابھرا اور پھریوں دم ہو گیا جیسے اس کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں تھا۔

میں اس کی ایک جھلک دیکھ کر مضطرب ہو گیا۔ انگڑائی اور اداکاری کو بھول بھال کر بار بار بچوں کے بل اچک کر اسے دوبارہ دیکھنے کی کوشش کرنے لگا مگر وہ کسی چھلاوے کی طرح مقامی چروں کی بھیر میں گم ہو چکا تھا۔

وہ گولڈن فارمیسی پر دو خریدنے کے لیے آیا تو گولڈن اور بہرا بن کر، قمیص اور شلوار میں لمبوس ہو کر آیا تھا۔ اس کی آنکھوں پر لگی ہوئی شفاف عدسوں کی عینک اسے دوسروں سے ممتاز کر رہی تھی ورنہ وہ اپنی وضع قطع سے مکمل طور پر کوئی مقامی کمرابی معلوم ہو رہا تھا لیکن اس وقت وہ مجھے ایک نئے روپ میں نظر آیا تھا۔ میں نے صرف لمحہ بھر کے لیے اس کی جھلک دیکھی تھی لیکن مجھے اپنی پہچان پر پورا اعتبار تھا کہ میں نے جو کچھ دیکھا، اس میں کسی غلطی کا امکان نہیں تھا۔

وہ چہرہ ہو یہ ہو دی تھا جو میں پہلے دیکھ چکا تھا مگر اس کی شفاف عدسوں کی عینک تبدیل ہوئی تھی۔ اگر وہ عینک استعمال کرنے پر مجبور نہ ہوتا تو شاید اپنے حیلے میں تبدیلی لانے کے لیے اسے سرے سے ترک کر دیتا اور پھر اسے پہچانا بت زیادہ مشکل ہو جاتا۔ وہ ایسا نہیں کر سکا تھا۔ میں نے پہلی نظر میں اسے پہچان لیا تھا۔

اس وقت میں اس کی صحت مند گردن کے گرد کے ہوئے کار کے نیچے منہ می ہوئی ٹائی دیکھ چکا تھا۔ یہ بات یقینی تھی کہ اس نے شلوار کے بجائے پتلون پہنی ہوئی ہوگی۔ اپنی اس جھلک میں وہ سو فیصد غیر ملکی بلکہ امریکی نیکو نظر آیا تھا۔

وہ گولڈن فارمیسی میں اداکاری کر کے خاموشی سے لوٹنے میں کامیاب ہو گیا ہوتا تو میں اس کے بارے میں ہمیشہ تذبذب کا شکار رہتا۔ دکان سے نکلنے کے بعد، سلطان شاہ سے ہونے والے تصادم نے اس کے بارے میں بیک وقت کئی باتیں واضح کر دی تھیں۔

اس نے سلطان شاہ سے جھگڑے کے دوران میں بے ساختہ انگریزی زبان میں گالیاں دی تھیں اور حمایت روائی سے مسلسل وہی زبان استعمال کی تھی پھر خلیہ سر پر منزلانا دیکھ کر اس نے اچانک بزم گن نکال کر چلا دی تھی۔

یہ بات طے ہو چکی تھی کہ وہ امریکی نژاد کالا تھا جو اپنے مذموم مقاصد کے حصول کے لیے کراچی آیا ہوا تھا۔ اس کے گولڈن فارمیسی میں پہنچنے سے یہ ظاہر تھا کہ وہ میرے دشمنوں سے تعلق رکھتا تھا اور جہاں تک میرا ہاتھ ڈالنے کی نیت سے لی پارکیت کے اس بازار میں پہنچا تھا جہاں جاگیر کی دکان واقع تھی۔ اس نے نرغے میں آجانے کے بعد لیزر گن استعمال کر کے ہم سب کو شے میں ڈال دیا تھا اور یہ تعین کرنا دشوار

ہو گیا تھا کہ وہ خود ہی شی کا آئی مین تھا یا اس کا بھیجا ہوا کوئی خاص آدمی تھا۔

شی کے بارے میں میری اور ویرا کی معلومات قابلِ رشک تھیں۔ ہمیں شی کی اس روایت کا علم تھا کہ اس رسوائے زمانہ تنظیم کے ہر آئی مین کے پاس، اختیار کی علامت کے طور پر دو چپس ضرور ہوتی ہیں۔ سلیور آئی اس کی شناخت ہوتی ہے اور نیم گن اس کی طاقت کی علامت ہوتی ہے۔

اس نابکار کالے نے جھگڑے میں نیم گن استعمال کر کے ایک سنگین الجھاؤ پیدا کر دیا تھا جو اس کی دوسری جھلک دیکھتے ہی دور ہو گیا تھا۔

آئی مین چند منٹ پہلے تک فون پر براہِ راست مجھ سے گفتگو کر رہا تھا۔ دورانِ گفتگو اس نے مجھے یہ یقین دہانی بھی کرائی تھی کہ فون پر کھل کر ہر قسم کی بات کی جاسکتی تھی کیونکہ اس کی لائن میں سی ایس ڈی کی موجودگی کی وجہ سے ہماری باتیں سن لیے جانے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

یہ یقینی سی بات تھی کہ آئی مین لی مارکیٹ کے کسی پبلک فون بوتھ سے بات نہیں کر رہا تھا۔ سی ایس ڈی ایک مختصر سا حیرت ناک آلہ تھا جسے آسانی کے ساتھ فون لائن سے جوڑا اور الگ کیا جاسکتا تھا لیکن کوئی ہوش مند آدمی کھلے بازار میں اسے پبلک فون کے ساتھ استعمال کرنے کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔ آئی مین نے یقینی طور پر کسی محفوظ ٹھکانے سے مجھے فون کیا تھا۔ اس کے فوری بعد امریکی نیگرو کا نظر آنا اس حقیقت کی نشاندہی کر رہا تھا کہ وہ دونوں الگ الگ حیثیت کے مالک تھے۔

وہ کالا شی کے آئی مین کا مقرب خاص ہو سکتا تھا مگر خود آئی مین نہیں تھا۔ شاید اسی نے اپنے آقا کو یہ خبر دی تھی کہ گولڈن فارمیسی کا نام نہاد مالک دکان میں موجود تھا۔ وہ اطلاع پاتے ہی آئی مین نے مجھے فون کر ڈالا۔

اس کی تلاش سے مایوس ہو کر میں دوبارہ کاؤنٹر کے عقب سے ہوتا ہوا اپنے کیمین میں جا بیٹھا۔ ان مضموش حالات میں پوشیدہ دشمن کے کھلے نشانے پر سامنے آنا مناسب نہیں تھا۔ آئی مین نے میرے اوپر جو نیا جال ڈالا تھا اس میں آئی مین کو مکمل ناکامی ہونے تک مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ مجھے جہاں تک کر رہے ہوں کوئی بڑا نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا مگر پھر بھی مجھے ہر اعتبار سے محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔

میں نے گولڈن فارمیسی کے گرد انٹیلی جنس یورو کے

کمانڈوز کی موجودگی کی پیش کش کو بہت مشکل سے ڈالا تھا۔ جلال ایک شریف انفس اور بات کا دھنی آدمی تھا۔ مجھے امید تھی کہ آپس میں ایک فیصلہ ہو جانے کے بعد وہ اس پوری طرح عمل کرے گا اور اس کا کوئی آدمی کسی بھی طرح فارمیسی کا رخ نہیں کرے گا۔ اسے ٹال دینے کے بعد میں۔ معروضی حالات میں اول خان کی پیش کش قبول کر لی تھی ایس ٹی ایف والے آزاد فضاؤں کے بے خوف شاگرد پرندے تھے جو کسی خوف اور رکاوٹ کو خاطر میں نہیں لائے۔ جو ان کے من میں آئے، کر گزرتے ہیں۔ ان کی جراتور کے نتیجے میں کامیابی ان کے قدم چومتی ہے یا پھر موت انہیں اپنے گلے لگا لیتی ہے۔

اس وقت بھی اول خان کے دو آدمی باہر پھیلے ہوئے تھے۔ میں موجود تھے۔ میں ان کو نہیں پہچانتا تھا مگر وہ مجھے اچھا طرح جانتے تھے۔ اس مشتبہ نیگرو کا ان کی عقلی نظروں۔ چنا آسان نہیں تھا۔ بس خرابی یہ تھی کہ اس نیگرو کو میں یا سلطان شاہ نے دیکھا تھا۔ اول خان کے آدمیوں کے لیے انجی تھا۔ وہ لوگ اس کی مشتبہ حرکات و سکنات کی بنا پر اس کی طرف متوجہ ہو سکتے تھے۔

میں سگریٹ سلگائے اپنے خیالات کی دنیا میں گھویا تھا کہ اچانک جہاں تکیر کا فون آگیا۔ ”ابھی تھوڑی دیر پہلے تم سے میری بات ہوئی تھی اب تمہیں کیا تکلیف ہے؟“ میں نے خشک لہجے میں کہا۔ ”تکلیف تو پہلے بھی تھی۔ پورا اخبار بڑھنے کے ساتھ بڑھتی جا رہی ہے۔“ اس نے میرے لہجے کا براہِ مانا بغیر جواب دیا۔

”تکلیف بہت زیادہ بڑھ گئی ہے تو یہاں آجاؤ۔ دو مل بیٹھیں گے تو وقت اچھا گزرے گا۔“ میں نے سختی سے کہا۔

”نہیں بابا۔۔۔ میں یاگل نہیں ہوں جو ادھر کارخ کر رہا ہوں۔“ ”تو میں پاگل ہوں جو تمہاری جگہ سنبھالے ہوں۔“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں! میں نے تمہیں سمجھا۔ کوشش کی تھی مگر تم اپنے سامنے کسی کو کچھ گردانتے۔“ ”یہ تمہاری عقل مندی نہیں بزدلی ہے جو تم نے نامعقول باتیں کہلواری ہے۔“

”میں ایسی عقل مندی پر لغت بھیجتا ہوں جو آدمی